الیہ یصعد الکلم الطیب

مرکزِ علم دیوبند کا دینی، علمی ماہنامہ

طیب

شاہ نمبر

بیادگار:-

حضرت مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصرؒ

مدیر اعلیٰ
سید انظر شاہ مسعودی

مدیر مسئول
نسیم اختر شاہ قیصر

اذان بلال
صداقت اسلام
ذرا عمر رفتہ
سفینۂ وطن کے ناخدا

محترمی .... سلام مسنون

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہونگے!

ماہنامہ طیب دیوبند کا شاہ نمبر (بیاد مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم)
آپ کی خدمت میں حاضر ہے ازراہ کرم اس پر اپنے مؤقر پرچہ میں
تبصرہ شائع فرماکر ممنون فرمائیں۔ امید ہے کہ قریبی اشاعت ہی
میں تبصرہ شائع فرماکر اپنا مؤقر پرچہ جس میں تبصرہ شائع فرمائیں
کی ایک کاپی ارسال فرمائیں گے۔ غیر محدود تعداد میں شائع کیا ہے
ازراہ کرم ایک کاپی بھیجنے پر ہی تبصرہ شائع فرماویں
ممنون ہونگا ـ

والسّلام

نسیم اختر شاہ قیصر

مدیر ماہنامہ طیب دیوبند ۲۴۷۵۵۴
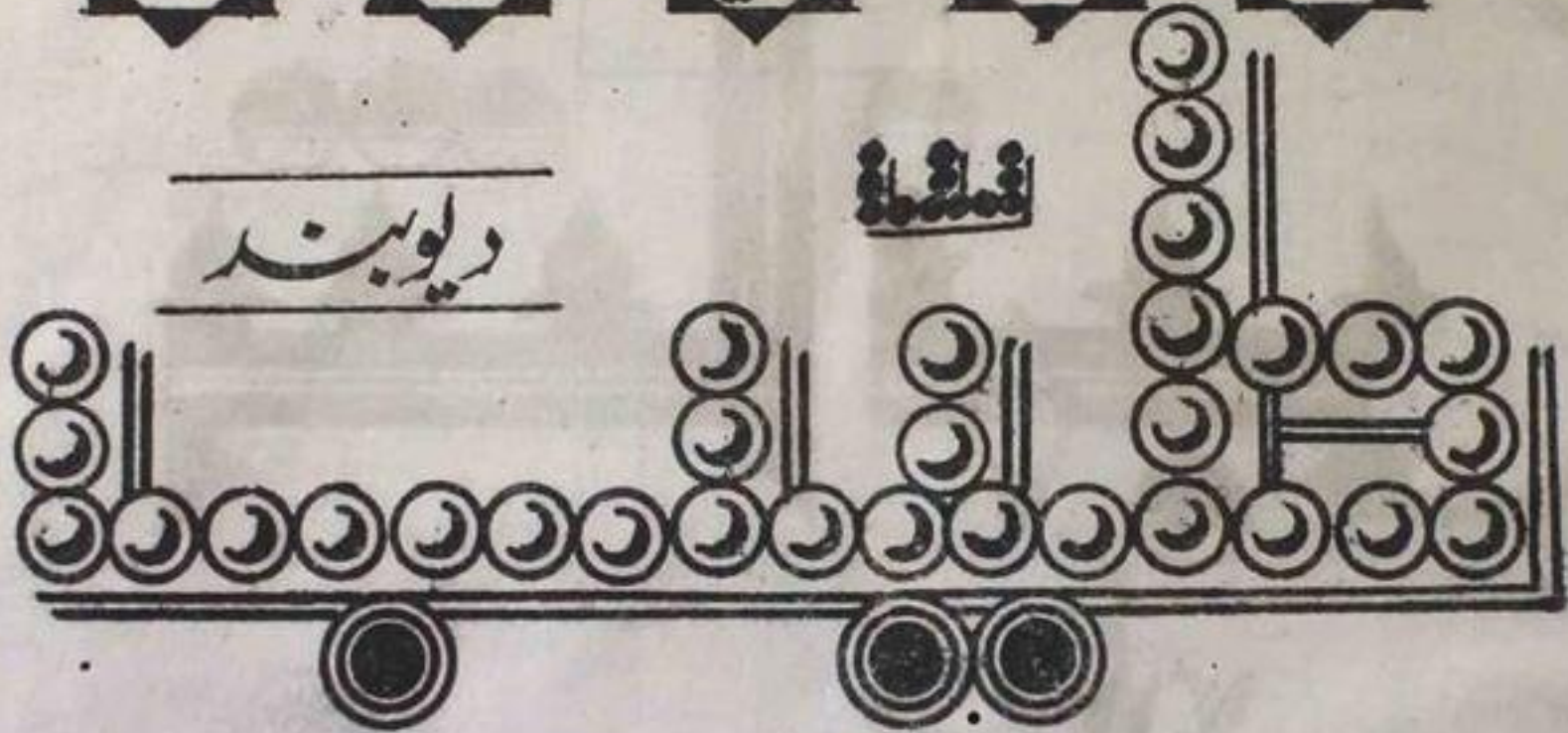
گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں ○ ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاکست
مرکزِ علم
دیوبند کا
علمی دینی
تحقیقی
ماہنامہ
دیوبند
جلد ۳ شمارہ ۶ ۷ ۸
ستمبر اکتوبر نومبر ۱۹۸۶ء
بیادگار
امام العصر حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ
حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب رح مہتمم دار العلوم دیوبند
مؤسس
مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر رح
مدیر اعلیٰ
مولانا سید انظر شاہ مسعودی
مدیر مسئول
نسیم اختر شاہ قیصر
قیمت نمبر
دس روپے
زر اشتراک سالانہ بیس روپے
فی پرچہ :- ۲/ روپے
پاکستان سے :- پچاس روپے
غیر ممالک سے :- ۱۰۰ روپے یا دس ڈالر
مطبوعہ :- آزاد پریس دیوبند

شذراتِ شبیر
رئیس القلم
مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصرؒ
کی
علمی، دینی، تحریری
قلمی اور صحافتی خدمات کا
ایک مبسوط جائزہ

فہرست

مولانا علام نبی قاسمی کشمیری
سید ملک شاہ انور
مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی
آفتاب علم و ادب
یادہائے رفتنی
ایک نامور ادیب و صحافی
جناب وشوا ناتھ طاؤس
مرد حق آگاہ
جانے والے کی یاد آتی ہے
مولانا قمر عثمانی
مولانا احمد نصر بنارسی
حکیم عبدالقوی دریا بادی
مولانا اعجاز احمد قاسمی
شاہ جی کی شاعری
جناب ہما میرٹھی
مولانا حسن احمد صدیقی
مولانا محمد حماد فارغ قاسمی
س۔م۔یس فکر میرٹھی
جناب تابش مہدی
۶
۷۸
۸۱
۸۴
۸۵
۸۷
۸۹
۹۱
۱۰۱
۱۰۸
۱۱۲
۱۱۶
۱۲۰
۱۲۲
۱۲۴
۱۲۶
۱۳۱
۱۳۳
۱۳۵
۱۳۸

منظوم خراج عقیدت

١٦١ جناب نازکی سکندرپوری

١٦٢ جناب سلطان احمد صدیقی

١٦٣ قاری محمد اسحاق حافظ سہارنپوری

١٦٥ جناب سعید میرٹھی

١٦٦ جناب طاہر صبر میرٹھی

١٦٧ جناب یوسف الرحمن واصف نظامی

١٦٩ جناب جوتشی نحیف دہلوی

١٧٠ جناب راحت کوٹی کیانی

١٧١ جناب عبدالقادر کلیم اندوری

١٧٢ جناب محمد انعام صدیقی کاندھلوی

١٧٣ جناب بیدل سرحدی

١٧٤ جناب بخشی شری کرشن شوق امرتسری

١٧٥ جناب رام لال بسمل امرتسری

١٧٦ پروفیسر بخشی اختر امرتسری

١٧٧ جناب عبدالعزیز منصور

١٧٩ جناب تحسین عامر کوثر

علامہ انور صابری ١٦١

مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی ١٦٢

جناب ابراہیم خلیل ١٦٣ ١٦٤

جناب وحی محمل ١٦٥

جناب وقار مانوی ١٦٦

مولانا سیف الرحمن سیف عثمانی ١٦٧

جناب خان عبدالغفار خان ١٦٨

جناب فکر میرٹھی ١٦٩

جناب محمد عرفان شوق میرٹھی ١٧٠

جناب راز لائلپوری ١٧١

پروفیسر بخشی اختر امرتسری ١٧٣

جناب آر ایل بخشی اختر امرتسری ١٧٤

جناب اندرجیت گاندھی ١٧٥

جناب ارجن داس واقف جالندھری ١٧٦

جناب جمیل مظہر سیالکوٹی ١٧٧

جناب ملک چند جین قابل دہلوی ١٧٨

جناب نواز دیوبندی ١٨٠

جناب فتح چند بکر میرٹھی ١٨١

جناب سین نسیم فکر میرٹھی ١٨٢

اخبارات و رسائل کا
خراج عقیدت
۱۹۰ تا ۲۰۸
تعزیت نامے
۲۱۲ تا ۲۲۹
متفرقات
۲۳۲ تا ۲۳۶
آخری تحریر
۲۳۹
قطعات تاریخ وفات
جناب مشتاق شارق صاحب
۱۸۵
مولانا صادق علی قاسمی

لیجئے "شاہ نمبر" آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کے متعلق کوئی فیصلہ خود قارئین ہی کرسکیں گے۔ نمبر کی تمامتر تیاری کا بوجھ مرحوم کے چھوٹے بیٹے، عزیز مولوی نسیم اختر سلمہٗ نے اپنے ناتواں کاندھے پر اٹھایا۔ عزیز موصوف کو کافی وقت اپنے مرحوم والد کی تربیت میں گذارنے کا موقعہ ملا اور اپنے فطری شوق، علمی ذوق کی بنا پر صلاحیتوں کو اُجاگر کیا۔ اردو لکھنے پڑھنے کا جذبہ مرحوم ہی کا پیدا کردہ ہے۔ تحریر کے نوک و پلک انھوں نے ہی درست کئے، انشاء کے مرحلوں میں سفر کی ہمت دلائی۔ خدا تعالیٰ تیز گامی کی بھی سعادت عطا فرمائے۔ اور ان روایات کا حامل بنائے جو خاندانِ انوریؒ کا امتیاز اور اس کے ممیزات ہیں۔

یہ نمبر ایک ایسے صحافی کی یادگار ہے جسے اپنے نامور باپ سے ذکاوت و ذہانت کا وافر حصہ ملا، اردو انشاء کا سلیقہ فطرت سے عنایت ہوا۔ انھوں نے پچاس سال کے قریب ادب و انشاء کے چراغ روشن کئے، ہر موضوع پر لکھا، ہر عنوان پر طبع آزمائی کی۔ بڑوں نے ان کی انشاء کا اعتراف کیا، معاصر نگارشیں کا لوہا مانتے، اور چھوٹوں نے جم کر استفادہ کیا۔ لیکن بدقسمتی سے تاریخ ادب کی ایک عجیب روایت ہے یعنی اپنے ان جلیل فرزندوں کو فراموش کردینا جو قدم قدم پر اسے زیبائی و رعنائی دیتے اور اس کی پریشان زلفوں کی آراستگی میں اپنے عزیز اوقات صرف کرتے ہیں ——، بہت سوں کو بھلا دیا گیا بلکہ فراموش کرنے کی ایک طویل روایت اردو ادب و انشاء کے پیچھے چلی آتی ہے۔ تاہم اس سرد مہری کے دور میں پسماندگان کے لئے یہ روایات ہمت شکن و حوصلہ فرسا نہیں بلکہ وہ اپنی اولوالعزمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے زمانہ کے بے لگام و تیز رو رخش سے یوں مخاطب رہتے ہیں۔

حدیث بے خبراں ہے کہ تو بازمانہ بساز
زمانہ با تو نسازد، تو با زمانہ ستیز

یہ توقع ہے کہ ادبی حلقے اس بقامت کہتر و بقیمت بہتر محنت کی داد دیں گے اور ایک سعادتمند بیٹے کو اس کی کاوشوں کا واقعی صلہ ملے گا۔

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ

وقت ؑ کے بے رحم ہاتھوں سے کون محفوظ رہ سکا ہے اور کون ہے جو یہ کہہ سکے کہ زمانے کی تلخیاں اس کے قریب سے ہو کر نہیں گذریں، اور اس دنیا کے تنگی اور مجبوریوں سے بھرپور دن اس نے نہ دیکھے ہوں۔ بہت کم خوش قسمت ایسے ملیں گے جنھیں کوئی غم نہ ہو، کوئی فکر نہ ہو۔ لیکن یہی لوگ اس میں بھی مبتلا دکھائی دیں گے کہ انھیں کوئی غم نہیں کوئی فکر نہیں ـــــ آخر ایسا کیوں ہے؟ ـــــ اور یہی چیز ان کے لئے سب سے بڑا غم اور سب سے بڑا دکھ بن کر سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اور جب ایسا ہے تو ہم بھی اس حال سے کیسے خالی رہ سکتے ہیں اور کیسے اپنے آپ کو زمانے کی نیرنگیوں سے بچا سکتے ہیں۔

۲۷ نومبر ۱۹۸۵ء کو جو حادثہ پیش آیا وہ غیر متوقع نہیں تھا۔ آٹھ ماہ کی سخت بیماری، کمزوری، بیچارگی اور معذوریوں کا کیا نتیجہ ہو سکتا تھا مگر حادثات کسی بھی شکل اور کسی بھی صورت میں رونما ہوں ان کا اثر قائم ہو کر رہتا ہے مگر قدرت ایسے انتظامات کر دیتی ہے کہ آدمی اس کو ماننے اور تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

قدرت ذہن بناتی ہے

والد مرحوم مارچ ۱۹۸۵ء میں اچانک بیمار پڑے غیر متوقع طور پر کوئی بھی علامت ایسی نہیں تھی کہ جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا کہ اتنی طویل اور سخت بیماری آگھیرے گی بس سانس کی رفتار غیر معمولی ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے معاملہ قابو سے باہر ہو گیا۔ مقامی ڈاکٹروں نے قلبی دورے اور سانس کی تکلیف کی تشخیص کی۔ مرض بڑھتا رہا اور جب مقامی ڈاکٹروں کے قابو سے معاملہ نکل گیا تو مظفر نگر میں قلبی امراض کے ماہر ڈاکٹر اے گپتا کے یہاں داخل کیا گیا۔ دوائیاں، انجکشن، مختلف طریقے ان کی بیماری کو تھامنے اور ختم کرنے میں استعمال کئے گئے۔ مگر طبیعت کسی لمحہ بھی صحت کی جانب مائل نہیں ہوئی ہر گذرنے والا دن کمزوری میں اضافہ کرتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اپنے آپ چل کر مظفر نگر کے لئے دروازے پر آئے، پھر مظفر نگر سے اس طرح واپس ہوئے کہ سہارے کے بغیر ان کے لئے چلنا مشکل ہو گیا چند ماہ سہارے پر وہ اپنے پاؤں سے چلتے پھرتے تھے۔

؏ والد مرحوم کی زندگی کے کچھ گوشے ایسے ہیں جو سامنے ہیں۔ لیکن مضمون کی طوالت کے خوف سے میں انھیں نظر انداز کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ پھر کسی موقع پر ان پر لکھنے کی کوشش کروں گا۔ (نسیم)

پھر یہ ہوا کہ وہ سہارے سے بے نیاز ہو کر چارپائی پر ایسے
لیٹ گئے کہ پھر اٹھنے کا نام نہ لیا۔ تمام ضروریات لیٹے ہی
بیٹے پوری کی جاتیں، دوسری چیزوں کے لئے کسی آدمیوں
کی ضرورت ہوتی زندگی گھٹتی رہی، رینگتی رہی اور ہم
دعائیں مانگتے رہے، دوائیوں کے ساتھ ساتھ ہم نے
ایک پل کے لئے بھی خدا کے حضور اپنی عاجزی اور
بیچارگی کے اظہار سے غفلت نہیں برتی وہ جب بیمار
ہوئے تو ہماری دعا تھی کہ "یا اللہ! بھائی کو صحت عاجلہ
کاملہ، مستمرہ عطا فرمادے"۔

پھر جب مرض نے طول پکڑ لیا صحت کی طرف سے
ناامیدی پیدا ہوگئی تو ہم نے دعائیں کیں کہ۔ "یا خدا!
بھائی کو عمر دراز عطا فرمادے اور انھیں ہمارے سروں
پر قائم رکھ۔

مگر نہ صحت کی دعا ہی قبول ہوئی اور نہ ہی کوئی علامت
زندگی کے قریب آنے کی نظر آئی تو ہم نے یہ دعائیں مانگیں۔

"رب العالمین ہم سب تیری امانت ہیں۔ ہم تیرے
حکم پر راضی اور تیری مرضی کے آگے
سر تسلیم خم کرتے ہیں۔"

بیماری ہر روز ایک نیا موڑ اختیار کرتی رہی اور روز
ہماری دعاؤں کے الفاظ بدلتے رہے۔ حالات اور وقت
کے ساتھ ساتھ قدرت ذہن بناتی جارہی تھی بالکل اسطرح
جیسے ابتدائے اسلام میں کبھی سختی، کبھی نرمی، کبھی چھوٹ
کبھی گرفت اور جب مکمل اعتماد اور بھروسہ پیدا ہوگیا
تو احکامات بھی بدلے اور انداز اظہار بھی ـــ بالکل ہی ذہن
سازی یہاں بھی چل رہی تھی۔ ہم نے صحت کی دعا کی مگر
بارگاہ خداوندی میں قبول نہ ہوئی تو ہم اس پر آگئے کہ ان
کی طویل عمر کے لئے دعا کریں مگر اس کے بھی آثار نظر
نہیں آئے تو خدا کی مرضی کے آگے سر جھکا دیا۔ گویا یہ
تیاری تھی اس بڑے حادثے کے لئے جو چند مہینوں کے
بعد ہی سہی ہمارے سامنے آنے والا تھا۔ اور بالکل یہی
ہوا بھی۔ ۲۷ نومبر کے دن کوئی تبدیلی، کوئی تغیر نہیں۔
بیمار اپنی حالت میں اور تیماردار اپنی جگہ مستعد جب معمول
ضروریات سے فارغ کرا کے بازار گیا۔ نو بجے دوائی دی
خلاف معمول آسانی اور سہولت سے دوائی حلق سے
نیچے اتر گئی۔ دس بجے گھر آیا تو معلوم ہوا کہ طبیعت
زیادہ خراب ہے بھاگ دوڑ کی۔ ڈاکٹر آئے اور زندگی
سے ناامیدی کا اظہار کر دیا۔ مظفر نگر کے معالج کو فون
کیا وہ دو بجے کے قریب دیوبند اپنی کار سے پہنچ گئے
ہزار کوشش کی ہر جتن کر ڈالا ـــ زندگی کے تمام
نشانات مٹتے چلے جارہے تھے اور موت غالب ہوتی
چلی آرہی تھی۔ مختلف تدبیروں کے باوجود زندگی کی رمق
نہ پیدا کی جاسکی، اور ۳ بج کر دس منٹ پر شفیق عظیم
بے انتہا پیار کرنے والے، اپنی خوشیاں ہم پر نچھاور
کردینے والے، ہمارے مستقبل اور بہتر زندگیوں کی تلاش
وجستجو میں پوری عمر گذار دینے والے باپ سے ہم محروم
ہوگئے۔ سانس کی رفتار آہستہ آہستہ کم ہوتی رہی۔
آنکھیں اپنا رنگ بدلنے لگیں۔ زبان پر کلمہ طیبہ جاری تھا
مگر صرف ہونٹوں کی جنبش سے ہی اس کا اندازہ ہو رہا تھا
ہم محروم ہو رہے تھے اپنے باپ سے، اور اپنے والد کی
جدائی کا غم ہماری قسمتوں میں لکھا جا چکا تھا، آسمان پر
فیصلہ ہو چکا تھا کہ آج ایک محروم اور قسمت کی ماری ہوئی
اولاد اپنے باپ کی دوری کا غم برداشت کرے گی۔ ہم نے
قریب رہ کر دیکھا موت کی سختی، زندگی کے اختتام کی
تکالیف کوئی بھی تو ان میں نہیں دکھائی دی، اطمینان
اور سکون کے ساتھ اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی
ـــ باقی رہے نام اللہ کا۔

کوئی کچھ نہیں کرسکتا

آج بھی آخری لمحات کا تصور

کرتا ہوں تو رب کائنات کی قدرت اور قوت کے سامنے ہزار بار سر جھکانے کو دل چاہتا ہے۔ روپیہ پیسہ، عزیز واقارب، اولاد، مال، اسباب کونسی چیز ہے جو زندگی کا بدل ہو سکتی ہے۔ سب ایک طرف دھرا رہ جاتا ہے، احساسات، جذبات، محبت رشتے سب کچھ سمٹ کر اور سکڑ کر ختم ہو جاتے ہیں آپ لاکھ خواہش کریں کہ جانے والے کو تھام لیں، اس کی گردن میں باہیں ڈال کر اسے روک لیں اس سے لپٹ کر روکنے کی کوشش کریں، اسے اپنی محبت کا واسطہ دیں، اسے اس کا پیار یاد دلائیں اور اسے بتائیں کہ تمہارے بعد ہمارا کیا ہوگا، ہم بے سہارا ہوں گے تنہا، اداس اور اکیلے ہوں گے اور ساتھ میں ہونگی اس دنیا کی سختیاں اور مجبوریاں۔ نہ جانے والا سنتا ہے نہ روکنے والے روک پاتے ہیں۔ بس فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُونَ یہی حکم پورا ہو کر رہتا ہے یہی آواز ہر درو دیوار سے آتی ہے، ہر ذرّہ یہی سناتا اور بتاتا ہوا دکھائی دیتا ہے، شجر و حجر یہی آیت دہراتے اور پڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انجام موت پر جاکر ختم ہو جاتا ہے اور بے بس انسان اپنی طاقت، اپنی قوت، اپنی محبت اپنے وسائل، اپنے ذرائع کے ساتھ سب کچھ ہوتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے۔ سچ ہے اور بالکل سچ ہے کہ تمام چیزیں اللہ ہی کی قدرت اور اسی کے قبضہ میں ہیں۔ ہمیں کیا مجال اور کیا جرأت ہے کہ اس کے فیصلوں کو نہ قبول کریں، نہ مانیں۔ اور اگر نہ بھی مانیں تو کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ سوائے محرومی اور سوائے ندامت کے ہمارے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئیگا۔

بیماری سے قبل:

بلاشبہ بحالتِ شعور لگ بھگ ۱۲، ۱۳ برس مجھے ان کو دیکھنے کا موقع ملا، ہر موقع اور وقت ان کے ساتھ رہنے اور آنے جانے کا اتفاق ہوا مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کس دن اور کب انھوں نے مجھے اپنا مضمون پہلی بار نقل کرنے کے لیے دیا تھا اور یہی وہ دن تھا جب قلمی میدان میں ان کی اور میری پہلی ملاقات تھی۔ میری تحریر کچھ صاف تھی اس لئے انھوں نے اپنا ایک مضمون جو شائد باہر روانہ کیا جانے والا تھا مجھے دیدیا میں نے اس کو نقل کر کے والد صاحب کی خدمت میں پہونچا دیا۔ چند جگہ صحیح کیا اور مطمئن ہو کر سپرد ڈاک کر دیا، اس کے بعد تو مضامین اور تقاریر کی نقل کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو گیا جس کی نہ کوئی حد تھی اور نہ کوئی گنتی۔ ہر روز تقریباً مضمون خود لکھتے یا بول دیتے دونوں صورتوں میں نقل کرنے کی ذمہ داری میری ہی ہوتی۔ میں بھی بڑی مستعدی اور دلچسپی کے ساتھ ان کے مضامین نقل کیا کرتا۔ پھر سلسلہ آگے بڑھا تو ڈاک بھی میرے ہی سپرد کر دی اکثر خط و کتابت میں ہی کیا کرتا وہ لکھتے تو خود بھی بہت تھے مگر مراسلت کا لمبا چوڑا سلسلہ تھا اس لئے کچھ کام اس ضمن میں میرے بھی ذمے ہوتے۔ قریب سے قریب رہنے کے اتنے مواقع مجھے ملے کہ میں یہ بھی بھول گیا کہ وہ میرے والد ہیں۔ ان کے مشورے ان کی نصیحتیں، کام کرنے کے مختلف انداز، ہر معاملے میں ان کی رائے میرے شاملِ حال ہوتی۔ اور یہ سلسلہ یوں اور بھی دراز ہوا کہ سنہ ۶۵ء میں میں نے اپنی زندگی کا پہلا مضمون لکھا۔ ڈرتے ڈرتے اصلاح کی غرض سے ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ بمشکل ایک دو جگہ کاٹ چھانٹ کی اور مضمون مجھے واپس لوٹا دیا۔ اس دن سے وہ لکھتے میں نقل کرتا، میں لکھتا وہ اصلاح دیتے، زندگی کا کارواں آگے بڑھتا رہا وہ قلم برداشتہ لکھنے کے عادی تھے گھنٹوں بیٹھ کر سوچنا، خاکہ بنانا، ابتدا اور انتہاء

کی فکر میں پڑنا یہ سب کچھ ان کے یہاں نہیں ملتا بس قلم اٹھ گیا تو ابتدا بھی ہوگی، انتہا بھی ہوگی، نفس مضمون بھی خود بن جائیگا، الفاظ بھی خود بنتے اور سنورتے چلے آئیں گے ۔ اور ایک گھنٹہ بعد معلوم ہوتا کہ دماغ کی گہرائیوں سے ایک تخلیق بن کر سنور کر صفحات کے سینے میں اپنی جگہ بنا چکی ہے بس اٹھتے بیٹھتے صبح و شام رات اور دن ہم نے انھیں لکھتے ہوئے دیکھا نہ معلوم کتنے مضامین انھوں نے لکھے. جو اخبارات و رسائل ہمارے پاس محفوظ ہیں اور جتنے ذخیرے کو ہم حاصل کر سکے ہیں اس کے اعتبار سے ان کے مضامین کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے اور وہ چیزیں جو ابھی تک ہمیں حاصل نہیں ہو سکیں ان کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

پسندیدہ موضوعات

ان کا قلم ہر موضوع اور عنوان پر اپنے کمالات کے جوہر دکھاتا مگر چند موضوع ایسے تھے جن میں خاص طور پر ان کو لکھنے اور تحریر کرنے میں ملکہ حاصل تھا۔ دینی، ادبی موضوعات پر ان کا قلم بڑی روانی اور بڑی چابکدستی کے ساتھ چلا کرتا تھا، الفاظ کا انمول انتخاب، جملوں کی پرکشش ترتیب، اظہار بیان کی ندرت یہ تمام چیزیں ان کے مضامین میں نمایاں نظر آتیں اور اپنے مافی الضمیر کو وہ بہت خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ ادا کرتے تھے لیکن زندگی بھر جو موضوع ان کو سب سے زیادہ پسند رہا وہ شخصیات کا تھا، اکابر کا تذکرہ اسلاف کی داستانیں، بزرگوں کے واقعات، بڑوں کی پاکیزہ زندگیاں، اور اپنے دور کی علمی، دینی، مذہبی، سیاسی سماجی، ادبی نادر روزگار ہستیوں کے ذکر خیر کو وہ زیادہ پھیلاتے اور بتاتے۔ کسی بھی شخصیت کو جانچنے اور پرکھنے کا ان کا اپنا ایک انداز تھا اور جو ان

کے اس انداز اور معیار پر پورا اترتا اس کے کمالات اور خصائص کو سامنے لانے میں وہ بہت زیادہ دلچسپی دکھاتے یہی وجہ ہے کہ شخصیات پر لکھے گئے ان کے ہزاروں مضامین ہر حلقہ اور ہر طبقہ میں یکساں طور پر مقبول ہوئے اور شخصیات کے خاکوں اور حالات سے دلچسپی رکھنے والوں نے انھیں انمول شاہکار قرار دیا ان کے طویل تر مضامین ملک کے اکثر اخبارات و رسائل میں شخصیات پر آتے رہتے اور اہل نظر سے خراج تحسین حاصل کرتے۔ جیسا کہ لکھ چکا ہوں کہ وہ ہر موضوع پر بلا تکلف اور بغیر مشکل کے لکھنے میں مہارت رکھتے تھے اسی وجہ سے ادبی، سیاسی، علمی، دینی، مذہبی، سماجی تاریخی تحقیقی مضامین کی تعداد بھی بے شمار ہے۔

بحیثیت مدیر

اپنی صحافتی اور قلمی زندگی میں انھوں نے کم و بیش چھ سات رسائل کی ادارت کے فرائض انجام دیئے اور یہ تمام اخبارات و رسائل وہ تھے جو اپنے دور کے مؤقر اور علمی رسائل و جرائد میں شمار کئے جاتے تھے، اخبار صداقت سہارنپور میں انھوں نے برسہا برس مزاحیہ کالم بھی تحریر فرمائے جس میں بڑے خوبصورت انداز میں حالات حاضرہ پر تبصرہ ہوتا تھا[1] جن میں بڑے تیکھے لب و لہجہ میں گرفت ہوتی اور مزاحیہ و ہلکے پھلکے انداز میں وہ بات کہہ جاتے جس کو کہنے کے لیے صفحات کے صفحات سیاہ کیے جا سکتے تھے۔ ان کا مزاحیہ کالم اس دور میں بے انتہا مقبول تھا جس کا ایک حلقہ بے چینی اور بے قراری کے ساتھ انتظار کیا کرتا۔ غرض کہ ہر صنف پر ان کو مکمل عبور

---

[1] اس دور میں "اسرار و بصائر"۔ "اسرار و لطائف" کرامات "اسرار و حقائق" کے عنوانات سے وہ مزاحیہ مضامین سپرد قلم کرتے تھے۔

حاصل تھا اور اس میدان میں خدا نے ان کو خاص صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ دیوبند کی سرزمین پر وہ تنہا ایسے صحافی اور ادیب تھے جنھوں نے اپنی زندگی میں اتنے پرچوں کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔

ان کی مختلف باتیں

مزاج کے اعتبار سے وہ بہت نرم، خلیق اور ملنسار قسم کے انسان تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی ۴۴، ۴۵ سال کی ملازمت کے زمانے میں ہزاروں افراد سے ان کا تعلق رہا اور ہزاروں افراد ان کے قریب رہے تلخی اور ناگواری کے حالات اس درجہ کبھی پہنچے ہوں کہ انسان ایک دوسرے کی شکل دیکھنے تک تیار نہ ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہوا رسالہ دارالعلوم میں ان کی لمبی چوڑی مجلسیں رہا کرتیں، درجۂ عربی کے چھوٹے بڑے اساتذہ، کارکنان ادیب صحافی اور انشاء پرداز، سیاسی شخصیتیں سب ہی ان کے پاس آتے گھنٹوں بیٹھے رہتے اور دنیا کے تمام موضوعات پر بحث ہوتی، اپنی اپنی رائے پیش کی جاتی۔ معاملہ طول پکڑتا اور ماحول بے انتہا سنجیدہ ہو جاتا تو والد مرحوم چند جملوں ہی میں محفل کو زعفران زار بنا دیتے۔ طبیعت میں فطری طور پر مسکراتے رہنا شامل تھا اپنے قریب کے لوگوں کو مایوس اور اداس دیکھنا گوارا نہ کرتے ہر ممکن طریقے سے دل جوئی کرتے اور مسائل کے حل کی مختلف صورتیں پیش کرتے۔ رائے کے پختہ اور معاملات کی گہرائی تک ایک دم پہنچ جانے کی صلاحیت رکھتے تھے اپنے قول و فعل کے دھنی تھے۔ اکابر و اسلاف کے واقعات سامنے لانے اور ان سے ایک صحیح سمت کا تعین کرنے کا جذبہ ہمیشہ پیش نظر رہتا خود بھی بزرگوں کی اداؤں کو سمو لینے کی کوشش کرتے اور دوسروں کو بھی اس راہ پر چلنے کی تلقین ہوتی۔ کہیں کوئی بات ہو گئی کوئی مسئلہ پیدا ہو گیا۔ والد مرحوم اس کو اپنی دوراندیشی و بصیرت سے سلجھانے میں کامیاب رہتے۔ اپنے بڑوں کا احترام کرتے ہم عمر لوگوں کے ساتھ بے تکلف ہو کر گفتگو کرتے اور چھوٹوں پر بے انتہا شفقت اور حوصلہ افزائی کا معاملہ کرتے ۱۹۷۳ء میں جب راقم نے پہلا مضمون لکھا تو مجھ سے تو کچھ نہیں کہا مگر قریب کے لوگوں کو اس کام پر مامور کر دیا کہ اسے لکھنے کی تاکید کریں اور کہیں کہ اس سلسلہ کو ختم نہ کرے ابتداء میں دشواری تو ضرور ہوگی مگر محنت کی تو معاملہ آگے بڑھ جائے گا۔ اصلاح کا ایک خاص انداز تھا نو آموز اور تحریر کے میدان میں ابتدائی قدم رکھنے والوں کو بھی ہلکے پھلکے انداز میں سمجھاتے اور ان کی تحریروں میں زیادہ کانٹ چھانٹ نہ کرتے کہیں کوئی جملہ بدل دیا اور کہیں کسی لفظ کا اضافہ کر دیا آہستہ آہستہ جب یہ دیکھتے کہ اب یہ شخص چل پڑا ہے اور تحریر کی دنیا سے اس کی واپسی ناممکن ہے تو اب ان کے سمجھانے اور اصلاح دینے کے انداز میں فرق آجاتا مختلف علمی موضوعات بتاتے، ان کے مواد کی نشاندہی کرتے اور مختلف کتابوں کے مطالعہ کی تاکید ہوتی اس طرح ذہن بنانے اور پھر ان میں کام لینے کی زبردست صلاحیت تھی۔ کسی کو مایوس کرنا اور حوصلہ شکنی کرنا ان کے مزاج میں داخل نہ تھا ان کے قریب اٹھنے بیٹھنے والے لوگ ہر صورت اور ہر حالت میں اس کا اقرار کریں گے کہ ان کی ذات سے کسی کو ادنیٰ درجہ کا بھی نقصان نہیں پہونچا۔ ملازمت کی ۴۵ سال سے زائد کی زندگی میں ہر طرح کے آدمی سے واسطہ پڑا اور ہر فکر کے انسان سے ان کی دوستی اور تعلقات رہے مگر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے کسی دور میں اپنی ذات سے کسی کو تکلیف پہنچائی ہو یا پریشانی کا سبب بنے ہوں۔ اس دور میں بھی نہیں جب کہ مجلس شوریٰ کے ممبران اور بزرگ ان کا بے انتہا خیال کرتے اور بالفاظ دیگر ان کے نخرے اٹھاتے تھے وہ اگر چاہتے تو اپنے تعلقات اور ان افراد کی عنایات

سے فائدہ اٹھا کر رسالہ دارالعلوم کی ادارت سے ہٹ کر کوئی اور عہدہ بھی حاصل کر سکتے تھے اور کسی کو بھی اس کے منصب سے محروم کرا سکتے تھے مگر قدرت نے لالچ حسد اور بغض کی لعنت سے یکسر پاک رکھا تھا۔ مجلس شوریٰ کا آغاز ہوتا تو لوگ دوڑے دوڑے ان کے پاس آتے کوئی اپنے استقلال کا خواہشمند ہوتا، کوئی اپنی ملازمت کے لئے سفارشیں کراتا اور وہ ان تمام لوگوں کے لئے ممبران مجلس شوریٰ سے ملتے اور ان حضرات کے مسائل اور پریشانیوں کو دور کراتے۔

رسالہ دارالعلوم کی مجلسوں میں وہ حضرات تشریف لاتے تھے جن کو رب العالمین نے علم و عمل کی لازوال دولتوں سے نوازا تھا اور جو اپنے اپنے طبقہ میں نمایاں اور منفرد حیثیتوں کے مالک تھے والد مرحوم کی رائے اور ان کی گفتگو قطعی اور آخری سمجھی جاتی، کوئی علمی مسئلہ ہوتا، بین الاقوامی سیاست کی بات ہوتی، ادب و صحافت کے کسی پہلو پر اظہار خیال ہوتا، تاریخ کے صفحات کی ورق گردانی ہوتی وہ ہر موضوع اور ہر مسئلہ پر گفتگو کرتے اور بڑے مضبوط و ٹھوس لب و لہجہ میں گفتگو ہوتی وہ مجلسیں دارالعلوم کی زندگی کی یادگار مجلسیں سمجھی جائینگی مگر آج نہ وہ افراد ہیں جو والد مرحوم کے ہم عصر تھے کچھ اس دنیا سے رخصت ہو گئے، کچھ کو حالات نے جدا کر دیا اور جو کچھ باقی ہیں ان کو حالات اور زمانے کے بدلتے ہوئے تیوروں نے گم سم کر دیا ہے۔

کچھ گفتگو رسالہ دارالعلوم کے بارے میں ہو جائے جس زمانے میں والد مرحوم کو رسالہ دارالعلوم کی ادارت کی ذمہ داریاں سونپی گئیں اس وقت رسالہ دارالعلوم کا نہ کوئی وقار تھا اور نہ معیار بڑے بڑے لکھنے والے اور صاحب کمال لوگ رسالے کی ادارت سے عاجز آ کر اپنا دامن چھوڑ چکے تھے اور رسالہ دن بدن اپنی وقعت کھوتا جا رہا تھا دارالعلوم جیسی مرکزی جگہ سے جس معیار کا پرچہ نکلنا چاہیئے وہ اس کو نہیں مل پا رہا تھا والد مرحوم نے اس ذمہ داری کو اس طریقہ پر پورا کیا کہ مکمل ۴۵ سال نہایت شان، بڑے وقار اور بلند افکار کے ساتھ یہ پرچہ پوری دنیا میں دارالعلوم کا حقیقی ترجمان بن کر سامنے آیا اور صرف رسالہ دارالعلوم کی وجہ سے دارالعلوم نے ہزاروں لوگوں کو اپنے سے متعارف کرایا اور ہزاروں لاکھوں افراد اس کے حلقے میں شامل ہوئے۔ غرض کہ ان کا دورِ ادارت رسالے کی زندگی کا زرین دور رہا۔

پیار بھرا غصّہ

مخصوص حالات میں ان کو غصہ آتا تھا مثلاً وہ اپنے معمولات کے بیحد پابند تھے۔ صبح ناشتہ سے فارغ ہو کر دارالعلوم چلے جاتے ناشتہ اپنے وقت پر ملنا چاہیئے واپس آئیں گے تو کھانا آتے ہی انھیں تیار ملے ذرا سی دیر ان کے غصہ کا سبب بنتی تھی۔ دفتر پہنچ کر دفتری امور سے پہلے فراغت حاصل کی جاتی۔ رسالہ کب جائیگا کب چھپ کر آئے گا اور کب کاتب کو سونپا جائیگا۔ اس کے لئے تاریخیں مقرر تھیں۔ مجال نہیں کہ ایک دن بھی ادھر سے اُدھر ہو۔ آج ڈاک میں اگر پچاس خط ہیں تو سب کے جوابات آج ہی دیئے جائیں گے۔ ایسا نہیں کہ ادھورا کام کر دیا جائے اور کچھ خطوط کل پر ٹال دیئے جائیں۔ اتنے منتظم مزاج تھے کہ دوسرے لوگ بعض اوقات پریشان ہو اٹھتے اور ان کا ماتحت عملہ ان کی اس عادت سے الجھا ہوا سا رہتا ان کی منتظم مزاجی کو عجلت اور جلد بازی کا نام دیا جاتا مگر وہ ہر کام اپنے معمول کے مطابق کرتے اور آخر عمر تک ان کا یہ انداز باقی رہا، غفلت، لاپرواہی سستی، کاہلی مزاج میں رتی بھر نہ تھی جب بھی میرے ذمہ لکھنے پڑھنے کا کوئی کام سپرد کیا جاتا تو سب سے پہلی تاکید اپنے وقت کے اندر اس کی تکمیل کی ہوتی۔

ذرا سے چوکے اور ان کے غصہ کا شکار ہوئے مگر اس غصہ میں بھی ایک پیار کا انداز ہوتا اور اندر سے یہ جذبہ ہوتا کہ اگر آج تھوڑی گرفت ہو گئی تو آنے والے کل میں ان کو پریشانیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا. کام کرنے اور کام لینے کی خداداد صلاحیتیں رب العالمین نے ان کو عطا فرمائی تھیں۔

غصہ میں بے قابو ہو جائیں اور ہوش و حواس گم ہو جائیں ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا. میں اپنی لاپرواہی کی وجہ سے اکثر ان کے غصہ اور لمبی چوڑی تقریروں کا سامنا کیا کرتا۔ دل و دماغ پر کبھی ان کی باتوں سے تکدر پیدا نہیں ہوا۔ ان کے غصہ کے ہزاروں واقعات اس وقت ذہن کی سطح پر آپس میں گڈمڈ ہو رہے ہیں مگر ایک واقعہ یہاں بتانا ضروری سمجھتا ہوں جس سے ایک باپ کی اپنے اولاد کے تئیں شدید اور بے چین محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

میں ہفتے میں تقریباً تین چار دن ان کی دوائیاں لانے اور ڈاکٹر سے ملنے کے لئے مظفر نگر جاتا، واپسی اپنے وقت پر ہوتی اور میں جلد از جلد گھر پہنچنے کا اہتمام کیا کرتا مگر اتفاق سے ایک دن ڈاکٹر صاحب اپنے وقت پر کلینک میں نہ آئے پھر بھیڑ بھی زیادہ تھی میرا نمبر آتے آتے رات کے آٹھ بج گئے میں فارغ ہو کر باہر آیا تو ۹ بجے کا عمل تھا اب دیوبند آنے کے لئے کوئی ایسی سواری نہ تھی جس سے فوراً دیوبند پہنچ جاؤں مجبور ہو کر اسٹیشن کی طرف بڑھ گیا ساڑھے دس بجے ٹرین آئی تو گیارہ بجے کے بعد دیوبند پہنچ سکا گھر پہنچا تو وہ اپنی بیماری کو بھول کر بار بار میرے بارے میں سوال کر رہے ہیں کہ وہ اب تک کیوں نہیں آیا۔ میں ڈرتے ڈرتے ان کے پاس پہنچا. انھوں نے دیکھنے کے بعد کہا کہ :-

"اگر تو چھوٹا ہوتا تو میں تیری پٹائی کر دیتا"

آہ! محبت کا کتنا انوکھا انداز تھا یہ، پیار کا کس کس قدر مضبوط اظہار تھا یہ اور اپنی شدید بے چینی اور بے قراری کو کس طرح سے انھوں نے بتا دیا تھا کاش وہ زندہ ہوتے اور میں ان کے غصہ کا شکار ہوا کرتا. انکے اس لب و لہجہ کو دوبارہ سننے کے لئے دل کس قدر بے چین رہتا ہے. اس جملے نے میری دنیا ہی بدل دی اور مجھے احساس ہوا کہ ایک باپ وہ بھی اس حالت میں کہ وہ اپنے جسم کی تمام تر توانائیاں کھو چکا ہے، اور موت جس کے انتظار میں ہے اپنی نالائق اولاد کے لئے کس طرح تڑپ رہا ہے، کس طرح بے قرار ہے یہ رشتوں کی دنیا بھی عجیب دنیا ہے، عجیب کہانی یہاں کی اور عجیب داستان ہے انسان کی محرومی کی ـــ ہم جو چاہتے ہیں وہ نہیں ہوتا جو نہیں چاہتے وہ ہو جاتا ہے ـــ کیا لکھیں اور کیا بتائیں۔ بھائی، آپ تو چلے گئے مگر کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ آپ کے بعد اس دنیا میں ہمارا کیا ہوگا، اس پیار بھرے غصے میں ہمیں کون سمجھائیگا، کون ہے جو بتائے گا کہ زندگی کیا ہے اور اس کو کس طرح گذارا جائے، کون ہے جو ہمارے انتظار میں بے چینی کے ساتھ کروٹیں بدلے گا کون ہے جو بار بار ہمارے بارے میں پوچھیگا کہ ہم کہاں گئے۔ آپ کے جانے سے تو رونق ہی ختم ہو گئی۔ زندگی کے قہقہے دم توڑ گئے اور یہ دنیا جدائی اور غم کے احساس سے تپتا ہوا ایک ایسا صحرا دکھائی دیتا ہے جہاں دُور دُور تک کوئی سایہ نہیں کوئی سہارا اور آسرا نہیں بس تنہائی، اداسی اور جدائی کا ایک گہرا سمندر ہے جہاں ہمارا ناتواں کمزور اور زخموں سے چُور جسم ہچکولے لے رہا ہے!۔

سفر سے الجھن

اپنے کاموں میں بہت مستعد اور چاق و چوبند ہونے کے باوجود سفر کے بالکل عادی نہیں تھے۔ ہر جہت اور ہر پہلو

سے سفر سے دامن بچاتے۔ بہت مجبوری اور اصرار کے بعد اگر آمادہ بھی ہوتے تو کئی روز قبل اس طرح انتظامات شروع ہوجاتے جیسے کسی لمبے اور طویل سفر کی تیاریاں ہوں حالانکہ سفر عموماً دہلی، سہارنپور، لکھنؤ، مظفر نگر، اور کشمیر وغیرہ کے ہوا کرتے۔ مگر ان تمام اسفار کو لندن اور امریکہ کے سفر سے کم نہ سمجھتے۔ ان کے تمام تر تعلقات خط و کتابت پر منحصر تھے ہزاروں ملنے جلنے والے ایسے رہے کہ جن کی شکل تک نہ دیکھی مگر خط و کتابت کے ذریعہ ان سے مضبوط اور خوشگوار تعلقات رہے۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی کی دعوت پر اکثر تقریر کے لئے جانا ہوتا تو اس طرح کہ صبح دس بجے ریڈیو اسٹیشن پہنچے تقریر کی اور روانہ دن کے دن دیوبند پہنچ جاتے اور کئی روز تک سفر کی تکالیف اور پریشانیوں کا ذکر کرتے رہتے بڑی بڑی تقریبات اور پروگراموں میں شرکت صرف سفر کی عادت نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہو پاتی تھی۔ بہت اصرار اور شدید تقاضوں کے بعد اپنے آپ کو تیار کر پاتے تھے۔ مجھے کئی اسفار میں ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ سفر میں خاموشی اختیار کرتے یا پھر مطالعہ میں مستغرق رہتے۔ ہر معاملہ کی طرح اسفار میں بھی اپنے مخصوص انداز میں رہتے۔ کشمیر کے سفر میں جو علامہ انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے سیمینار کے سلسلے میں ہوا بہت محنت اور دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور اس کی بنیادی وجہ شاید یہ تھی کہ یہ سیمینار ان کے عظیم والد کی خدمات اور کارناموں پر مشتمل تھا۔ پھر اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند کے سلسلے میں انھوں نے کئی ماہ اسفار میں گذارے، بے انتہا محنت کی، رات دن کاموں میں لگے رہے اور مقام مسرت ہے کہ شدید ہنگاموں اور ابتلاء کے دور میں بھی ان کی امانت و دیانت پر کسی نے انگلی نہیں اٹھائی جب کہ اجلاس صد سالہ کے لاکھوں کے حسابات ان سے متعلق تھے اور زمین کی فراہمی کے سلسلہ میں ہزاروں روپیہ ان کے ہاتھوں خرچ ہوا۔

بیماری اور صبر

جن لوگوں کو والد مرحوم کی بیماری کے زمانے میں ان کے قریب رہنے یا ان کے پاس آنے جانے کا اتفاق ہوا وہ اس حقیقت کو دہرائیں گے کہ شاہ صاحب نے بے انتہا تکالیف میں اپنے آٹھ ماہ گذارے مگر اس پوری بیماری کے زمانے میں کوئی حرف شکایت انکی زبان پر نہ آیا، بیماریاں روز بروز بڑھتی رہیں جسم دن بدن کھوکھلا اور خالی ہوتا گیا۔ درد، ٹیس، کرب بے چینی، اضطراب، گھبراہٹ، تمام ہی چیزیں ایک ساتھ جمع رہیں مگر صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ پوچھنے والے پوچھتے کہ شاہ جی آج کیسی طبیعت ہے تو کبھی تکلیف کا اظہار نہ ہوتا بس ایک جملہ مخصوص تھا کہ آج طبیعت بہتر ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ انھوں نے بڑی بے چینی اور بے قراری میں اپنے اوقات گذارے مگر کبھی زبان پر ایک لفظ بھی ایسا نہیں آیا جس سے ان کی شدید بیماری کا احساس ہو صبر اور خاموشی کو انھوں نے اپنے لئے اختیار کر لیا تھا اور آخر وقت تک وہ اس پر قائم رہے ان کے صبر، خاموشی اور اللہ کی رضا میں راضی ہونے کا یہ مرحلہ خداوند کی ذات سے امید پیدا کرتا ہے اور یقین ہوتا چلا جاتا ہے کہ رب العالمین ان سخت آزمائشوں اور امتحانات میں انکی کے صبر کے بدلے اجر عظیم عطا فرمائیں گے اور ان کی بال بال مغفرت فرما کر بلند درجات سے نوازیں گے۔ خدا اپنا رحم فرما اور انھیں کروٹ کروٹ سکون اور چین نصیب فرما۔ آمین

شادی

وہ مارچ ۸۶ء میں بیمار ہوئے۔ بیماری کے چند

روز بعد ہی سے ان کا اصرار میری اور چھوٹی بہن کی شادی کے لئے بہت زیادہ ہونے لگا۔ کیا معلوم انھوں نے اپنے ذہن میں کیا پروگرام ترتیب دیا ہوا تھا آخران کے اصرار اور شدید خواہش پر جولائی ۸۴ء میں ہمشیرہ سلمہا کی شادی بخیر و خوبی انجام پائی۔ بہن کی شادی کے چند روز بعد ہی سے ان کی پوری توجہ میری جانب ہوگئی خاندان کے بڑوں اور دیگر افراد سے انھوں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ نہ تو حالات تھے، نہ ان کی بیماری اس موڑ پر تھی کہ شادی وغیرہ کے مسئلے میں الجھا جائے مگر انھوں نے ہر جہت سے یہی کوشش کی اور اپنی رہی سہی تمام طاقت میری شادی کرنے پر صرف کردی۔ ۱۱ر نومبر ۸۴ء کو آخر وہ اس فرض سے بھی سبکدوش ہوگئے شادی کیا تھی ایک فرض تھا جس کی ادائیگی میں خاندان کے تمام افراد لگے ہوئے تھے اور پھر ذہنوں میں یہ خیال بھی تھا کہ ان کے اصرار اور خواہش کی تکمیل کی جائے نہ معلوم کل کیا حالات ہوں اور وقت کس رُخ پر چل پڑے۔ میں بارات کی روانگی سے قبل ان کی دعائیں لینے کے لئے ان کے پاس گیا۔ ان کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو جھلملا رہے تھے۔ چہرے پر ایک سکون اور ہونٹوں پر جنبش تھی بہت کوشش کی، کافی طاقت صرف کی مگر وہ سر پر ہاتھ رکھنے کے لئے حرکت نہ کرسکے بس لیٹے ہی لیٹے میری طرف بڑی حسرت اور بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے اس وقت ان کے دل پر کیا گذر رہی ہوگی؟ میں نہیں کہہ سکتا ان کے قریب ہوا ان کے ہونٹوں سے کان لگائے تو صرف یہ ایک جملہ سمجھ میں آسکا۔

"خدا تمھیں خوش رکھے۔"

بستر مرگ پر پڑے ہوئے ایک انسان کے اپنی اولاد کے لئے دعائیہ کلمات تھے اور ان کی فطری اور پدری محبت کا ایک مکمل اور بے ساختہ اظہار بھی۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ میں نے تو زندگی کے کسی مرحلے میں اس کا تصور نہ کیا تھا کہ کبھی وہ اس عالم میں بھی ہوں گے اور اپنے لخت جگر کے ایک اہم فرض سے سبکدوش ہونے کے لئے زندگی انھیں چند قدم چلنے کی بھی مہلت نہیں دیگی۔ ٹوٹے ہوئے دل اور لرزتے قدموں کے ساتھ میں ان کے پاس سے چلا آیا بارات کی واپسی میں غیر معمولی تاخیر ہوگئی تو انھوں نے بڑی تشویش اور فکر کے ساتھ کئی آدمیوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ ہونے کے لئے دوڑا دیا۔ میں واپس آیا ان کے پاس پہنچا تو آنکھیں شکایت کررہی تھیں اتنی دیر کہاں لگائی۔

یا خدا تیری مصلحتیں بھی عجیب، تیرے ارادے بھی غیر معمولی، تیری رضا بھی انوکھی ہوتی ہے کیا کرسکتے ہیں اور کیا نہیں کرسکتے۔ ابھی تو میری شادی کو ۱۶ روز ہی گذرے تھے کہ، ۲۷ر نومبر ۸۴ء بروز بدھ کو پیغام اجل آپہنچا اور یہ کمزور و ناتواں جسم وہاں پہنچ گیا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا، جہاں ہر ایک کو پہنچ جانا ہے مگر دل سے آج بھی یہ آواز آتی ہے:۔

"بھائی! آپ کہاں ہیں۔ آہ۔ بھائی!

امداد و تعاون کا جذبہ

دوسروں کے کام آنے، ان کے کاموں میں ہاتھ بٹانے اور مشکلات کو دور کرنے میں پوری دلچسپی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ محلّہ اور محلّہ سے باہر کے نہ جانے کتنے ضرورت مند اور غریب لوگ آتے اپنی پریشانیوں اور مجبوریوں کا اظہار کرتے اور والد مرحوم اپنے پاس سے یا دوسرے حضرات کے ذریعہ ان کی مالی امداد کیا کرتے بہت زیادہ رقیق القلب تھے حادثات سے بہت جلد متاثر ہوتے چہرے پر ایک کرب سا آکر گذر جاتا

ایسے حضرت کی کہانی پوری توجہ سے سنتے جو غیر معمولی
حادثات کا شکار ہوتے بارہا ہم نے انھیں ہچکیوں کے
ساتھ روتے ہوئے دیکھا ہے۔ اپنی ہر کوشش سائل
کی ضرورت پوری کرنے میں لگا دیتے اور اس وقت تک
مطمئن نہ ہوتے جب تک کہ اس شخص کی خاطر خواہ مدد
نہ کر لیتے۔ بہت سے گھر تھے جو اُن کے تعاون سے ایک
پرسکون اور مطمئن زندگی گذار رہے تھے۔ بہت سے
خاندان ہیں جنھوں نے ان کے ذریعہ اپنی مالی پریشانیوں
کو دُور کیا اور بہت سے ایسے افراد تھے جنکا اپنے حلقۂ اثر
سے انھوں نے مالی امداد کا انتظام کیا۔

اب کہاں ایسے لوگ اور ایسا جذبہ رکھنے والے
انسان جو دوسروں کی تکلیف پر بے چین ہو اٹھیں اور
ان کی مجبوریوں کو اپنی مجبوری سمجھ کر دور کرنے کی کوشش کریں۔

معاملات

جس شخص کے ہزاروں لوگوں سے تعلقات ہوں،
صبح وشام ملنا جلنا ہو۔ ان گنت لوگوں سے راہ ورسم ہو
اور احباب کا ایک بڑا حلقہ ہو اس کے ساتھ دو چار ایسے
واقعات کا ہو جانا کوئی بعید نہیں جس سے دوسرے لوگ
اس کی دیانت وامانت پر شک کرنے لگیں۔ انھوں نے
بڑے وقار اور بڑی شان کے ساتھ اپنا وقت گذارا معاملات
کے بالکل سچے اور صاف تھے۔ کسی سے قرض لینا، قرض
لیکر واپس نہ کرنا، کسی کو پریشان کرنا یہ ان کی فطرت
نہ تھی۔ قرض نام کی کوئی چیز ان کے قریب سے ہو کر نہیں
گذری، ہزاروں لوگوں کے بڑی بڑی رقموں کے معاملات
ان سے متعلق رہے مگر کسی کو کبھی کوئی حرف شکایت
زبان پر لانے کا موقعہ ملا ہو ایسا کبھی نہیں ہوا۔ قرض دے
دیتے تھے قرض لینے کی قطعی عادت نہ تھی۔ اپنے مسائل
ہزار مجبوریوں کے ساتھ تنگی ترشی کے عالم میں ہر طرح خود
ہی نمٹاتے تھے۔ اور بسا اوقات نقصان اٹھا کر بھی دوسروں
کو کچھ کہنے کا موقع نہیں دیتے تھے۔ مثال میں ایک واقعہ
نقل کر دینا کافی ہوگا۔ رسالہ دارالعلوم کا تین چار مہینے
کے اندر ہزاروں روپیہ کا کاغذ آتا تھا۔ جسکی رقم کی ادائگی
والد مرحوم کے ہی ذریعہ ہوتی آخری بار کاغذ آیا کچھ رقم ادا
ہوگئی اور کچھ باقی رہ گئی۔ اتنے میں دارالعلوم کا کاروبار
ہی الٹ کر رہ گیا رقم پھنس گئی اور دارالعلوم میں داخل
ہونے والے لوگوں نے یہ کہہ کر رقم کی ادائگی سے انکار کر دیا
کہ یہ کاغذ ہم نے نہیں منگایا تھا اس لئے اس کی رقم ہم ادا
نہیں کریں گے۔ کاغذی والد مرحوم کو ذمہ دار جانتا اور ان
ہی سے رقم کا مطالبہ کرتا۔ آخر کار یہ رقم اس طرح ادا ہوئی
کہ والد مرحوم نے خود اپنی جیب سے کئی قسطوں میں یہ روپے
دئے لیکن اس کاغذی کو اس کا موقع نہیں دیا کہ وہ
شکایت کا پہلو سامنے لائے یا بدگمانی کا شکار ہو دوسرا
واقعہ بھی لگے ہاتھوں سُن لیجئے۔ والد مرحوم رسالہ دارالعلوم
کی دور آنے والی رقم گھر ہی پر رکھتے جب دارالعلوم سے
ان کا تعلق منقطع ہو گیا تو انھوں نے یہ تمام رقم حسابات
کے ساتھ دارالعلوم میں جمع کرادی اور یہ اس صورت میں تھا
کہ دارالعلوم والوں نے کاغذی رقم ادا کرنے سے انکار
کر دیا تھا۔ اگر چاہتے تو اس رقم کو کاغذی کو دیکر پیچھا
چھڑا سکتے تھے مگر یہ ان کے اصول اور معاملات کے خلاف
تھا اس لئے ایسا نہ کر سکے۔

پیدائش اور ابتدائی حالات

۱۳۳۸ھ اواخر شعبان میں وہ دیوبند کے مشہور محلہ
دیوان میں جس میں حضرت شاہ صاحبؒ نے ابتداء میں
قیام فرمایا تھا پیدا ہوئے۔ تاریخی نام مظفر حسن رکھا گیا
یہ دور حضرت شاہ صاحبؒ کی علمی شخصیت اور کمالات
کے عروج کا دور تھا ان کی شہرت وعظمت کا چرچا پورے

دنیا میں پھیل چکا تھا اور وہ علمائے دیوبند میں ایک بلند مرتبہ اور عظیم علمی شخصیت کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے تھے اسی علمی ماحول میں آپکی پرورش ہوئی اور عمر کے تیرہ برس انھوں نے حضرت شاہ صاحب رح کی حیات میں گذارے۔ اولاً حفظ قرآن کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ حضرت امام العصر رح کی حیات ہی میں رمضان کے مبارک مہینوں میں تین بار قرآن سنانے کا موقع ملا پھر اپنے وقت کے مشہور اور نادرۂ روزگار عالموں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مولانا سید محمد ادریس صاحب سکروڈھویؒ، مولانا بدر عالم میرٹھیؒ مولانا اعزاز علی صاحبؒ سے فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ان حضرات نے پوری توجہ اور محنت کے ساتھ والد مرحوم کی ابتدائی تعلیم و تربیت میں ہاتھ بٹایا مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد نہ صرف تعلیمی سلسلہ ہی منقطع ہوا بلکہ ان کے ذہن وفکر کی دنیا ہی بدل گئی اور انھوں نے اپنی ذہنی اور فطری صلاحیتوں کو میدان تحریر میں آزمانے اور پروان چڑھانے کا فیصلہ کیا اور یہیں سے مستقبل کے ایک بلند پایہ صحافی اور صاحب طرز انشاء پرداز کی زندگی کا آغاز ہوا۔

حضرت امام العصر علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کی وفات کے بعد تعزیت کی غرض سے آنے والے حضرات میں ایک نام مولانا ظفر علی خاں کا بھی ہے جو حضرت شاہ صاحب رح کی وفات کے بعد بغرض تعزیت دیوبند تشریف لائے جامع مسجد دیوبند میں ایک تعزیتی جلسہ ان کی آمد پر منعقد ہوا جسمیں مولانا ظفر علی خاں کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ سپاسنامہ ہی کی شکل میں یہ والد مرحوم کی پہلی کوشش تھی اور یہی پہلا مضمون ظفر علی خاں جیسے بلند پایہ ادیب، صحافی اور مستند انشاء پرداز کو اس قدر پسند آیا کہ دیوبند سے واپسی کے بعد انھوں نے بطور خاص یہ سپاسنامہ اپنے مشہور زمانہ اخبار زمیندار کے صفحۂ اول پر شائع کیا۔ تحریر و قلم کی دنیا میں اس سے زیادہ شاندار آغاز کس کا ہو سکتا تھا اور کس کے لئے یہ فخر کی بات نہیں ہو سکتی کہ اس کا پہلا ہی مضمون زمیندار جیسے مؤقر، مشہور اور بلند اخبار میں شائع ہو۔

سلسلہ آگے بڑھتا ہے

اس دن کے بعد سے لیکر لکھنا اور صرف لکھنا ان کی زندگی کا ایک اہم اور بنیادی مقصد بن گیا انھوں نے اپنی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کے ہزاروں چراغ روشن کئے، صفحۂ قرطاس پر سوز میں ڈوبی ہوئی تحریریں اور عبرت و نصائح سے بھرپور مضامین اندھیروں اور تاریکیوں کے سینے میں ایک شمع بن کر اجالا کرتے رہے۔ کوئی موضوع ایسا نہ رہا جس پر قلم نہ اٹھایا اور جس کا حق ادا نہ کر دیا ہو۔ ابتداً ایک مختصر سی کوشش سے ہوئی اور انجام ہزاروں مضامین کی شکل میں سامنے آیا۔ اخبارات و رسائل میں بے تکلف لکھا کوئی ایسا رسالہ نہ رہا جسمیں آپ کا مضمون شائع نہ ہوا۔ لکھنے کے میدان میں انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت نہ کی بس قلم کا سفر جاری رہا وہ اداس راہوں، پرہول ماحول، رات کے سناٹوں، شام کے اندھیروں اور ہزار وحشتوں کے درمیان اپنی ذہانت، فکر اور بلند خیالات کی روشنی بکھیرتے رہے اپنے مضامین کے ذریعہ دین و مذہب کی اشاعت اور تبلیغ کا فرض پورا کیا اپنے والد مرحوم کی طرح انھوں نے اپنی پوری زندگی دین کی خدمت میں صرف کی اور اس کے لئے قلم کو ذریعہ بنایا وہ صالح اور مثبت انداز فکر کے ساتھ تمام مسائل کا حل پیش کرنے کے عادی اور ان کو سلجھانے کے خواہشمند رہتے۔ ٹکراؤ یا اختلاف کی پالیسی ان کے مزاج میں داخل نہ تھی۔ وہ ہر معاملے

کی گہرائی میں پہنچتے اور وہاں سے ان چیزوں کو نکال کر لاتے جو مفید ہوتیں اور ان کی نشاندہی کرتے جو ضرر رساں ہوتیں۔ اس پاکیزہ مقصد کے تحت زندگی گذارنے اور تمام عمر صرف کر دینے والے انسان کی زندگی قابل رشک بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔

تقریر کے میدان میں

تحریر کی دنیا میں وہ بلاشبہ خاص لب ولہجہ اور زبان کے مالک تھے مگر تقریر کی دنیا میں بھی ان کا منفرد انداز تھا۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ان کی کافی تقریریں نشر ہوئیں جو مختلف موضوعات اور عنوانات پر مشتمل ہوتیں لیکن عوامی جلسوں میں بھی تقریر کا ان کا ایک خاص انداز تھا اکتوبر ۱۹۷۵ء میں مرحوم شیخ محمد عبداللہ کی توجہ سے امام العصر علامہ سید انور شاہ کشمیری رح کی خدمات اور کارناموں کے اعتراف میں ایک سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ جسمیں حضرت شاہ صاحب رح کے ارشد تلامذہ نے شرکت فرمائی۔ لگ بھگ ایک ہفتہ تک وادیٔ کشمیر ان حضرات کے علوم و کمالات سے مستفیض ہوتی رہی۔ والد مرحوم نے میر واعظ کشمیر مولانا محمد فاروق بخاری کی خواہش پر جامع مسجد سرینگر میں جمعہ کے روز نماز سے قبل لگ بھگ ایک گھنٹہ اتنی جامع، پر مغز، اور رواں دواں تقریر کی کہ ۲۵، ۳۰ ہزار کا مجمع مسحور ہو کر رہ گیا۔ دوسری تقریر جو انھوں نے اس سفر کے دوران کی وہ درگاہ حضرت بل کے ہزاروں افراد کے مجمع کے سامنے کی اور یہاں بھی مجمع ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ پھر دوسرے مواقع پر بھی ان کی مختلف تقاریر سامنے آتی رہیں جنتا پارٹی کے دور میں انھوں نے قرب وجوار اور آس پاس کے علاقوں میں سیاسی اسٹیج پر پہنچکر عوام کو صحیح صورت حال سے مطلع کیا اور صحیح فیصلے پر پہنچنے کی دعوت دی۔

دیوبند انٹر کالج میں ان کی قومی یکجہتی کے موضوع پر کی گئی تقریر اس لئے یادگار مانی جائے گی کہ اس تقریب میں دہلی اور دوسرے مقامات سے آئے ہوئے اردو ہندی اور انگریزی کے مشہور اور نامور صحافی موجود تھے اور کئی سو صاحب علم اور صاحب کمال کی موجودگی میں والد مرحوم نے قومی یکجہتی کے موضوع پر جس انداز میں روشنی ڈالی اور جس طرح اپنے خیالات کا بے خوف ہو کر اظہار کیا وہ یقیناً دوسروں کے لئے ایک مشکل امر تھا۔

شاعری

شاعری کی دنیا ہی الگ ہوتی ہے اور شاعر ایک خاص فکر اور ذہن لیکر اس دنیا میں آتا ہے انھوں نے شاعری کو مستقل طور پر نہیں اپنایا مگر اس میدان میں بھی عاجز نہ تھے غزلیں، نظمیں، نعتیں، قطعات، مخمسات، سہرے ہر صنف سخن میں وہ شاعری کرتے ان کی تمام تر شاعری اپنے وقت میں مختلف اخبارات ورسائل کے ذریعہ سامنے آتی رہی وہ فطری طور پر شاعری کو پسند نہیں کرتے تھے مگر اس میدان میں صاحب کمال اور صاحب فن حضرات کی خدمات اور کاموں کے معترف تھے۔ جن شعراء سے وہ متاثر تھے ان میں اقبال جگر، احسان، ظفر علی خاں، روش، سیماب، انور صابری اختر بشیرانی وغیرہ کے نام شامل ہیں ان حضرات کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر ان کے مضامین کا ایک انبار ہے میرے سامنے ان کی شاعری کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہے۔ جس کو یہاں نقل کرنا ممکن نہیں۔ لیکن درد و سوز میں ڈوبی ہوئی ایک نعت جس سے والد مرحوم کی سرور کائنات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ عقیدت ومحبت کا اظہار ہوتا ہے یہاں نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

غنچۂ دل کا کھلا صل علی محمد
باغ جہاں مہک اٹھا صل علی محمد

صبحِ ازل کی آبرو شامِ ابد کی آرزو
تشنہ لبوں کا آسرا صلِّ علیٰ محمّد
حسن کی ایک ادا ہے وہ عشق کی ایک صدا ہے وہ
فضلِ خدا کی انتہا صلِّ علیٰ محمّد
کفر کی ظلمتوں کو وہ بقعۂ نور کر گیا
سارا زمانہ کہہ اٹھا صلِّ علیٰ محمّد
ان کی ہدایتیں درست ان کی روایتیں بجا
مرکزِ خیر اور ہدیٰ صلِّ علیٰ محمّد
تیرے وجودِ پاک سے کفر کا زور گھٹ گیا
شرک کا نام مٹ گیا صلِّ علیٰ محمّد
سارے جہاں میں غلغلہ تیرے ظہور کا ہوا
سرد ہوا صنم کدہ صلِّ علیٰ محمّد
قیصرِ غم نواز کو رحمتِ خاص سے ملے
آپ کا لطفِ بے بہا صلِّ علیٰ محمّد

قصّے، افسانے، کہانیاں

تحریر کی دنیا میں ان کے قدم پڑے تو دُور دُور تک اپنے نقوش چھوڑتے چلے گئے کوئی گوشہ ایسا نہیں رہا جہاں انھوں نے اپنی صلاحیتوں کی گہری چھاپ نہ چھوڑی ہو حتیٰ کہ افسانے، کہانیاں اور قصّے بھی ان کے قلم سے نکلے۔ رسالہ "خود" لاہور اور رسالہ "سہاگ" وغیرہ میں ان کے یہ افسانے کہانیاں اور قصے شائع ہوئے خاص طور پر ان کی اس انداز کی جو چیزیں پسند کی گئیں ان میں "دو عیدیں"، اسرار و بصائر"، ڈاکٹر، انقلاب، شرابی شاعر، غریب، آزادی، بچے، ٹوٹا ہوا آئینہ وغیرہ کافی مقبول ہوئیں اور ان کو پسند کیا گیا۔ مگر فطری طور پر چونکہ یہ آپ کا میدان نہ تھا اس لئے بہت جلد اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور دوسرے موضوعات کو اپنا لیا۔

پریشانیوں میں ان کا عمل

زندگی کی طویل ترین مسافت کے دوران انسان کو مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر کبھی ایسے حالات پیدا ہوتے کہ پریشانیاں چاروں طرف سے گھیر لیتیں اور مسائل بالکل الجھکر رکھدیتے تو ان کی عبادت میں غیر معمولی اضافہ ہوجاتا، نمازیں پڑھتے، دعائیں مانگتے اور اپنے اللہ کے سامنے پوری عاجزی اور انکساری کے ساتھ گریہ وزاری کرتے اور رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی چاہتے۔ جدامجد رحمہ کے مزار پر حاضری میں پابندی پیدا ہوجاتی غرضکہ ایسی صورتوں میں جہاں انسان گھبرا اٹھتا ہے اور آسانی کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا ان کا ہمیشہ یہی عمل ہوتا اور ہم نے بارہا اس کا مشاہدہ کیا اور ہزاروں بار ایسے نتائج ہمارے سامنے آئے کہ ان کی پریشانیاں دشواریاں یکدم ختم ہوئیں اور زندگی کا قافلہ پھر اسی رفتار اور حالت میں اپنی منزل کی جانب میں بڑھنے لگتا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ پریشانیوں میں بھی انسان اگر اپنے خدا کی جانب متوجہ نہ ہو اور اس سے لو نہ لگائے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے ہلاک اور رسوا ہونے سے نہیں بچا سکتی!

آخری سفر

۱۳ ربیع الاول ۱۴۰۶ھ بروز بدھ دن کے تین بجے انھوں نے اس دنیا کی رنگینیوں سے منھ موڑا اور اگلے دن صبح نو بجے ان کی تدفین عمل میں آئی۔

نو بجے والد مرحوم کے خاص دوستوں اور احباب کے ساتھ یہ جنازہ شاہ منزل سے روانہ ہوا جامع مسجد دیوبند میں غیر معمولی تعداد میں موجود لوگوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ شہر کے سرکردہ افراد، علماء، فضلاء اور طلباء کی ایک بڑی تعداد جنازہ میں شریک تھی اسکے

انتقال کی خبر دارالعلوم (وقف) دیوبند، اور دارالعلوم دیوبند کے لاؤڈ اسپیکر سے پورے دیوبند میں پھیل گئی کاندھوں سے کاندھوں پر ہوتا ہوا یہ جسدِ خاکی آخر مزارِ انوری میں پہنچ گیا اور نو بجے پوری نصف صدی کی ایک پاکیزہ داستان، ایک مقدس کہانی، ایک غیر معمولی انسان، ایک بلند فکر صحافی، ایک نمایاں ادیب، ایک منفرد لب ولہجہ کے انشاء پرداز کو علامہ انور شاہ کشمیری رح کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

جنازہ کے ساتھ ساتھ جہاں جہاں سے گذر ہو رہا تھا جس طرف سے ہم آ جا رہے تھے یہ احساس دل کو چُور کئے دے رہا تھا کہ ان راستوں اور ان راہوں پر والد مرحوم کے جسدِ خاکی کے ساتھ ہی ہی ہمارا یہ آخری سفر ہے اور اب کبھی یہ موقع نہیں ملے گا کہ ہم ان کے ساتھ چند قدم چل سکیں ان کی معیت میں راستہ طے کر سکیں ان کی سرپرستی میں کسی سفر کی تکمیل کر سکیں ہمیں اب تنہا ہی اس دنیا کا بار اٹھانا ہے۔ اپنی ضروریات اور مسائل کو خود ہی سلجھانا اور پورا کرنا ہے۔ اب ان کی رفاقت، ان کی مدد، ان کا تعاون ہمیں کبھی حاصل نہ ہو سکے گا۔ باقی رہنے والی ذات اللہ ہی کی ہے۔

آخری بات

یہ دنیا ایک ایسا کارخانہ ہے جہاں روز انسان بنتے اور روز گم ہوتے ہیں۔ کس لمحہ کس کے لئے پیغام اجل آجائے اور کس کو اس دنیا کی رنگینیوں کی طرف بڑھا دیا جائے کوئی نہیں بتا سکتا آج جو آ رہے ہیں ان کو کل موت کی آغوش میں جا سونا ہے اور جو کل آئے ان کے جانے کا سلسلہ چل رہا ہے۔ بس سانس رُکا اور انسان یہ جا وہ جا۔

اب آپ روتے رہئے، چلاتے رہئے، کوئی سننے والا نہیں۔ ہماری اور آپ کی تقدیر میں روزِ ازل سے یہ لکھ دیا گیا تھا کہ ہم اس دنیا میں آئیں گے اور پھر ایک مقرر وقت گذار کر اپنے اللہ کی جانب لوٹ جائیں گے۔ جس مٹی سے ہمارا خمیر اٹھایا گیا اسی مٹی میں پھر ہم کو کھپ جانا ہے

ہمارے دل کی دنیا اندھیری ہے، دماغ پر سیاہی کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں اس تاریکی اور ظلمت میں کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا۔ زمانہ آگے بڑھیگا، وقت اپنی روش پر اسی طرح اپنا سفر جاری رکھیگا، رات اسی طرح آئے گی، صبح کا آغاز اسی طرح ہوگا۔ بہار اپنے وقت پر خزاں اپنے ٹائم پر، سردی اپنے مقررہ دنوں میں، گرمی اپنے معمول پر آئے گی۔ بہاریں آئیں گی پھول کھلیں گے ہر ہر چیز جھومے گی، مست ہوگی، خوشی اور مسرتوں کے نغمے گائے گی مگر ہمارے دل میں، ہمارے ذہن میں جدائی کا جو طوفان ہے وہ کم نہ ہو سکے گا۔ بچھڑ جانے کا جو درد ہمارے اندر پل رہا ہے وہ کم نہیں ہوگا بلکہ وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کی جڑیں مضبوط ہوں گی اور یہی غم ایک دن ہمیں بھی اس دنیا کی رنگینیوں سے اٹھا کر کسی ویران اور سنسان قبرستان میں لے جا کر ڈال دیگا، بے یار و مددگار، تنہا اور بالکل اکیلا مگر آپ یا ہم کر ہی کیا سکتے ہیں یہ تقدیر کا نوشتہ اور قسمتوں کی تحریر ہے اس سے آج وہ گذرے کل ہماری باری ہے۔ بچھڑنے، ملنے، جدا ہونے اور یکدم مل جانے کا یہ سلسلہ زمین کے سینے پر اسی طرح چلتا رہیگا۔ ہر چیز بہر فنا، ہر چیز پر موت طاری ہوتی ہے یہاں اس کی بھی کوئی قید نہیں کہ پہلے کون آیا اور بعد میں آنے والا کون ہے۔ بس جس کو پکارا جائیگا اس کو جانا ہی ہوگا۔ اقبال نے کتنی سچی بات کہی تھی کہ

اول و آخر فنا، ظاہر و باطن فنا
نقش کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا

بس موت اور فنا ہونا ہی ہماری منزل ہے۔ اور جب سب کو ہی اس منزل پر پہنچنا ہے تو جانے والے سے کیا شکایت اور اس سے کیسا شکوہ، جانے والے کے اپنے اختیار میں نہ موت تھی اور نہ زندگی جو کچھ بھی ہے وہ اسی مالک اور خالق حقیقی کا ہی ہے اسی لئے اس کے حضور میں دعاء کرتے ہیں کہ:۔

رب العلمین! والد مرحوم کی مغفرت فرما، ان کے درجات بلند فرما، ان کو اپنے کرم اور اپنی بے پایاں عنایتوں سے نوازدے!۔

آمین

شاہ جی کی اولاد

شاہ جی کی اولاد کے ذکر سے پہلے امام العصر رح کی اولاد پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔

امام العصر حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری رح کے تین صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں ہوئیں۔

(۱) عابدہ خاتون ——— (عین جوانی کے عالم میں اس دنیا سے رخصت ہوگئیں)۔

(۲) مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم ——— (۲۷ نومبر ۱۹۸۵ء کو ۶۶ سال کی عمر میں وفات پائی)

(۳) راشدہ خاتون ——— (جو امام العصر علامہ کشمیری رح کے تلمیذ ارشد مولانا سید احمد رضا صاحب سے منسوب ہیں)

(۴) مولانا سید انظر شاہ صاحب مسعودی ——— (ہندوستان کے ممتاز عالم دین، مشہور اور مقبول مقرر، بلند پایہ مصنف اور علمائے دیوبند میں نمایاں و مستند حیثیت کے مالک ہیں)۔

(۵) سید اکبر شاہ مرحوم ——— (بچپن ہی میں اس دنیا کی رنگینیوں سے منہ موڑا اور بڑی بہن کے پہلو میں مزار انوری کے ایک گوشے میں مدفون ہیں)۔

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم کی بالترتیب تین شادیاں ہوئیں۔ پہلی دو مولانا کی ہی زندگی میں اس دنیا سے پردہ کر گئیں۔ تیسری اور آخری زوجہ بقید حیات ہیں۔ شاہ جی کی اولاد جو موجود ہے اور خاندانی روایات کو آگے بڑھا رہی ہے، وہ درج ذیل ہے

(۱) پہلی اہلیہ مرحومہ ——— (کوئی اولاد نہیں)

(۲) دوسری اہلیہ مرحومہ جن سے شاہ جی مرحوم کی یہ اولاد ہیں ——

(۱) ایک صاحبزادی۔ (بچپن میں انتقال ہوا) ——— (۲) عابدہ ثریا ———

(۳) سید اطہر شاہ ——— (۴) عشرت رعنا ———

(۳) تیسری اہلیہ جن سے شاہ جی کے چار لڑکے اور ۲ لڑکیاں ہوئیں۔

(۱) سید راحت شاہ قیصر ——— (۲) سید خالد شاہ (دس ماہ کی عمر میں انتقال ہوا) ——

(۳) نسیم اختر شاہ قیصر ——— (۴) ایک صاحبزادی (جو دنیا میں آنے سے پہلے ہی آنکھیں موند چکی تھی)

(۵) صبیحہ جبیں ——— (۶) سید وجاہت شاہ انور ———

مولانا اخلاق حسین قاسمی

مولانا ازہر شاہ قیصر صاحب کی وفات سے مجھے اپنے ایک مخلص کی جدائی کا صدمہ ہوا۔

میں یہ سطریں انتہائی احساس ندامت کے ساتھ لکھ رہا ہوں ان کی بیماری کے طویل عرصہ میں اور پھر اُن سے آخری ملاقات میں میری طرف سے سخت کوتاہی ہوئی اور یہ کوتاہی لاپرواہی کے سبب نہیں ہوئی بلکہ دارالعلوم کے حادثہ کے بعد میرا دل اتنا ٹوٹ گیا کہ میں نے اپنے آپ کو اس طرف جانے کے قابل ہی نہیں سمجھا۔

حضرت مہتمم صاحبؒ کی تعزیت کے بعد بھی میں نے چند گھنٹے جامع مسجد میں گذارے اور سہ پہر کی گاڑی سے دہلی واپس آگیا۔

یہ میری فطری کمزوری تھی — کسی سے شکوہ و شکایت نہیں۔

شاہ صاحب مجھے اپنا معتمد سمجھتے تھے، دارالعلوم سے کنارہ کشی کے بعد مرحوم جن جن آزمائشوں سے گذرے وہ سب مجھے خط کے ذریعہ سنا کر اپنا دل ہلکا کیا کرتے تھے۔

میں بھی ان سے اپنی پریشانیوں میں مشورہ لیتا تھا اور وہ بڑی امانت کے ساتھ مشورہ دیتے تھے۔

قضیہ دارالعلوم کے وقت میں جتنا وقت دارالعلوم کے مہمان خانہ میں گذارتا تھا، تنہا شاہ جی مرحوم میرا خیال رکھتے تھے۔

انھیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ میں اس میدان کا آدمی نہیں اور مرحوم یہ کہہ کر میری حوصلہ افزائی کرتے تھے کہ تم قلم دوات کے آدمی ہو، گھبرانا نہیں، یہ چند کی بات ہے قضیہ کسی نہ کسی رُخ پر ختم ہو جائے گا۔

جامعہ رحیمیہ کے اہتمام کی خبر سنکر جتنی خوشی مرحوم کو ہوئی شاید ہی کسی کو ہوئی۔

اس دوران میں ریڈیو پر تقریر کے سلسلہ میں دہلی تشریف لائے تو چند گھنٹہ جامعہ رحیمیہ میں ٹھہرے اور بار بار یہ فرماتے رہے کہ ہمیں اپنے اجڑنے کا اتنا غم نہیں، تم اپنی جگہ آگئے۔ تم نے شاہ عبدالقادر صاحب کے موضح قرآن پر وہ کام کیا ہے جسے خدا کے ہاں مقبولیت حاصل ہو گئی ہے۔

لکھنے پڑھنے کے کام میں شاہ جی اول دن سے میرے مربی اور سرپرست رہے۔ مرحوم "دارالعلوم" کے لئے مضامین کا برابر تقاضا کرتے رہتے اور ان کی حوصلہ افزائی کے سہارے گوتا پڑتا کچھ نہ کچھ لکھ کر بھیجتا رہتا۔

ایک طبقہ کو میرا برابر ماہنامہ "دارالعلوم" میں چھپنا شاق گذرتا تھا۔ اور وہ بھی اسے محسوس کرتے تھے مگر یہ ان کی شفقت تھی کہ وہ برابر مجھے سہارا دیتے رہتے تھے۔

عادل صدیقی صاحب کے سیر حاصل مضمون کے ساتھ جب قومی آواز میں میری نظر شاہ جی کے فوٹو پر پڑی تو مجھے مرحوم کی تصویر سے آنکھیں ملانے کی ہمت نہیں ہوئی۔

میں نے محسوس کیا کہ شاہ جی مجھ سے شکایت کر رہے ہیں کہ —— مجھے تم سے اتنی بے رخی کی امید نہ تھی۔

نہ جانے میں اُس عالم میں شاہ جی سے آنکھیں ملانے کے قابل ہونگا یا نہیں؟

جامعہ رحیمیہ کے متولی جناب الحاج علی محمد صاحب کو بھی شاہ جی سے خاص تعلق تھا۔ وفات کی خبر نے متولی صاحب کو بھی بے چین کر دیا، کافی دیر تک مرحوم کی اچھائیاں، اخلاص بزرگوں کے ساتھ وابستگی کے حالات سُناتے رہے۔

خداوند عالم مرحوم کو ان کے سلف صالحین کی رفاقت کا شرف عطا فرمائے۔

—— آمین ——

شاہ جی کی ادارت میں نکلنے والے اخبارات و رسائل

(۱) —— "انور"

(۲) —— "اُستقلال"

(۳) —— "ھادی"

(۴) —— "صداقت"

(۵) —— رسالہ "دارالعلوم"

(۶) —— "اجتماع"

(۷) —— ماہنامہ "طیب"

قرآن پاک اللہ برتر و بزرگ کا کلام ہے جو پوری دنیا کے لئے صحیفۂ سعادت اور مسلمانوں کے لیے ایک لازوال دولت ہے۔ امت نے جس طرح قرآن پاک کی حفاظت کی وہ مسلمانوں کے دینی احساس کا ایک نمایاں کرشمہ ہے۔ لاکھوں حُفّاظ قرآن پاک کو اپنے سینوں میں محفوظ کئے ہوئے اور کروڑوں مسلمان قرآن کی تلاوت کو اپنا وظیفۂ زندگی بنائے ہوئے ہیں۔

(مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصرؒ)

اس نمبر کے بارے میں

"طیب" کا مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم نمبر آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ نمبر کیسا ہے اور کیسا نہیں اس کے بارے میں آپ ہی کو فیصلہ کرنا ہے۔ ہاں چند چیزوں کا اقرار میرے لئے ضروری ہے۔

نمبر میں شامل زیادہ تر مضامین تاثراتی ہیں اور جن حضرات نے بھی مضامین تحریر فرمائے انھوں نے اپنے تعلقات و تاثرات کو زیادہ ذہن میں رکھا ہے اس طرح اس نمبر میں جو تنوع ہونا چاہیئے تھا وہ آپ نہیں پائیں گے۔ میں نے اپنی سی ہر کوشش کی ہر شخص کے پاس گیا، ہر اس آدمی سے ملا جس سے بہتر لکھنے کی توقع اور امید تھی۔ کئی ماہ کی سخت اور مسلسل خط و کتابت کا نتیجہ یہ مضامین ہیں ـــــ!

وہ حضرات جنھوں نے باوجود وعدوں کے مضامین دینے میں غیر معمولی تساہل اور بے توجہی کا معاملہ کیا ان سے بھی کوئی شکایت اس لئے نہیں ہے کہ اس دنیا میں ہر شخص کی اپنی مصروفیات ہیں اور ضروری نہیں کہ وہ ہماری خواہش پر کان دھرے ـــــ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ ان حضرات کے وعدوں نے میرے لئے نمبر کی اشاعت کے ارادے کو اور مضبوط اور مکمل بنا دیا، اور نتیجہ میں یہ نمبر حاضر ہے۔

میں پھر گذارش کروں گا کہ جو نقائص اس نمبر میں نظر آئیں ان کو میری ناتجربہ کاری پر محمول کریں اور سمجھ لیں کہ میں اپنے فرض کو صحیح طور پر ادا نہیں کر سکا اور اپنے مرحوم والد کی خدمت میں صحیح خراج تحسین پیش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔!

نسیم اختر شاہ قیصر

بڑے شاہ جیؒ

جوارِ رحمت میں

مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی

پرانے لوگ تیزی کے ساتھ اٹھتے جا رہے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے بہت جلد پرانی بساط سمٹ جائے گی اور صرف وہ لوگ رہ جائیں گے جو آزاد ہندوستان میں پیدا ہوئے۔

غلام ہندوستان علم و فن کے اعتبار سے بہت نمایاں تھا۔ ملک غلام تھا، باشندے غلام تھے اور ہم سب مل کر ملک کی آزادی کے لیے انگریزی اقتدار سے دست و گریباں تھے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے ذہن و فکر اور دل و دماغ آزاد تھے، سوچنے سمجھنے کی طاقت عروج پر تھی اور یہاں کے باشندوں میں حق و صداقت کے لئے جان دینے کی بے انتہا جرأت تھی۔ خوف اور خدشہ سے ان کا ذہن پاک و صاف تھا۔ علم و فن سے نوجوانوں کو خصوصی لگاؤ تھا، علمی کمالات کا گھر گھر تذکرہ تھا اور لکھنے پڑھنے کا ذوق بکھرا ہوا تھا — چودہویں صدی ہجری نے بڑے بڑے باکمالوں اور باذوق ادیبوں، شاعروں، صوفیوں، تاریخ دانوں اور علماء و مشائخ کو پیدا کیا ہے۔

ہمارے بڑے شاہ جی رہ بھی اسی دور کی پیداوار تھے۔ قوی الحافظ، غضب کے ذہین و ذکی اور بزرگوں کے بہت سارے واقعات کے حافظ تھے۔ انھوں نے ذہانت و ذکاوت اور قوت حافظہ اپنے والد بزرگوار سے ورثہ میں پائی تھی، مری مراد محدث العصر، استاذ المحدثین زندہ لائبریری اور دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

میں نے حضرت محدث کشمیری رہ کو دیکھا نہیں البتہ اپنے استاذ محترم سے انکے فضائل و مناقب سنے ہیں۔ لیکن بڑے شاہ جی کو دیکھا تھا، ان کی مجلسوں میں بیٹھا کرتا تھا انکی باتیں سنتا تھا اور ان کے حافظہ کی داد دینے پر مجبور ہوتا تھا اور انکی ذہانت و ذکاوت دیکھ کر ان کی مدح و ستائش پر خوشی محسوس کرتا تھا۔

دارالعلوم دیوبند سے رسالہ "دارالعلوم" نکلتا تھا اور اب بھی وہ نکل رہا ہے۔ میں جہاں دوسرے رسائل و اخبار منگواتا تھا، رسالہ دارالعلوم بھی منگوایا کرتا تھا۔ اس زمانہ میں دیوبند سے بہت دور صوبہ بہار کے مشہور ضلع مونگیر کے نامی گرامی قصبہ ساتحہ میں ملازم تھا اور وہاں دارالعلوم معینیہ کی صدارت تدریس میرے ذمہ تھی۔

سب سے پہلے اسی رسالہ سے شاہ جی کا تعارف ہوا میرے مضامین و مقالات رسالہ برہان دہلی وغیرہ میں شائع ہوا کرتے تھے، میرے مقالات شاہ جیؒ کی نظر سے گذرتے ہونگے، انھوں نے ازراہ بندہ نوازی مجھے خط کے ذریعہ یاد فرمایا اور رسالہ دارالعلوم کے لئے مضمون بھیجنے کی فرمائش کی۔ اس وقت میں جوان تھا اور لکھنے اور مطالعہ کی بھرپور طاقت تھی، بہت سارے مضامین

لکھ کر شاہ جی کی خدمت میں بھیجتا رہا اور وہ اسے اپنے رسالے میں شائع کرتے رہے۔

اسی زمانہ میں سوانح قاسمی کی جلدیں شائع ہوئیں تو انھوں نے اس کی پہلی جلد میرے پاس بھیجی اور حضرت نانوتوی رح پر تاریخ حقائق لکھنے کا حکم فرمایا برہان دہلی میں اس عنوان پر میرے بہت مضامین شائع ہو چکے تھے چنانچہ میں نے اس جلد کو پڑھ کر تاریخی حقائق مرتب کئے اور ان کو بھیجا، جسے انھوں نے چار قسطوں میں شائع کیا، قارئین دارالعلوم نے اس سلسلہ کو بہت پسند کیا۔

یہاں سے شاہ جی سے میرے تعلقات استوار ہوتے چلے گئے، دو چار سال بعد دارالعلوم میں ایک جگہ خالی ہوئی اور دارالعلوم نے چاہا کہ اس پر کسی با ذوق عالم کا تقرر کرے۔ شاہ جی کو میرے مضامین و مقالات کی وجہ سے مجھ سے انس پیدا ہو چکا تھا، اس جگہ کے لئے جہاں دوسروں کو دارالعلوم سے خط لکھا گیا خاکسار کے نام بھی ایک لمبا خط اس زمانہ کے مہتمم حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے دستخط سے میرے پاس پہنچا اور اسی جگہ کے لئے خود مجھ سے مری رائے معلوم کی گئی، یہ دائم ہے کہ جو شرائط اس میں درج تھے انکو پڑھ کر میں دنگ رہ گیا اور میں نے جواب میں لکھ دیا کہ میں ایک معمولی مدرس ہوں اس کے سوا مجھ میں کوئی خوبی نہیں ہے کہ پڑھنے لکھنے کا مجھ میں فطری ذوق ہے۔

شاہ جی دارالعلوم اور اس کے مزاج سے واقف تھے انھوں نے لکھا کہ تم بھاگو نہیں، اس جگہ کو قبول کر لو تم اس ذمہ داری کو بسہولت نباہ لوگے، اور اس سلسلہ میں کئی خط لکھ کر مجھے مطمئن کرنے کی سعی فرمائی۔

بہر حال مقدر تھا میں ۳ر صفر ۱۳۷۶ھ کی صبح میں دارالعلوم حاضر ہو گیا اور جگہ سنبھال لی۔ یہ پہلا دن تھا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے شاہ جی کو دیکھا ان سے باتیں ہوئیں تبادلہ خیال ہوا اور اس پر شاہ جی نے اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا۔ اس زمانہ میں میرا زیادہ اٹھنا بیٹھنا شاہ جی کے پاس ہی ہوا کرتا تھا۔ چھوٹے شاہ جی سے بھی ملاقات ہوئی اور ان سے بھی کچھ دنوں اچھا خاصا رابطہ رہا۔

بڑے شاہ جی رح ربع صدی کی تاریخ کے تقریباً حافظ تھے اور اس دور کے تمام علماء کرام کو دیکھے ہوئے اور ان کے حالات سے پورے طور پر واقف تھے، انداز بیان شاہ جی کا موقر ہوا کرتا تھا۔ کچھ دنوں بعد شاہ جی ہم لوگوں کے میر مجلس بن گئے اس کے مستقل ارکان میں مولانا محبوب رضوی، مولانا عبدالحق پیشکار اور یہ خاکسار تھا لیکن دوسرے بہت سارے اہل علم بھی جمع ہو جاتے تھے۔ اور کہنا چاہیئے ایک گھنٹہ یہ اچھی خاصی علمی مجلس ہوتی تھی۔ عام معلومات کا ذخیرہ شاہ جی کے پاس تھا تاریخی معلومات پر گوہر افشانی مؤرخ اسلام مولانا محبوب رضوی کیا کرتے تھے اور قرآن و حدیث کی بات آتی تھی تو اس پر مولانا عبدالحق داد تحقیق دیا کرتے تھے، کوئی سیاسی موڑ آتا تو خاکسار اس پر روشنی ڈال دیا کرتا تھا اور شاہ جی نے ڈانٹ کر کسی مسئلہ پر رائے پوچھی تو اسپر اظہار رائے بھی کر دیا کرتا تھا، یہی وجہ ہے کہ مرے غائبانہ شاہ جی مجھے علم کے باب میں کبھی کبھی بخیل کہدیا کرتے تھے۔

لوگ علمی موضوع پر گفتگو سے تھک گئے تو اب شاہ جی نے ایسے قصے چھیڑ دیئے کہ سنکر ہنستے ہنستے ہم لوگ بے خود ہو جایا کرتے۔

شاہ جی میں کینہ کپٹ قطعاً نہیں تھا۔ اگر کبھی کوئی ناگواری ہوئی تو محض وقتی طور پر، صاف دل تھے اور محبت و تعلق رکھنے والے آدمی تھے۔ اور تعلقات کو نباہنا

جاتے تھے۔

حضرت حکیم الاسلام رح کے دور اہتمام تک دار العلوم میں شاہ جی کو بہت اچھا اثر و رسوخ حاصل تھا، ممبران شوریٰ سے ان کے تعلقات مضبوط تھے، ان میں بہت سارے ممبران شوریٰ انکے ابا کے شاگرد تھے اور وہ شاہ جی کا ان کے صاحبزادہ اور استاد زادہ ہونے کی حیثیت سے پورا دھیان رکھتے تھے بلکہ احترام کرتے تھے، اور شاہ جی جو کچھ چاہتے کرا سکتے تھے مگر تیس سالہ ہمنشینی کا مجھے تجربہ ہے کہ بڑے شاہ جی نے کبھی کسی کو نقصان پہنچانے کا ارادہ تک نہیں کیا فائدہ تو بہتوں کو پہنچایا آج بھی ایسے بہت سارے لوگ زندہ ہوں گے جنکی انھوں نے بھرپور مدد کی ہے اور اندر و باہر سے ان کی مدد کی اور کرائی ہے۔

شاہ جی میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اہل علم کا احترام کرتے تھے اور پیٹھ پیچھے ان کے علم کی تعریف کیا کرتے تھے اور سامنے حوصلہ افزا کلمات فرماتے تھے، جس کی آج بڑی کمی ہے۔ جب کوئی غمزدہ صورت بنا کر ان کی مجلس میں آتا تو پھر اسے ایسے باغ و بہار کے افسانے سناتے کہ وہ بھی باغ باغ ہو جاتا اور تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنا سارا غم بھول جایا کرتا تھا۔

غالباً ۱۳۸۲ھ کی بات ہے کہ رسالہ دار العلوم میں "حرف آغاز" نہ ہونے کا تذکرہ زبانوں پر آیا مجلس شوریٰ نے اداریہ نہ ہونے کو رسالہ کے لئے ایک بڑی کمی محسوس کی اور اس کے لئے آدمی کا انتخاب شروع ہوا۔ ان لوگوں میں ایک خاکسار کا نام بھی آیا۔ مجھ سے بعض بزرگ ممبروں نے رائے معلوم کی، میں نے عرض کیا کہ حضرت! شاہ جی اسے غالباً پسند نہیں کریں گے اور میں اس لئے بھی ڈرتا ہوں کہ وہ میرے استاد مدظلہ کے استاد زادہ ہیں، کبھی ایسا نہ ہو کہ یہ شاہ جی کی خفگی کی وجہ بن جائے اسلئے معاف رکھا جائے تو بہتر ہے۔

ایک دفعہ ایک چپراسی آیا کہ شوریٰ میں آپ کو بلایا جا رہا ہے، فوراً چلیں، مرتا کیا نہ کرتا۔ ڈرتا اور سہما ہوا چلا اور سوچتا ہوا جا رہا تھا کہ آخر مجھ سے کیا قصور ہوا۔ اللہ تعالیٰ رحم کرے، دفتر اہتمام میں پہنچا تو سارے ممبران بیٹھے نظر آئے، میں جاکر ادب سے بیٹھ گیا، ایک ممبر محترم نے پوچھا آپ رسالہ دار العلوم پڑھتے ہیں؟ میں نے کہا جی ہاں پڑھتا ہوں!— اس میں اداریہ ہوتا ہے؟ میں نے کہا نہیں ہوتا ہے؛ فرمانے لگے اس کی ضرورت ہے؟ عرض کیا اس کا فیصلہ تو آپ حضرات فرمائیں گے، دوسرے ممبر محترم نے فرمایا اس کی ضرورت ہے اور اداریہ ضرور ہونا چاہئے۔ پھر مجھ سے کہا گیا کہ یہ ذمہ داری آپ پر ڈالی جا رہی ہے۔ اور اڈیٹر کے ساتھ آپ کا نام بھی ہوگا۔ ٹائیٹل پر دو نام ہونگے۔ میں نے ادب سے عرض کیا کہ حرف آغاز کا جہاں تک تعلق ہے اس کے لئے اپنے کو آمادہ پاتا ہوں اگر شاہ جی پسند کریں۔ لیکن ٹائیٹل پر اپنا نام مجھے قطعاً پسند نہیں ہے۔ آئے ہوئے مضامین پر نظر ثانی کی ذمہ داری بھی لے سکتا ہوں۔ ایک معزز ممبر نے میری حمایت فرمائی اور کہا کہ مناسب یہی ہے کہ ان کے ذمہ صرف حرف آغاز کا لکھنا ہے اور آئے ہوئے مضامین پر نظر ڈال لینا۔ پھر انھوں نے ہی کہا کہ شاہ جی آپکے نام پر اتنے کام کے لئے راضی ہیں و بات طے پا گئی میں اٹھ کر چلا آیا، مگر ڈرتا رہا۔ شاہ جی نے بلا کر کہا تم حرف آغاز لکھدیا کرو، اور اس سے پہلے مجھ سے مشورہ کر لیا کرو۔ میں نے عرض کیا ایسا ہی ہوگا۔

کم و بیش بیس سال میں نے رسالہ دار العلوم کا شاہ جی کی ادارت کے زمانے میں "حرف آغاز" لکھا اور کبھی بھی اس معاملہ میں شاہ جی کا مجھ سے اختلاف نہیں ہوا بلکہ پیچھے سراہا۔ اگر کبھی میں رخصت پر وطن چلا گیا اور کسی دوسرے نے حرف آغاز تحریر کیا تو وہی باعث نزاع اور وجہ شکوہ و شکایت بن گیا۔

اس سلسلہ میں میرے ذوق سے شاہ جی کا ذوق ملتا جلتا تھا کہ لڑائی جھگڑے کی کوئی بات ہرگز نہیں ہونی چاہیئے اور نہ کسی کی ذات پر کوئی تنقید ہونی چاہیئے، بیس سال کی اس شرکت میں ایک لمحہ کی رنجش نہ ہونا یہ حضرت شاہ جی کی سلامتی طبع کی دلیل ہے۔ یقیناً وہ سلیم الطبع تھے۔ کبھی کبھی غصہ ضرور آتا تھا مگر بہت تھوڑی دیر کے لئے۔ اور جو کچھ کہنا ہوتا کہہ دیا کرتے تھے دل میں پال کر اسے توانائی نہیں بخشتے تھے۔

ممبران شوریٰ کے علم وفضل کے قائل تھے اور اپنے ابا کے تلامذہ کی تو بیحد قدر کرتے تھے اور ساتھ ہی تعریف بھی۔ ان میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ؒ، حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رح سے بہت گہرا تعلق تھا۔ کہتے تھے کہ ڈابھیل میں جب وہ پڑھتے تھے یہ دونوں بزرگ میری ناز برداری کیا کرتے تھے۔ میں بہت کم سن تھا اور کوئی بات ہوتی تو ابا انہیں بزرگوں سے فرماد یا کرتے تھے، اسی کے ساتھ یہ بھی شاہ جی فرماتے تھے کہ ان دونوں بزرگوں نے ہر دور میں میرے گھر کی خبر گیری کی اور گھر پر آکر اماں جی کو سلام کیا کرتے تھے۔ اماں جی ان دونوں کو بہت مانتی اور چاہتی تھیں۔

استاذ محترم حضرت مولانا اعظمی دامت برکاتہم کے علم وفضل پر شاہ جی کو فخر تھا اور کہتے تھے کہ ابا جی انکو اہل علم مانتے تھے، اور انکی صلاحیت کے لئے ایک خاص جملہ فرمایا تھا۔

کبھی ....

کبھی اپنی مجلس میں کہا کرتے تھے کہ ابا جی کے شاگردوں کے خلاف کوئی جملہ منھ سے نکالنا پسند نہیں کرتا ہوں۔

شاہ جی امیر شریعت مدظلہ کی بھی اپنی مجلس میں کافی تعریف کرتے تھے اور اس پر خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ ایک دو دفعہ میں نے کسی سلسلہ میں ان سے سفارش کی تو انھوں نے ابا جی کے تعلق سے مری بات رکھ لی، حالانکہ وہ اسکو پسند نہیں کرتے تھے۔

مولانا ڈاکٹر مصطفیٰ علوی کے سلسلہ میں اپنی بعض مجلسوں میں بتایا کہ وہ پرانے انداز سے مجھے بطور نذرانہ یا ہدیہ کچھ روپے دیا کرتے ہیں اور انداز نیاز مندانہ اختیار کرتے ہیں حالانکہ علم وفضل اور عمر میں مجھ سے بہت بڑے ہیں اور مجھے ان کی اس ادا پر شرم آتی ہے، مگر کیا کیا جائے وہ فرماتے ہیں کہ تم میرے استاذ زادہ ہو، تمہارا اکرام میرے فرائض میں داخل ہے۔

شاہ جی بظاہر اوراد و وظائف کے قائل تھے نہ پابند مگر جب کبھی اللہ رب العزت کی رحمت وبخشش پر بولنے لگتے تو بڑے موثر انداز میں فضل وکرم اور اسکی رحمت ورافت کو بیان کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت وہ مرشد کی مسند پر بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔

شاہ جی کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ کبھی مایوسی اور ناامیدی کی گفتگو نہیں کرتے تھے اور نہ ایسی باتیں جس سے کسی کا حوصلہ پست ہو، بلکہ حوصلہ افزا کلمات سے دوستوں اور ساتھیوں کو نوازتے تھے۔

شاہ جی کی طبیعت باغ و بہار تھی، خود بھی خوش رہتے تھے اور دوسروں کو بھی خوش وخرم دیکھنا چاہتے تھے، مجلس میں کبھی اداسی کو قدم ڈالنے کی اجازت نہیں دیتے تھے ان کی گفتگو بڑی ہی دل چسپ ہوا کرتی تھی ان کی لمبی باتوں کو سنکر بھی کوئی گھبراتا اور اکتاتا نہیں تھا۔

ایک زمانے میں شاہ جی کی زبان پر دانے نکل آئے تھے اور کافی کمزور ہو گئے تھے، بیمار چل رہے تھے مگر اس زمانہ میں بھی خوش طبعی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ایک دن گھر سے دفتر آئے تو کہنے لگے کہ انشاء اللہ اب اچھا ہو جاؤں گا، پوچھا گیا، کیا بات پیش آئی آج ماشاءاللہ

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر

ہندوستان کے مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ علماء کا وہ علمی طبقہ اٹھتا جا رہا ہے جو علوم دینی کا بحر ذخار تھا علوم وفنون پر حاوی تھا۔ اہل علم ہونے کے ساتھ عمل صالح کا حامل تھا اور اسلاف کے طریقوں پر چلتا اور ان کی یادوں کو اپنے سینوں سے لگائے رکھتا تھا اور ان کے علمی کارناموں کو تازہ کرتا رہتا تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی حضرت شاہ عبدالحق محدث، حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ عبدالعزیز حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا مملوک علی حضرت مولانا فضل حق خیرآبادی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن حضرت مولانا یعقوب نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا انور شاہ کاشمیری، حضرت امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مفتی اعظم محمد کفایت اللہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند رحمہم اللہ اجمعین جیسی شخصیتیں اپنے زمانہ کی لاثانی ہستیاں مانی جاتی تھیں جنھوں نے اپنے تاریخی علمی کارناموں سے دنیا کو منور کیا اب انکی مثال ملنا مشکل ہے بلکہ ان کے علمی کارناموں سے آشنا اور واقف لوگ اور جانشینی کا درجہ رکھنے والے حضرات جلدی جلدی اٹھتے جارہے ہیں اور چاروں طرف قحط العلماء ہے اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ جناب مولانا ازہر شاہ قیصر ان ہستیوں کے حقیقی ترجمان، جانشین اور ان کے کارناموں کی تبلیغ کرنے والے مبلغ تھے تو غلط نہ ہوگا۔

جناب مولانا ازہر شاہ قیصر جہاں حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے خلف الرشید تھے وہاں ان میں اپنے باپ کی خوبیاں بھی تھیں۔ خون کا اثر ضرور ظاہر ہوتا ہے ان میں اپنے والد ماجد کی طرح خودداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور اہل علم کے قدرداں ہی نہیں بلکہ عاشق زار تھے مصائب و آلام ہنسی خوشی برداشت کرتے تھے۔ لیکن ظلم وستم اپنا اثر ضرور چھوڑ جاتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی ناموس عزت کو خاک میں ملانے پر اور اس کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے نبیرہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ پر جو شرمناک حملے ہوئے تھے اسکو حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے برداشت کیا اور دارالعلوم کی بے حرمتی کی خاطر جان نثار کر دی۔ جناب مولانا ازہر شاہ کاشمیریؒ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے ان جاں نثار ساتھیوں میں سے تھے اور قاسمی خاندان سے بے پناہ عقیدت رکھنے کی وجہ سے دارالعلوم کے مسئلہ میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا انھوں نے آخر تک ساتھ دیا

دارالعلوم دیوبند کی بے حرمتی کرانے کی پشت پر جو فرعونی طاقت تھی اس سے وہ کبھی مرعوب نہیں ہوئے۔ آخری عمر کا حصہ اسی غم میں گھلا دیا اور آخر وہ بھی اللہ کے پیارے ہو گئے۔

جناب مولانا ازہر شاہ قیصر بڑی خوبیوں کے مالک تھے ایک اہم خوبی ان کی یہ تھی کہ اسلاف اور اپنے اکابر کی بڑی قدر کیا کرتے تھے ان کے کارناموں کو پھیلانے کے لئے ہمہ تن مصروف رہتے تھے ان کے مضامین کا زیادہ تر حصہ انہی حضرات کے حالات زندگی سے پُر ہے چنانچہ انکی تصانیف حیات انور، یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ، اور سفینۂ وطن کے ناخدا، میں انہی حضرات کے حالاتِ زندگی درج ہیں۔

میرے والد ماجد حضرت العلامہ مولانا اشرف الحق صدیقی قادری صابری دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے انکے اساتذہ میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی، حضرت مولانا سید احمد دہلوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی تھے۔ آپ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت ہی نہیں بلکہ حضرت حاجی صاحب کے خلفاء میں آپ کا شمار ہوتا ہے اپنے استاد اور پیر کے ناموں کی مناسبت سے مجھ "امداد صابری" کا نام "امداد الرشید" رکھا تھا۔ میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا اشرف الحق صاحب کے حالات زندگی پر ایک کتاب "داستان اشرف" ۱۹۷۹ء میں تالیف کی تھی۔ اس کے اجراء کے سلسلے میں غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین اولیاء میں ایک اجلاس اُسی سال منعقد کیا تھا اس کتاب کا اجراء حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کے دست مبارک سے کرانے کا پروگرام تھا۔ قاری صاحب کی مصروفیت کی وجہ سے ان کی منظوری لینے کا ذریعہ میں نے جناب محمد ازہر شاہ صاحب کو بنایا تھا ان کو اسی سلسلہ میں خطوط لکھتا رہتا تھا جناب مولانا ازہر شاہ قیصر بڑی مستعدی کے ساتھ اس کام کو انجام دینے میں لگ گئے چنانچہ انکی کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب تاریخ مقررہ پر اس روز تشریف لائے جس روز شام کو دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا ایک اہم اجلاس ہونے والا تھا۔

اس اجلاس کے بعد ایک دوسرا اہم ترین اجلاس حضرت العلامہ امام المناظر مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا یادگار اجلاس دوسرے سال ۶ اپریل ۱۹۸۰ء کو بچوں کے گھر دریا گنج دہلی میں منعقد ہوا تھا اس میں میری دو کتابیں آثار رحمت (تذکرہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی) اور "فرنگیوں کا جال" کا اجراء بھی ہونا تھا اس اجلاس کی صدارت حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے فرمائی تھی۔ اس سلسلہ میں بھی جناب مولانا ازہر شاہ قیصر کو تکلیف دی گئی۔ خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا اور انہی کو حضرت قاری صاحب کی منظوری کا ذریعہ بنایا گیا اور ان سے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے حالات زندگی پر مضمون بھی طلب کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بھی مولانا کی سعی ثمر آور ثابت ہوئی اور حضرت قاری صاحب نے اس اجلاس میں شرکت فرما کر حضرت العلامہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی بانی مدرسہ صولتیہ کے سیاسی و علمی کارناموں پر روشنی ڈالی اور جناب مولانا ازہر شاہ صاحب نے سوونیئر کے لئے اپنا مضمون بھی ارسال فرمایا۔ اس سلسلہ میں جناب مولانا ازہر شاہ قیصر نے میرے نام حسب ذیل خطوط بھی روانہ فرمائے۔ ان خطوط سے اندازہ ہوگا کہ وہ اپنے بزرگوں سے بے پناہ عقیدت رکھنے کی وجہ سے کس ذمہ داری سے کام کو انجام دیتے تھے۔

جناب مولانا امداد صابری السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
مضمون تیار ہے انشاء اللہ ایک دو روز میں نظر ثانی اور نقل کرنے کے بعد ارسال خدمت کرتا ہوں آپ مطمئن رہیں اور سوونیئر میں میرے لئے تین چار صفحات کی جگہ ضرور رکھیں۔

۲۱ جنوری ۱۹۸۰ء　　سید محمد ازہر شاہ قیصر

گرامی نامہ مورخہ ۲ ۲/۸ کے جواب میں عرض ہے کہ میں مضمون بھیج چکا ہوں امید ہے کہ مل گیا ہوگا۔ یہ عادت نہیں کہ اپنے بزرگوں کے کام میں تقاضے کی نوبت آئے۔ موجودہ مصروفیت اس طرح ہے کہ صبح ۸ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک پابندی سے دفتر میں کام کرنا ہوتا ہے میری صحت بہت کمزور ہے بس حق تعالیٰ کا کرم ہے کہ کام کر رہا ہوں۔ مرسلہ مضمون میں جہاں ترمیم کرنے کی ضرورت ہو ضرور کیجئے میں نے بڑی عجلت میں پورا کیا ہے۔ حضرت مہتمم صاحب ۲۵ دن پاکستان میں گذار کر آئے ہیں فوراً بنگلہ دیش کے لئے تیار ہیں ان سفروں میں بیشتر ان کی ڈاک ضائع جاتی ہے آپ مجھے لکھکر اطلاع فرما دیں کہ کس تاریخ کے لئے آپ نے انھیں دعوت دی ہے۔ بنگلہ دیش سے ان کی واپسی پر اُن سے گفتگو کرکے اطلاع دونگا۔ مولانا غازی صاحب بمبئی میں ہیں۔ میرا لڑکا مولوی نسیم اختر شاہ اپنے پندرہ روزہ اخبار اشاعت حق کا اجلاس صدسالہ نمبر نکال رہا ہے۔ اس کے لئے چند حروف کا پیغام تحریر فرما کر مرحمت فرما دیں۔ ۱۷ ربیع الاول

سید محمد ازہر شاہ قیصر

حضرت مہتمم صاحب بنگلہ دیش سے واپس تشریف لے آئے۔ ۶ اپریل کے سیمنار کے لئے ان سے بات کی۔ موصوف نے فرمایا کہ آج سے دارالعلوم کی مجلس شوریٰ ہے اس سے فراغت کے بعد ہی خود ہی موصوف کو خط لکھواتا ہوں امید ہے کہ جلد ہی ان کا گرامی نامہ آپ کو ملے گا۔

سید محمد ازہر شاہ قیصر ۲۵ فروری ۱۹۸۰ء

حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کو میں نے مقامی طور پر ایک تحریر بھی لکھی تھی کہ مولانا امداد صابری صاحب سیمنار کے سلسلہ میں پوسٹر وغیرہ میں آپ کے نام کی اشاعت چاہتے ہیں موصوف نے پوسٹر میں نام کی اشاعت کی اجازت دیدی ہے امید ہے کہ آپ کے مزاج بخیر ہوں گے۔ ۲۶ فروری ۱۹۸۰ء

سید محمد ازہر شاہ قیصر

آپ کا گرامی نامہ مولانا عبدالقادر آزاد کے نام میری معرفت پہنچا۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ مولانا عبدالقادر آزاد دیوبند سے روانہ ہو چکے ہیں۔ اگر وہ یہاں موجود ہوتے تو میں آپ کا خط انہیں پہنچا دیتا۔ امید ہے کہ آپ کے مزاج بخیر ہوں گے۔ میں چھ سات دن سے بخار میں مبتلا ہوں۔ حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی طبیعت بھی جلسے کے بعد کافی ناساز ہے

۲ اپریل ۱۹۸۰ء سید محمد ازہر شاہ قیصر

مولانا ازہر شاہ کی کوشش یہ رہتی تھی کہ میری وجہ سے میرے والد ماجد حضرت مولانا انور شاہ کی عزت و آبرو پر کوئی آنچ نہ آئے وہ حتی الامکان ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے تھے اور ان کے علمی فیوض کی تشہیر میں لگے رہتے تھے۔ راقم الحروف امداد صابری کی تصنیف و تالیف کی ۵۵ سالہ زندگی ہے۔

میں نے زیادہ تر علماء کرام اور اہل فنون پر کتابیں لکھی ہیں مجھ کو بہت سے علمی خاندانوں کے لوگوں سے واسطہ پڑا جنمیں بہت بڑی کثرت ایسے لوگوں کی پائی جو اپنے بزرگوں سے ناواقف و ناآشنا تھے اور ان کو اپنے بزرگوں والدین سے کوئی لگاؤ دلچسپی نہیں دیکھی۔ معلومات حاصل کی تو کورا جواب آیا۔ البتہ دو خاندانوں میں یہ بات نہیں پائی ان دونوں کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے بزرگوں کے حالات زندگی سے

خوب واقف نظر آئے بلکہ تقریباً ہم وقت ان کو اپنے
بزرگوں کے حالات زندگی و کارنامے حاصل کرنے کی
کھوج میں پایا۔ ایک خاندان حضرت مولانا رحمت اللہ
کیرانوی کا۔ حضرت مولانا محمد سعید، حضرت مولانا محمد سلیمؒ جناب
مولانا محمد شمیم اور جناب محمد حشیم مہتممین مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کی
ہم وقت یہ سعی رہتی ہے کہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی
کے حالات زندگی کارنامے اور تصانیف کہیں نہ کہیں سے
مل جائیں۔ میری تصنیف "آثار رحمت" کی ۵۰ فیصدی معلومات حضرت
مولانا محمد سلیم اور جناب محمد شمیم نے فراہم کیں اور اپنے پیسے
سے اس کتاب کو چھپوایا۔ اسی طرح "فیضان رحمت" کی حیثیت
ہے۔ اب "باران رحمت" جس میں مدرسہ صولتیہ کے اساتذہ کے
حالات ہیں اور "انوار رحمت" جس میں تلامذہ مدرسہ صولتیہ
کے حالات درج ہوں گے ان کی بھی یہی صورت ہے۔ ان
کتابوں میں اسی فیصدی جناب مولانا محمد شمیم اور مولانا محمد حشیم
کی کوششوں کا دخل ہے۔

دوسرا خاندان حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کا ہے اس
میں جناب مولانا ازہر شاہ قیصر نے پوری زندگی اپنے والد ماجد
حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے حالات زندگی کے حصول کے
لئے وقف کر دی تھی انھوں نے اپنے والد ماجد کی سوانح
عمری "حیات انور" کے نام سے تالیف فرمائی اور رسالہ
دارالعلوم دیوبند اور جریدہ "طیب" دیوبند کا کوئی شمارہ ایسا
نہیں ہوتا تھا جس میں حضرت مولانا انور شاہ کاشمیری رح
کے حالات وواقعات اور علمی کارنامے کسی نہ کسی پہلو اور
موضوع پر درج نہ کرتے ہوں۔ یقیناً انھوں نے
حقوق پدری ادا کرنے کی کوشش کی اور بہت حد تک
کامیاب ہوئے۔

جناب مولانا ازہر شاہ ہر فن مولا تھے عالم ہونے
کے ساتھ ادیب، شاعر اور صحافی بھی تھے صحافت میں
انھوں نے حق گوئی اور اعلائے کلمۃ الحق بلند کرنے کا
فرض پوری طرح ادا کیا۔ ان کا قلم بلا جھجک چلا اور
بے انصافی کے خلاف لکھنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہا۔

انسان پیدا ہوتا ہے مرنے کے لئے لیکن وہ مرنے
والا اپنے پیچھے اپنے مداحوں کی زیادہ تعداد چھوڑ جائے
اور اس کی زندگی دین کی خدمت اور خدمت خلق میں
گذری ہو۔ اور ان اوصاف سے اس کو یاد کیا جائے، وہ
حضور خداوندی میں مقبول ہوتا ہے بخشش کی راہیں کھلتی
جاتی ہیں اور جنت پکار پکار کر اپنے اندر داخل کر لیتی
ہے۔ مولانا ازہر شاہ قیصر ان اوصاف سے متصف تھے
اور مجھے کامل و واثق یقین ہے کہ اللہ تعالٰے ان کو
انہی نوازشوں سے نوازیگا جو مقبول اور اپنے چہیتے
بندوں کو نوازتا ہے۔

تصانیف کی اشاعت

والد مرحوم کی جو تصانیف ہیں ان
میں سے چند بالکل نایاب ہیں اور
کچھ کا ایڈیشن ختم ہو رہا ہے ہماری
کوشش ہے کہ نایاب اور ختم ہونے
والی کتابوں کی دوبارہ اشاعت
ہو جائے۔

دعا کیجئے کہ خداوند قدوس ہمیں
اپنے اس ارادے میں کامیابی
عطا فرمائے اور ہم اس علمی دینی
ادبی اور تاریخی ذخیرہ کو منظر عام
پر لانے میں کامیاب ہو جائیں

(مدیر)

آہ — وہ نام جو ایک پل نہ بھلایا جائے

مولانا شاہین جمالی صاحب مدیر پندرہ روزہ دیوبند ٹائمز دیوبند

کاغذ کے صفحے پر ایک ٹیڑھی میڑھی سی لکیر کھینچیے تو اس سے ایک ایسا جانا پہچانا سا نام ابھرے گا جو ابھی ۲۷ نومبر ۱۹۸۵ء کے پہلے تک اپنی فانی ذات کے دائرہ میں محدود تھا لیکن اپنی باقی شخصیت کی وسعت میں آج بھی زندۂ جاوید ہے — وہ ہر قلم کی نوک سے اس قدر مانوس اور وابستہ تھا کہ غیر شعوری طور پر کوئی شخص کاغذ پر کچھ لکھنا چاہے تو اسی کا دستخط نمایاں ہو جاتا ہے یعنی سید ازہر شاہ قیصر

مولانا سید ازہر شاہ قیصر اپنے نام سے اتنے بڑے بادشاہ لگتے تھے جس کی قلمرو میں فارس اور روم ہی نہیں عرب بھی شامل ہو (ازہر عربی لفظ ہے شاہ فارسی اور قیصر شاہان روم کا لقب) لیکن اپنی شخصیت کے اعتبار سے وہ سراسر فقیر اور بے نفس انسان واقع ہوئے تھے۔

حضرت شاہ صاحب سے بیس برسوں تک میرا ادبی صحافتی رشتہ قائم رہا۔ انھیں بہت قریب سے میں نے دیکھا بہت کچھ سیکھا بہت سی جزئیات نگاہ میں آئیں بہت سے واقعات و حادثات دیکھے۔ کتنی صبح و شام کے سرد و گرم حالات کا مشاہدہ کیا بہت سے نشیب و فراز سامنے آئے مگر آفریں ہے اس مرد درویش پر جس کی زندگی کا ہر لمحہ پہاڑ کی طرح مضبوط اور برسات کی ٹھنڈی چاندنی کی طرح بے داغ رہا۔ رائے میں صلابت — عقیدے میں پختگی، کردار میں عظمت، گفتار میں متانت افکار میں رفعت، کام میں ہمت اور احباب و متعلقین کے لئے اخلاص و مودت ان کی شخصیت میں پیوست بلکہ اس طرح رچ بس گئی تھی کہ لب پر ان کا نام آتے ہی یہ سارے اوصاف کمال ذہن کے پردے پر متحرک ہو جاتے ہیں۔

قضیۂ دار العلوم میں بھی شاہ صاحب اپنی رائے اور عقیدے پر آخیر وقت تک قائم رہے۔ اور درمیان میں مولانا محمد عثمان صاحب کی خواہش پر دار العلوم سوسائٹی میں ان کی چند گھنٹوں کی واپسی ان کی قلابازی نہیں، بلکہ "تقیہ" تھا۔ تاہم ان لمحات میں شاہ صاحب پر جو کچھ گذرا وہ گہرے زخم کی طرح اندر ہی اندر شاہ صاحب کو چاٹتا رہا اور بالآخر اسی حادثے نے ان کی متاعِ حیات بھی ان سے چھین لی۔ لیکن واقعات گواہ ہیں کہ ان کی متاعِ لوح و قلم کو وقت کی کوئی طاقت حیاتِ مستعار کے آخری سانس تک ان سے نہیں چھین سکی۔

بیماری کے طویل ایام حضرت شاہ صاحب کے جسم کو تو متاثر کر سکے لیکن ان کے ذہن و فکر نے بیماری کے عذر کو اپنی کائنات میں داخل نہیں ہونے دیا انھوں نے پورے حوصلہ اور مکمل صبر و استقلال کے ساتھ اپنی علالت کا

مقابلہ کیا اور اس وقت جبکہ ان کا جسم غیر متحرک حالت میں بستر سے چمٹ گیا تھا قلم حسب معمول کاغذ پر چلتا رہا اور ان کا فکر اپنی زندگی کی رگ رگ کا ایک ایک قطرۂ خون نچوڑ کر ادب وصحافت کی تاریخ کو سرخ عنوان عطا کرتا رہا چنانچہ "دیوبند ٹائمز" کے "عثمان نمبر" میں شریک حضرت شاہ صاحب کا آخری مضمون اس کی شہادت دیتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب دیوبند کے ادب وصحافت کی آبرو اور اس کی عظمت و ناموس کے محافظ اور ادب وصحافت کی پچھلی پاکیزہ شخصیات کی باقیات اصالحات میں سے تھے جن کے وجود مسعود سے ادب وصحافت کی مشرقی تہذیب وروایت کا تسلسل برقرار تھا مگر افسوس کہ

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

حضرت شاہ صاحب کو اپنے بزرگوں سے اس قدر عقیدت تھی کہ حالات کے انقلاب اور سیاست کے زیروزبر میں بھی وہ اس پر قائم رہتے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے صرف سیاسی نہیں خود حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہ کے تعلق سے ذاتی اختلاف کے باوجود اس قدر عقیدت تھی کہ ان کے ساتھ کسی طرح کی بے احترامی کو گوارا نہیں کرتے تھے۔ اور ایسے موقع پر جب کوئی شخص حضرت سے اختلاف ظاہر کرتا، پنجاب کے ایک نوجوان کا واقعہ سنایا کرتے تھے جس کو حضرت کی بے احترامی نے بالآخر جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا تھا۔ حضرت شاہ صاحب حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب سے فدائیت کا تعلق رکھتے تھے اور انہیں اپنے والد بزرگوار کی جگہ "بھائی جی" کہا کرتے تھے۔ حضرت حکیم الاسلام کی وفات کے بعد شاہ صاحب ہی نے سب سے پہلے "اشاعت حق" کا "طیب نمبر" شائع کیا تھا اور اس کے "حرف آغاز" میں حکیم الاسلام کی شخصیت کے قتل میں جن ہاتھوں کی نشاندہی کی تھی اس نے قارئین کو چونکا دیا تھا۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں حضرت شاہ صاحب ادب وصحافت کی خدمت کے علاوہ حضرت حکیم الاسلام کے تعلق کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ماہنامہ "طیب" جاری کیا جو آج بھی جاری ہے اور یہ محض لطیفہ غیبی ہے کہ اب "طیب" ہی کے صفحات میں حضرت شاہ صاحب کو حیات طیبہ اور فدائے طیب کو آغوش طیب نصیب ہو رہی ہے شاید جگر نے اسی موقع کے لئے کہا تھا

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

حضرت شاہ صاحب کی تحریر اتنی شستہ اور برجستہ ہوتی تھی کہ جی چاہتا تھا کہ پڑھتے ہی چلے جایئے۔ وہ جب اپنے قلم سے کسی کو چھیڑتے گدگداتے یا کسی پر طنز وتعریض کرتے تو وہ رگ احساس میں نشتر بن کر اتر جاتا تھا مگر قلم کی نوک پر انکی گرفت اتنی مضبوط ہوتی کہ وہ حد ادب سے آگے نہیں بڑھنے دیتے تھے اور قاری کسی بھی سطر پر "سوقیت یا پھوہڑپن" کا الزام لگانے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا ـــ وہ دیوبند کی بعض شخصیات اور ان کے افکار واعمال پر تنقید کرتے تو "لب سڑک کی فلک بوس عمارت سے سنگباری" کا ذکر کرکے اس طرح بامعنی خاموشی اختیار کرلیتے کہ ہی خاموشی خود بولنے لگتی تھی۔ ایک مرتبہ غازی صاحب کے بارے میں انھوں نے لکھا کہ:

"بمبئی ان کا مکان اور دیوبند ان کے مکان کا صحن ہے۔"

اور اسی مختصر سے جملے میں انھوں نے غازی صاحب کی حیات وکائنات کو سمیٹ دیا تھا۔

انکی وفات سے پانچ سال پہلے اپنے فرزند ارجمند

"نسیم اختر شاہ قیصر" کے مرتب کردہ اپنے مجموعۂ مضامین پر ایک مختصر سا مقدمہ لکھا جس کا نصف حصہ صرف یہ تھا۔

"اچھا تھا کہ ان مضامین کی ایک ترتیب ہوتی کہ دینی مضامین ایک طرف، تاریخی ایک طرف اور سیاسی ایک طرف، لیکن ان کی بے ترتیبی میری زندگی کی بے ترتیبی کی ایک مثال ہے —
۶۰ سال کی عمر تو بے ترتیبی اور روا روی میں گزری اب آخری وقت میں کیا ترتیب اور کیا تبویب۔ ے

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
اب آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

مگر ان ہی دو ڈھائی سطروں میں انھوں نے واقعی اپنی زندگی کی مکمل تاریخ مرتب کردی تھی۔ اور اپنے متضاد اوصاف کمال کا بھرپور تجزیہ کردیا تھا۔ میں بجا طور پر محسوس کرتا ہوں کہ شاہ صاحب کی شخصیت کے اتنے ابواب اور ذیلی عنوانات ہیں جن کی ترتیب وتبویب کسی مختصر سے مضمون میں ممکن ہی نہیں۔

ہندوستان میں گذشتہ چودہ سال میں فرقہ پرستی کی راہ سے اقلیتی فرقوں خصوصًا مسلمانوں پر مظالم کے جو پہاڑ توڑے گئے ہیں ان کی تفصیل ان چند سطروں میں کیا بیان کی جاسکتی ہے اور کون سے الفاظ ہیں جن کے ذریعہ ان فسادات و مظالم کی خوفناکی کی صحیح تصویر کھینچی جاسکتی ہے۔

کہنا چاہیے کہ آج تک چنگیز و ہلاکو کے مظالم ایک تاریخ اور ایک روایت رکھتے تھے مگر مستقبل کے مؤرخ کو ہندوستان کے قدم قدم پر لاکھوں کروڑوں چنگیز اور ہلاکو خاں شمشیر بکف اور تیغ بدست ملیں گے جنھوں نے مسلمانوں کی بستیوں کی بستیاں اجاڑ کر رکھ دیں ان کے لاکھوں کے اموال کو تباہ و برباد کردیا ان کی حیثیتیں مٹا ڈالیں اور ان کی زندگی کو بگاڑ دیا۔

اس نقصان جان و مال اور اتلاف عزت و آبرو کا تو رونا تھا اس سے بھی بڑا حادثہ یہ ہے کہ اکثریت کو مسلمانوں کے علوم و فنون اور تہذیب ان کے دینی اور قومی اداروں، ان کے کتب خانوں اور ان کی مذہبی زندگی کے تمام آثار و نشانات سے اس درجہ بغض ہے کہ وہ کسی قیمت پر بھی ان چیزوں کو زندہ رہنے اور سانس لینے کا موقع نہیں دینا چاہتی۔

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصرؒ

۲۷ر نومبر ۱۹۸۵ء کو ادب وصحافت اور اکابر دیوبند کی یادگار شخصیت، ابن الانور، رئیس العلم سید محمد ازہر شاہ قیصر اس جہان فانی سے رخصت ہو کر مالک حقیقی سے جاملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ، کل ہماری باری ہے

(آپ کی وفات کی خبر روزنامہ قومی آواز میں پہلے ہی دی جاچکی ہے)

اس المناک خبر نے ادبی اور قلمی دنیا کو ویران کر دیا۔ ملت اسلامیہ کے ایک جلیل القدر مجاہد، صاحب فراست انسان، یادگار انور شاہ، ممتاز ادیب ومفکر، صاحب طرز انشاء پرداز اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ یہ روح فرسا خبر سنکر گزشتہ برسوں کی تاریخ کے بہت سے اوراق نظروں کے سامنے گھوم گئے، ذہن ماؤف ہو گیا اور غور وفکر کی قوتیں مضمحل نظر آنے لگیں۔ ان کی وفات کسی ایک شخص یا کسی ایک ادیب یا مجاہد کی ہی موت نہیں ہے بلکہ یہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے انقلابی فکر، مولانا قاری محمد طیبؒ کی دانشوری کی تمثیل، مولانا سید حسین احمد مدنی رح کے عزم راسخ کی تصویر اور اکابرین دیوبند کے فکر اور آسمان دیوبند کے ماہ کامل کے کمالات کی کتاب اور باب کا اختتام ہے۔ ملت کا یہ بیباک مجاہد جرائت ویقین کی بھرپور توتوں کے ساتھ قلم کی شیرینی، سلاست، روانی، چابکدستی پختگی، فن اور خوبصورتی کی دلکش تحریریں سب کچھ لیکر رخصت ہو گیا۔

آپ یگانۂ عصر، محدث کبیر، فاضل اجل، مجدد وقت مولانا انور شاہ کشمیری رح کے بڑے لڑکے تھے۔ وہی مولانا سید انور شاہ کشمیری جو خودداری اور اوصاف حسنہ کا مکمل نمونہ تھے اپنے علمی کمالات اور امتیازات کے اعتبار سے آپ نے جو مقام حاصل کیا اور بالخصوص حدیث اور رجال حدیث پر جو گہری نظر ڈالی اس کی نظیر مشکل ہی سے ملے گی۔ بقول اقبال۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ابوداؤد کی شرح انوار المحمود آپ ہی کے افادات کا مجموعہ ہے۔

مشہور صحافی

۱۹۳۳ء میں جب مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ کی تعزیت کے لئے مولانا ظفر علی خاں دیوبند تشریف لائے تھے تو سید محمد ازہر شاہ قیصر نے آپ کے اعزاز میں ایک سپاسنامہ لکھا اور جامع مسجد دیوبند کے جلسے میں مولانا کو پیش کیا۔ مولانا ظفر علی خاں نے اس پر اظہار مسرت فرمایا اور اس سپاسنامہ کو روزنامہ "زمیندار" کے پہلے صفحے پر

شائع کیا۔

۱۹۳۶ء میں انھوں نے سہارنپور سے "صداقت" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا جو کئی برس تک نہایت کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔ اس وقت ان کی عمر سترہ اٹھارہ برس سے زیادہ نہ تھی ۱۹۴۱ء میں دیوبند سے ہفتہ وار اخبار "انور" جاری کیا یہ بھی کئی سال تک کامیابی سے جاری رہا ۱۹۴۳ء میں آپ لاہور چلے گئے، جہاں ۱۹۴۵ء تک آپ کا قیام رہا۔ لاہور میں مولانا ظفر علیخاں عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، مرتضیٰ احمد خاں میکش کے چراغ حسن حسرت جیسے مشہور و معروف ادیبوں اور صحیفہ نگاروں کا ساتھ رہا۔ اس زمانے میں مشہور زمانہ اخبار "زمیندار" روزنامہ "احسان" اور "انقلاب" وغیرہ میں ان کے مضامین نمایاں طور پر شائع ہوتے رہے۔ ایک اندازے کے مطابق انھوں نے اپنی مدت العمر میں تقریباً ساڑھے چار ہزار مضامین مختلف ادبی، دینی، سیاسی اور سماجی موضوعات پر لکھے تقریباً ۲۳ برس دارالعلوم دیوبند کے ماہنامے "دارالعلوم" کے ایڈیٹر رہے ان کا زمانۂ ادارت اس ماہنامہ کی زندگی کا زریں دور سمجھا جاتا ہے وہ ایک بالغ نظر صحافی اور نہایت ذکی اور ذہین قلمکار رہے ہیں دیوبند سے شائع ہونے والے اخبار "استقلال" ماہنامہ "ہادی" ماہنامہ "خالد" کے بھی ایڈیٹر رہے اس طرح انھوں نے سات یا آٹھ مختلف رسائل اور اخبارات کی ادارت سنبھالی۔ ان کے مضامین ہندوستان اور پاکستان کے تمام معیاری جرائد میں شائع ہوتے رہے۔

تصانیف

انھوں نے "یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ" کے عنوان سے جو کتاب لکھی اس میں علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن کے علاوہ جگر مرادآبادی کی شاعری، احسان دانش، مولانا ظفر علی خاں، مولانا غلام رسول مہر، مولانا مظہر علی اظہر وغیرہ سے متعلق مضامین شامل ہیں جن میں نہ صرف ان سے اپنی رفاقت کا ذکر ہے بلکہ دماغی اور باطنی صلاحیتوں کے بہت سے انمٹ نقوش کا بھی تفصیلی بیان ہے۔ ایڈیٹر دیوبند ٹائمز مولانا شاہین جمالی نے اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھا کہ "شاہ صاحب کے نکتہ رس اور فن شناس قلم نے بیتے لمحوں اور ماضی کی بھولی بسری مگر ناقابل فراموش شخصیتوں کا عکس فن کے شیشے میں اس طرح اتار لیا کہ بقول جگر مرحوم ؎

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں یہ پھر رہے ہیں، یہ آرہے ہیں وہ جا رہے ہیں

ان کی ایک اور بیش قیمت تصنیف "سفینہ وطن کے ناخدا" کے نام سے ہے یہ ایک تاریخی یادداشت اور مجاہدین جنگ آزادی کی ناقابل فراموش داستان ہے۔ یہ ایسے جلیل القدر بزرگوں کا ذکر خیر ہے جنھوں نے اپنی زندگی کے جوہری کردار سے ملک کی جدوجہد آزادی کو ایک نئی قوت اور نئی تحریک بخشی۔ اگرچہ آج وہ سب ہستیاں موت کی آغوش میں آسودہ خواب ہیں لیکن ارض وطن کی سیاسی کائنات میں جتنی صبحیں نمودار ہوں گی وہ ان مجاہدین آزادی کے ذکر کے بغیر نامکمل سمجھی جائیں گی۔ یہ سلسلہ وار تاریخ ہفت روزہ "قومی آواز" نئی دلی کی اکثر اشاعتوں میں منظر عام پر آتی رہی ہے افسوس کہ مارچ سنہ ۱۹۸۵ء کے بعد سے شاہ صاحب نے یہ سلسلہ درمیان میں منقطع کر دیا۔ سنا ہے کہ دو اور قسطیں آپ کی الماری میں بند ہیں۔

ایک اور کتاب "متفرقات" کے عنوان سے شائع ہوئی اس میں انھوں نے تاریخی، سیاسی اور سماجی مضامین کو یکجا کر دیا ہے۔ یہ ادب و دانش کے شائقین کے لئے ایک حسین تحفہ اور علم و تحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے

ایک حسین پیش کش ہے۔

ان کا ایک اور مستند وقیع اور علمی کارنامہ "حیات انور" کی تالیف ہے۔ اس کتاب میں امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی مکمل اور جامع سوانح نیز ان کی علمی دینی، سیاسی اور مذہبی خدمات کا تفصیلی ذکر ہے۔

دوستانہ مراسم

شاہ صاحب نے سیماب اکبرآبادی، روش صدیقی وغیرہ سے اپنے خصوصی مراسم کا اکثر و بیشتر ذکر راقم الحروف سے کیا سیماب اکبرآبادی کے منظوم ترجمۂ قرآن پر انھوں نے معرکۃ الآراء مقدمہ تحریر کیا۔ شاہ صاحب نے اپنی گفتگو میں اکثر و بیشتر مولانا ظفر علی خاں، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، علامہ شبیر احمد عثمانی مولانا مناظر احسن گیلانی امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا مظہر علی اظہر شیخ عبد اللہ، غلام محمد صادق، مولانا مسعودی وغیرہ بہت سی عظیم المرتبت شخصیتوں سے اپنے گہرے تعلقات کا ذکر کیا

ذہانت اور قوت یادداشت

شاہ صاحب کی تحریر اور تقریر سے ان کی ذہانت خودداری اور قوت یادداشت کا علم ہوتا تھا یہ صفات ان کو ورثے میں ملی تھیں ان کے والد بزرگوار نے اپنی غیر معمولی جامعیت اور بصیرت سے مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مولانا چراغ محمد صاحب لاہوری، مولانا قاری محمد طیب صاحب، مولانا منظور نعمانی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی جیسے جید علماء پیدا کئے۔ ظاہر ہے کہ اس چراغ سے روشن ہونے والا چراغ بھی کیسے ماند روشنی دے سکتا تھا چنانچہ

از ہر شاہ قیصر نے دل کی گہرائیوں، خلوص، سادگی، قلندری اور اخلاقی بلندیوں سے جو شہ پارے بکھیرے ہیں وہ صحت مند ادب کا ایک لازوال حصہ ہیں ان کی تحریریں ایک ایسے مخلص انسان کی یاد دلاتی ہیں گی جس نے زندگی کا بہترین حصہ ادب و صحافت کے لئے وقف کیا اور صحافت بھی انتہائی تعمیری اور قوم کو جگانے والی۔

ایک جگہ آپ لکھتے ہیں

"۱۹۴۷ء کے ہنگامۂ قتل و غارت گری میں مولانا حفظ الرحمٰن اور مفتی عتیق الرحمٰن قرولباغ سے لٹ لٹا کر جامع مسجد کے پاس جامع ہوٹل کے قریب ادارۂ شرقیہ کے ایک دو کمروں میں بڑی بے کسی کا وقت گزار رہے تھے مسلم لیگ کے روزنامہ اخبار "ڈان" کا دفتر اور پریس پھونک دی گئی تھی۔ مشہور مجاہد آزادی ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی بیٹی زہرہ اور ان کے داماد شوکت اللہ شاہ کو دریا گنج میں اپنی کوٹھی چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہو جانا پڑا تھا۔ زہرہ اور شوکت اللہ کے اس حادثے سے گاندھی جی کو اتنا صدمہ ہوا تھا کہ انھوں نے اسی شام ایک تقریر میں اس واقعہ پر اپنی بے چینی کا شدید اظہار کیا تھا۔

خواجہ حسن نظامی پاکستان نہیں گئے مگر چند ماہ کے لئے انھیں بھی حیدرآباد میں پناہ گزیں ہونا پڑا تھا۔ مشہور اہل قلم مولانا راشد الخیری کے دونوں لڑکے ادیب شاہد صدیقی، انصار فاخری، سید یوسف بخاری، سید وصی اشرف دہلوی، نہال سیوہاروی، ملا واحدی حکیم عبد الحمید صاحب کے چھوٹے بھائی حکیم محمد سعید ظفر قریشی یہ سب لوگ دہلی چھوڑ چکے تھے۔ دلی کی اس پر آشوب زندگی میں مولانا احمد سعید، مولانا حفظ الرحمٰن، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا امداد صابری، میر مشتاق احمد، سید عزیز حسن بقائی، سید محمد جعفری، مولانا اخلاق حسین قاسمی، مولانا عبد الماجد دہلوی یہ چند لوگ تھے جنھوں نے دن رات

ایک کرکے اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈال کر مسلمانوں کو تھامنے اور سنبھالنے کی کوشش کی۔"

مختصر یہ کہ یہ ایک شیر دل انسان کی ناقابلِ فراموش داستان ہے۔ شاہ صاحب ۲۹ مارچ ۱۹۸۵ء کو دل اور سانس کی شدید تکلیف میں مبتلا ہوئے اور بالآخر ۲۷ نومبر ۱۹۸۵ء کو تقریباً آٹھ ماہ کی شدید تکلیف اٹھانے کے بعد مالکِ حقیقی سے جا ملے اور دیوبند میں اسی جگہ مدفون ہوئے جہاں آپ کے والد ماجد مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری ابدی نیند سو رہے ہیں ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

یہ ایک ایسے رئیس التحریر بلند پایہ صحافی کی داستان ہے جس نے سینہ سپر رہنے کے ساتھ ساتھ اپنے دوستوں سے پیار کرنا سیکھا اور ماں باپ کی شفقت اور ان سے سیکھے ہوئے آداب ملک و قوم کی خدمت کے لئے برتے انھوں نے ایک ایسی قوم کی رہنمائی کے لئے خود کو وقف کیا جو دھڑکتے دلوں کے لئے ایک دہکتا ہوا انگارہ بن چکی ہے۔

"اشاعت حق" دیوبند نے آپ کی وفات پر ایک خصوصی ضمیمہ شائع کیا اس میں لکھا کہ:۔

"زندگی اور موت کے درمیان فاصلہ کبھی تو کچھ نہیں ہوتا سانس رکی نبضیں ساتھ چھوڑتی چلی گئیں دل کی حرکت آہستہ آہستہ ختم ہوتی گئی اور آناً فاناً ۶۵ برس کی زندگی کا اس طرح خاتمہ ہو گیا کہ ہم کچھ بھی نہ کر سکے نو مہینے جو شخص اس طرح ہمارے درمیان موت سے لڑ رہا ہو کہ کوئی بھی لمحہ رات اور دن میں ایسا نہیں آیا جس میں وہ تنہا رہا ہو ۲۸ نومبر کی صبح ۹ بجے قبرستانِ انوری میں تنہا اور اکیلا چھوڑ کر سپردِ خاک کر آئے۔ ہزاروں من مٹی کے نیچے، ویران اور سنسان قبرستان میں، جہاں انسان وحشتوں اور سناٹوں کے درمیان آخرت کی ہولناکیاں برپا ہونے تک اپنا وقت گزاریگا۔"

اس میں لکھا ہے کہ:۔

"یہی زندگی ہے اور یہی انسانی فطرت، ایک آتا ہے، ایک جاتا ہے اور آنے جانے کے اس عمل کے درمیان جو کچھ بھی کرنا ہوتا ہے وہ یہ کمزور اور ناتوان انسان ہی انجام دیتا ہے۔"

بلاشبہ انسانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ روزِ ازل سے قائم ہے اور قیامت تک چلتا رہیگا مگر اس دنیا میں وہی لوگ نقشِ دوام چھوڑ جاتے ہیں جو اپنی شخصیت، اپنے بلند اخلاق و کردار اپنے علم و فضل، شرافت و وضعداری، صبر و تحمل اور ضبط و استقلال کے سبب نوعِ انسانی کی خدمت کو فریضۂ عظیم تصور کرتے ہیں۔

شاہ صاحب کو مجھ ناچیز سے بڑی محبت تھی جب کبھی میرا دیوبند جانا ہوتا تو اکثر و بیشتر بلا تکلف غریب خانہ پر تشریف لے آتے اور پھر ذہن کے دریچوں اور نہاں خانوں سے ایسے گوہرِ آبدار بکھیرتے کہ حیرانی ہوتی تھی کہ شاہ صاحب کو یہ سب تاریخ کس طرح یاد ہے۔ اور یہ سب کچھ ان کے ذہن میں کس طرح محفوظ ہے۔

مولانا عزیر گل صاحب کے ساتھ تعلقات اور ان سے ملاقاتوں کا اور حضرت شیخ الہند کی مجالس کا اکثر ذکر فرماتے۔ ؏

"خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را"

آج کل وہ ماہنامہ طیب کے مدیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔

علامہ سید ازہر شاہ قیصر

بقلم: اختر الاسلام

خدا کی قدرت بہت بڑی ہے۔ نام خدا کا ہی باقی رہ جاتا ہے خدا کی طاقت و عظمت کے سامنے بڑے بڑے سپہ سالار، بڑے بڑے حکمراں، ادیب، شاعر، مصوّر، مقرر، سائنس داں اور دیگر ماہرین جاں بحق ہو جاتے ہیں کسی کی زندگی کے لیے کتنی ہی تمنا اور دعا کی جائے کہ یہ ابھی باقی اور زندہ رہے مگر موت کا فرشتہ وقتِ معینہ پر آتا ہے اور روح قفس عنصری سے آزاد ہو جاتی ہے کیونکہ یہی زندگی کا انجام ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ جس کے جنازہ پر چالیس آدمی بھی اس کے دیندار اور بہتر مسلمان ہونے کی شہادت دیں تو حق تعالیٰ کی رحمت ان کی لاج رکھے گی اور مرنے والے پر رحمت و مغفرت کے دروازے کھول دئے جائیں گے۔

اس ضمن میں ایک عربی کہاوت کا ذکر بھی یہاں برمحل ہوگا جس میں کہا گیا ہے کہ جب آدمی کو اس کے پڑوسی نہ جانیں اس کو زندہ کہنا فضول ہے۔

درج بالا حقائق کی واضح مثال مولانا سید ازہر شاہ قیصر کیے جا سکتے ہیں کہ جن کی وفات حسرت آیات پر ملک کے طول و عرض میں سوگ چھا گیا جگہ جگہ ان کی مغفرت کے لئے تعزیتی جلسوں میں قرار دادیں پیش ہوئیں اور ان کی مغفرت کے لئے دعائیں کی گئیں۔

آپ بلند پایہ محدث اور ممتاز عالم دین علامہ سید انور شاہ کشمیری رح کے فرزند اکبر تھے۔ فقہ تصوف قرآن و حدیث کی تعلیمات سے متصف ہوتے ہوئے شاعرانہ مزاج و خواص کے امین و رازداں تھے آپ بالغ نظر مفکر، سلجھے ہوئے ناقد اعلیٰ درجہ انشا پرداز اور بلیغ شاعر تھے۔ ایک شاعر کے کلام کا احاطہ کرنے کے لئے دنیائے ادب میں جدتِ خیال شدتِ احساس، علوئے فکر، زود طبع، عالمانہ باریک بینی اور سنجیدہ گوئی کا شمار کیا جاتا ہے جو آپ میں بدرجۂ اتم اس حد تک تھیں کہ آپ کی نثر ہی نظم معلوم ہوتی تھی۔ اپنی زندگی میں قریب ۵ ہزار مضامین قلم بند کئے۔ وصال سے قریب آٹھ ماہ قبل صاحبِ فراش ہو گئے تھے مگر لیٹے لیٹے ہی مضامین قلم بند کرا دیتے تھے۔

انھیں جنت مل جانے کی خوشخبری دنیا میں ہی حاصل ہو گئی تھی۔ اوّل یہ کہ وہ جسمانی تکلیف سے دوچار رہے، اور دوم یہ کہ ان کی اولاد ان کے نقشِ قدم پر گامزن ہو گئی جس نے فاضل باپ کی چار مطبوعات "حیات انور" "یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ" "متفرقات" اور "سفینہ دل جس کے ناخدا" ان کے بقید حیات ہونے کے دوران زیور طبع سے آراستہ کرائیں۔ دو مطبوعات زیر طبع تھیں کہ آپ راہی ملک عدم ہو گئے۔ آپ کی طرز نگارش کی یہی ایک خوبی آپ کو منفرد کرتی ہے کہ ایک صحافی ہوتے ہوئے آپ صاحب طرز ادیب، انشاء پرداز رہے۔ اردو کے سرفروش مجاہدین میں ان کا نام عزت و افتخار سے لیا جاتا رہے گا۔

پس مرگ، اللہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے

جناب بخشی رام الفت (مدیر ہفت روزہ "خبردار" سہارنپور) نے لکھا ہے کہ زبردست سیاسی اختلافات کبھی باہمی دوستی کی راہ میں حائل نہ ہوئے۔ مولانا ازہر ایک زاہد خشک اور پابند صوم وصلوٰۃ اور میں (بخشی رام الفت) رند مشرب اور مذہب تک کے نام سے بیزار یعنی بُعد المشرقین کی موجودگی میں ان کا رشتۂ ارتباط مولانا موصوف کی قومی یک جہتی کے جذبہ کا غماز ہے۔ قومی یک جہتی کے پس پردہ خلوص ومحبت کی جلوہ گری ہوتی ہے جو مولانا کے خمیر میں رچی بسی تھی۔ وہ

"میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہونچے"

کے مبلغ تھے۔

پتہ نہیں کس طرح صاحب فراش ہونے کی حالت میں آپ نے "میرٹھ میلہ" کہیں دیکھ لیا تھا جس کے تبادلہ میں اپنا علمی اور مذہبی ماہنامہ طیب اور ہفت روزہ اشاعت حق بھجوائے۔ جب میں نے انھیں براہ راست اپنا اخبار بھجوایا اور شکریہ کا خط لکھا تو موصوف کے صاحبزادے سید نسیم اختر شاہ قیصر نے بہت خلوص ومحبت کا اظہار کیا جس سے میرے دل میں یہ خواہش جاگزین ہوئی کہ میں دیوبند جاکر بالمشافہ ملاقات کروں اور اس کا ایک موقع نسیم اختر صاحب کی شادی کا آیا مگر وائے ناکامی کہ میں باوجود کوشش کے ان سے بالمشافہ ملاقات نہ کر سکا۔

ان کی تین کتابیں۔ متفرقات، یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ اور سفینۂ وطن کے ناخدا، کے مطالعہ نے مجھ پر منکشف کیا کہ ان کی انشاء پردازی کی ابتداء ۱۹۴۳ء، ۴۴ میں رسالہ غنچہ لاہور سے ہوئی تھی جس کے ساتھ اور بعد میں انھوں نے عورتوں اور بچوں کے مختلف رسل ورسائل میں مضامین لکھ کر انشاء پردازی میں کمال حاصل کیا۔

"متفرقات" چھوٹی تقطیع کی ۱۱۲ صفحات کی کتاب ہے جس میں مولانا ازہر شاہ صاحب کے ۱۹ تاریخی ادبی اور سیاسی مضامین جمع ہیں۔ ہر مضمون اپنی جگہ اس لئے اہم ہے کہ وہ کسی کتاب کا آغاز سخن یا پیش لفظ ہے جس میں نپے تلے الفاظ میں مصنف نے اپنا مافی الضمیر آشکارا کیا ہے۔ اسی مجموعہ میں ان کی بے خوف حق گوئی کا پیامی ایک مضمون فیملی پلاننگ سے متعلق ہے۔ یہ اس وقت کی خطرناک یادگار ہے جب ایمرجنسی کے دوران فیملی پلاننگ کے نام پر عام لوگوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو رہا تھا۔ علماء سے فیملی پلاننگ کے لئے طرح طرح کے بیانات طلب کئے جارہے تھے اور جو عالم اس کی مخالفت کرتا اس کو معتوب کیا جاتا تھا۔ اس دور ابتلاء میں مولانا ازہر شاہ صاحب نے حکومت کو مشورہ دیا کہ فیملی پلاننگ نہ کرکے کثرت آبادی کو بیرون ممالک بھیج دیا جائے جو بروقت کارگر ہوا۔

"یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ" ڈیمائی سائز کی ۱۵۲ صفحات کی ایک تصنیف ہے جس میں قریب ۲۳ ادبی، علمی، تاریخی مضامین شامل اشاعت ہیں جن میں ادب وشاعری، صحافت سیاسیات، مذہبیات کے شہسواروں کے صحیح خطوط میں سوانحی خاکے رقم کئے گئے ہیں اور اسلوب نگارش کے لحاظ سے ذہانت وذکاوت کے آئینہ دار ہیں ان خاکوں کے ذریعے مذہبی رہنماؤں کا حب وطن اور جنگ آزادی میں ان کے تعاون کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

• سفینۂ وطن کے ناخدا، حالیہ تصنیف ہے جو چھوٹی تقطیع کے ۴۶ صفحات پر محیط ہے قیمت ۵ روپے ہے اور اس کو خانوادۂ انوری کے ایک فرد سید وجاہت شاہ انور نے وجاہت بکڈپو دیوبند سے شائع کیا ہے۔ یہ مجاہدین آزادی کی قلم برداشتہ تاریخ بیانی ہے قسط وار ہفت روزہ قومی آواز نئی دہلی کی زینت بنی تھی۔ اور اس میں بوریوں پر بیٹھنے والے ان علماء وفضلاء کا ذکر ہے جن کو مورخوں نے یک قلم نظرانداز کردیا تھا۔ اس تاریخ میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمانوں نے جنگ آزادی

میں زبردست کردار ادا کیا ہے ان میں خصوصی طور پر حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا محمد قاسم نانوتوی مولانا رشید احمد گنگوہی، حافظ محمد ضامن شہید، مولانا فتح محمد تھانوی، مولانا اشرف علی تھانوی، حاجی عابد حسین، میانجی منے شاہ، مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبید اللہ سندھی مولانا محمد باری، منصور انصاری، مولوی احمد اللہ پانی پتی مولوی محمد مبین (خطیب) ابو الکلام آزاد، مولانا محمد علی مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا محمد صادق کراچی۔ مفتی عبدالرحیم پوپلزئی حاجی صاحب ترنگ زئی، عزیز گل، حکیم نصرت حسین وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

اہل دانش و بینش کے لئے یہ کتاب ایک بیش قیمت خزانہ ہے جس سے مستقبل اور موجودہ زمانہ کے دانشور محقق اور متلاشیانِ علم و ادب فیض یاب ہوتے رہیں گے اگر اسے انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو غیر مناسب نہ ہوگا کیونکہ اس سے حیرت انگیز معلومات کا خزانہ سامنے آتا ہے جس سے تاریخ ہند پر نئی روشنی منعکس ہوتی ہے۔ اس کتاب کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

• ۱۹۳۱ء میں جب مہاتما گاندھی نے نمک سازی تحریک شروع کی تو سب سے پہلے شرعی حیثیت سے اس کی تائید مولانا سید انور شاہ کشمیری نے کی اور ایک بڑے مجمع میں ایک حدیث شریف بیان کی جس میں گھاس، پانی اور نمک کو مباح الاصل قرار دیا یعنی یہ بتایا کہ اسلامی حیثیت سے ان تینوں چیزوں پر ٹیکس نہیں لگایا جا سکتا۔ مہاتما گاندھی نے خان عبدالغفار خان اور اپنے بڑے بیٹے دیوداس گاندھی کو مولانا انور شاہ کے پاس ڈابھیل بھیجا جہاں سے چند میل دور باردولی کے مقام پر گاندھی جی نمک سازی کی تحریک چلا رہے تھے اور جسے ڈانڈی مارچ کا نام دیا جاتا ہے۔

مولانا انور شاہ کی ہدایت پر حدیث کے اصل الفاظ اور اس کا اردو ترجمہ ان کے شاگرد رشید مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اور مفتی عتیق الرحمن عثمانی نے کیا مولانا حفظ الرحمن بھی ڈانڈی مارچ میں شریک تھے۔

علامہ اقبال مولانا انور شاہ صاحب سے نیاز مندانہ خصوصیت رکھتے تھے کیونکہ اقبال انھیں اپنا روحانی پیشوا سمجھتے تھے جس کا اظہار علامہ اقبال کے مدراس یونیورسٹی میں دئے گئے خطبات میں ہے کہ علامہ اقبال مولانا انور شاہ صاحب کے سامنے ہمیشہ ادب و احترام سے بیٹھتے تھے۔ انھوں نے یہ بھی کوشش کی کہ مولانا انور شاہ کو لاہور بلالیں اور وہاں ایک عظیم الشان جامعہ قائم کریں جس کے شیخ الجامعہ مولانا انور شاہ ہوں

خواجہ عبدالصمد ککرو (رئیس بارہ مولہ کشمیر) کا بھی تعلق علامہ اقبال اور مولانا انور شاہ سے تھا۔ خواجہ صاحب علامہ اقبال کی تعلیمی تحریکوں، اسلامیہ کالج لاہور اور انجمن حمایت اسلام لاہور کی سرگرمیوں میں شریک رہے۔ خواجہ صاحب نے ہی مولانا انور شاہ کے پہلے سفر حج کا نہ صرف انتظام کیا تھا بلکہ ساتھ میں گئے بھی تھے ان کے بڑے لڑکے مقبول ککرو کو بھی جنگ آزادی سے دلی ہمدردی کی بناء پر بڑے نقصانات بھگتنے پڑے تھے۔

کاکوری کیس

پنڈت رام پرشاد بسمل، ٹھاکر درشن سنگھ، راجندر ناتھ لاہڑی، من متھ ناتھ گپت اور اشفاق اللہ خاں حسرت کاکوری کیس کے خاص اور خطرناک افراد ظلم و ستم کا شکار ہوئے تھے۔ اشفاق اللہ خاں حسرت کو ۲۰ ستمبر ۱۹۲۷ء کو پھانسی دی گئی تھی۔ وقت آخر اشفاق صاحب کے ہاتھ میں قرآن شریف اور زبان پر قرآنی آیات تھیں۔ جج نے انھیں بسمل صاحب کا لیفٹیننٹ قرار دے کر مقدمہ کا فیصلہ لکھتے ہوئے گلے میں جے مالا (پھانسی کی رسی) پہنا دی تھی ــــــ (باقی ص۴۷ پر)

صاحبِ کمال مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصرؒ

از مولانا سید منظور الحسن برکاتی مدرس دار العلوم خلیلیہ ٹونک

> والد مرحوم کی تصنیف "یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ" پر مولانا محترم نے جو مقدمہ تحریر فرمایا تھا وہ اس وقت کتاب میں شامل نہ ہو سکا۔ اب یہ مقدمہ اس نمبر کی زینت بن رہا ہے۔ "مدیر"

پیشِ نظر کتاب "یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ" ہندوستان کے مشہور و معروف عالم و صحافی مولانا سید ازہر شاہ قیصر کے ان سوانحی مضامین اور خاکوں کا مجموعہ ہے جو ملک کے مقتدر رسائل و اخبارات میں مختلف اوقات میں شائع ہو کر اربابِ علم و اصحابِ ذوق سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

اس مجموعہ میں شامل مضامین میں مولانا ازہر شاہ قیصر کے جادو نگار قلم نے بڑے ہی دلکش انداز میں ان عظیم المرتبت اور مقتدر ہستیوں کے بارے میں اپنے ذاتی تاثرات کا اظہار کیا ہے اور ان کی شخصیت و سیرت کو اجاگر کیا ہے جن سے وہ خود فیضیاب ہوئے ہیں یا ان سے ملے ہیں اور ان کو قریب سے دیکھا ہے۔

یہ مجموعہ کمیت کے اعتبار سے اگرچہ مختصر ہے اور صرف دو سو صفحات پر مشتمل ہے لیکن کیفیت و جامعیت کے لحاظ سے پوری ایک صدی کے علمی ادبی اور تاریخی حالات و واقعات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

علماء، ادباء اور مصلحین قوم کے سوانحی حالات پر تحقیق کرنے اور ان سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس مجموعہ میں خاصا معلوماتی مواد موجود ہے زبان و بیان کے لحاظ سے بھی یہ مجموعہ نہایت دلچسپ سنجیدہ اور قابلِ مطالعہ ہے۔

جن محترم تاریخ ساز اور یادگارِ زمانہ مقتدر شخصیتوں کے تذکرہ اور سوانح پر یہ کتاب مشتمل ہے ان میں مفکر بھی ہیں اور عالم بھی ادیب بھی ہیں اور شاعر بھی، مصلح قوم بھی ہیں اور سیاست داں بھی۔

مولانا عبید اللہ سندھی، علامہ سید انور شاہ کشمیری علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ظفر علی خاں، مولانا مظہر علی اظہر مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالرحمٰن مفسر امروہوی، مولانا غلام رسول مہر، جگر مرادآبادی اور احسان دانش و روش صدیقی۔ یہ سب ہستیاں یقیناً یادگارِ زمانہ بھی ہیں اور "فوق کل ذی علم علیم" کی مصداق بھی۔ علم و فضل، ادب و صحافت، تحریر و تقریر، وعظ و تذکیر، دعوت و اصلاح، تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کونسا شعبہ ایسا ہے

جس کی ان حضرات نے سربراہی و راہ نمائی نہ کی ہو۔

عربی کا مشہور مقولہ ہے "تذکرۃ الاسلاف تبصرۃ الاخلاف" اس تصنیف کے ذریعہ اخلاف کو اسلاف کی بہت سی نئی باتیں معلوم ہونگی اور بہت سے قابل فخر و ناز علمی ادبی اور تاریخی و سیاسی کارناموں ان کے اصول زندگی عقائد و مسلمات اور سوانح حیات سے واقفیت حاصل ہوگی اور بزرگوں کے حالات پڑھنے سے ہمارے نوجوانوں میں انشاء اللہ علم و عمل کی نئی روح پیدا ہوگی۔

مصنفِ کتاب "مولانا ازہر شاہ قیصر کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے وہ ہندوستان کے ان اہل قلم میں سے ہیں جنھوں نے غیر منقسم ہندوستان کی صحافتی اور علمی ادبی دنیا میں ایک ممتاز مقام حاصل کیا ہے اور اپنے اشہب قلم کی جولانیوں سے میدان ادب و صحافت کی مشکل اور کٹھن راہوں کو آسان و ہموار بنا کر رکھدیا ہے گذشتہ ۴۶ سال سے وہ مختلف علمی تحقیقی اور ادبی و تاریخی عنوانات پر لکھتے رہے ہیں ان کے گرانقدر مضامین و مقالے بلا مبالغہ ہزاروں صفحات پر بکھرے اور پھیلے ہوئے ہیں۔ جن لوگوں نے اخبار زمیندار لاہور، انقلاب، احسان الجمعیۃ، انصاری، قومی آواز، نیرنگ خیال، عالمگیر، حور پیام اسلام و مسلم جالندھر جیسے معیاری رسائل کا مطالعہ کیا ہے وہ مولانا کی شگفتہ و پختہ تحریر اور شستہ و رفتہ انداز بیان سے پوری طرح آشنا ہیں۔

۱۹۳۶ء سے مولانا کا قلم مسلسل ادب و انشاء کی ترقیم و تزئین اور تاریخی و علمی جواہر پاروں سے علم و ادب کے خزانے کو معمور کرنے میں مصروف ہے۔ اخبار زمیندار لاہور کے ادارۂ تحریر سے مولانا کا قریبی تعلق اس دور کا ایک قابل رشک اور باعثِ فخر واقعہ تھا۔ کیونکہ اخبار زمیندار کا عہد صحافت ہندوستان کی صحافتی تاریخ کا عہد زریں شمار کیا گیا ہے اس دور میں جبکہ قابل و لائق افراد کی کمی نہ تھی کسی ادیب، انشاء پرداز اور صحافی کا زمیندار کے ادارۂ تحریر میں شامل ہوکر مولانا ظفر علی خاں جیسے قابل صحافی کے ساتھ کام کرنا ایک بہت بڑا اعزاز تھا اور یہ اعزاز مولانا ازہر شاہ نے محض اپنی ذاتی لیاقت اور اعلیٰ صلاحیت کی بدولت حاصل کیا تھا۔

مولانا ازہر شاہ قیصر جس خانوادۂ علمی سے تعلق رکھتے ہیں اور جس شجر کمال کے ثمر نیک ہیں وہ علم و فضل کی دنیا میں بے نظیر ہے اور ع

در فضل و کمال لاجواب است

ایں خانہ ہمہ آفتاب است

مولانا کے پدر بزرگوار جانشین حضرت شیخ الہند رح حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے مقدس نام اور ان کی جامع کمالات شخصیت علمی و ادبی کارناموں سے کون ایسا ہے جو واقف نہیں ہے ان کی علمی و مذہبی شخصیت اور ان کا رسوخ فی العلم اہل علم و ارباب فضل کے حلقوں میں مسلم ہے۔ عرب و عجم میں کونسی ایسی جگہ ہے جہاں علامہ کشمیری کے فاضل تلامذہ موجود نہیں ہیں۔ ہند و بیرونِ ہند کی وہ کونسی بستی ہے جہاں حضرت شاہ صاحب کا علمی و روحانی فیض نہ پہنچا ہو۔ ہند سے لیکر چین، چین سے

(بقیہ مضمون صـ ۴۵)

اس کے علاوہ بھی بہت سی ضمنی تاریخی معلومات اس کتاب میں درج ہیں جس کا مطالعہ بہت مفید اور چونکا دینے والا ہے۔

مولانا ازہر شاہ قیصر کی علمی خدمات اس بات کی متقاضی ہیں کہ ان کی اشاعت سرکاری سطح پر ہو۔ اگر حین حیات یہ کام نہ ہوسکا تو اب پس مرگ یہ کام ہوجانا چاہئیے ورنہ مولانا کے لائق فرزندان اور اہالیان شاہ منزل دیوبند جو ملی خدمت کے کام لے رہے ہیں۔ خدا مولانا ازہر شاہ صاحب کو جوار رحمت میں جگہ دے آمین

لیکر روم تک ان کے فیضان کا سیلاب موجیں مارتا ہے ایسے علمی خانوادہ، دینی وروحانی ماحول اور ایسے برگزیدہ ویگانہ روزگار عالم کے سایہ تربیت میں نشوونما پانے والی شخصیت علمی شہرت وصلاحیت کی جن بلندیوں کو چھولے بھی وہ کم ہے۔

خاندان کے علاوہ مولانا ازہر شاہ قیصر کی شخصیت وسیرت کی تعمیر میں جن مشاہیر علماء وفضلاء کا ہاتھ رہا ہے ان میں مولانا شبیر احمد عثمانی رح، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا مناظر احسن گیلانی کے اسمار گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ایسے جید علماء کے فیض صحبت سے اپنی شخصیت کو جلا دیکر مولانا ازہر شاہ نے اپنی علمی زندگی کا آغاز کیا تو صحافت کے میدان میں قدم رکھا مختلف ادبی و مذہبی رسائل واخبارات میں اپنے قلم کے جوہر دکھانے کے بعد سنہ ۱۹۵۱ء سے آپ رسالہ "دارالعلوم" کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے مستقل طور پر کام کرنے لگے۔ اور اپنی مخلصانہ کاوش سے آپ نے اس کو بہت جلد صف اول کے علمی جریدوں میں لا کھڑا کیا۔ دیوبند سے اس سے پہلے مختلف ادوار میں مختلف رسائل واخبارات جاری ہوئے لیکن یہ خصوصیت اور فخر رسالہ دارالعلوم ہی کو حاصل ہے کہ وہ اپنے آغاز سے آج تک برابر جاری ہے اور اس کے علمی ادبی ودینی معیار میں روز افزوں اضافہ ہی ہوا ہے اور اس سب کا سہرا مولانا ازہر شاہ قیصر ہی کے سر ہے۔

بہر حال مولانا ازہر شاہ قیصر کے مضامین کا یہ مجموعہ جو یادگار زمانہ شخصیتوں کے سوانحی خاکوں پر مشتمل ہے اپنے موضوعات کے لحاظ سے ایک یادگار ادبی تحفہ ثابت ہوگا اس کے یادگار ادبی تحفہ ہونے کی کئی جہتیں ہیں۔ ایک تو خود صاحب سوانح کی شخصیت، دوسرے مولانا کا ذاتی مطالعہ ومشاہدہ اور ان حضرات سے ان کا ذاتی قرب، پھر ان کا

انداز نگارش اور انداز فکر۔

یہ تمام شخصیتیں جن پر مولانا نے قلم اٹھایا ہے ایسی ہیں جن کے بارے میں دوسرے ارباب قلم نے بھی اپنے اپنے تاثرات کو مختلف حیثیتوں سے قلم بند کیا ہے لیکن ہر ایک اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا ازہر شاہ قیصر نے ان مضامین میں جس انداز سے ان شخصیات کی سیرت وکردار اور زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے وہ سب سے جداگانہ ہے اور اس میں انفرادیت ہے۔

شاہ منزل (دیوبند) صرف ایک مکان کا نام ہی نہیں ہے بلکہ وہ طلبائے عزیز اور تشنگان علم وادب کے لئے ایک درسگاہ اور فیض کا بحر ذخار بھی ہے اس کے مکیں خواہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں یا زندہ ہیں اپنا ایک مقام ایک درجہ ایک شہرت وعظمت وروحانیت رکھتے ہیں۔ میرا شاہ منزل سے تعلق اگر سوچوں اور یاد کروں تو بچپن ہی سے ہے اور وہ اس طرح کہ میرے بچپن (غالباً ۳۸-۱۹۳۹ء) میں مدرسہ نوریہ اشرفیہ حسن پور لوہاری (مظفر نگر) میں لدھیانہ سے بچوں کا ایک رسالہ آیا کرتا تھا اس رسالہ میں ایک صاحب مولانا ازہر شاہ قیصر بچوں کے لئے کچھ لکھا کرتے تھے۔ جس ماہ اس رسالہ میں ان کا کوئی مضمون نہیں ہوتا تھا تو ہم سبھی طالب علم ان کی کمی محسوس کیا کرتے تھے اور وہ رسالہ (یعنی وہ شمارہ) کچھ پھیکا پھیکا رہتا تھا۔ یہ بات اس وقت کی ہے جب میں ابتدائی دینی کتب اور قرآن پاک حفظ کر رہا تھا۔ اس وقت سے میں شاہ منزل کو تو نہیں البتہ مولانا ازہر شاہ قیصر صاحب کو جانتا ہوں اور ان کے نام سے نہ جانے کیوں ایک والہانہ عقیدت اور محبت چلی آرہی ہے۔ ان سے یہی میرا بچپن کا غائبانہ تعارف تھا۔

پھر اس کے بعد غالباً ۴۴-۱۹۴۵ء میں مزنگ (لاہور) میں حضرت احسان دانش صاحب مرحوم کے مکان پر دو صاحب دیوبند سے آئے یہ دونوں بھائی مولانا ازہر شاہ قیصر اور جناب انظر شاہ (اسوقت مولانا نہیں تھے) تھے دوپہر کے وقت دیر تک باتیں کرتے رہے رخصت کرنے کے لئے انار کلی تک آیا یہاں آکر دہی کی لسی پی اور میں مزنگ لوٹ آیا۔ یہ بالمشافہ شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ لیکن میں ان دنوں شاعر تھا نہ ادیب (اور نہ میں آج اس قسم کا دعویٰ کرتا ہوں) مکتبہ دانش میں رہ کر جناب محمد اسحاق خاں شورا حسانی سے کچھ سیکھ رہا تھا اور کچھ کتب خانہ میں کام بھی کرتا تھا۔ یہیں سے شاہ صاحب سے مراسلت کا نیاز مندانہ سلسلہ جاری ہوا اور کبھی کبھی رسالہ دارالعلوم کے دفتر میں جاکر مزاج پرسی کی اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے پلٹ آتا۔ پھر اس کے بعد شاہ منزل تک بھی رسائی کا شرف حاصل ہوا اور یہ بات مجھ ایسے طالب علم کے لئے باعث فخر تھی۔ اب میں خود کو شاہ منزل کا ایک فرد سمجھنے لگا تھا۔ اب مجھے شاہ صاحب اندر ہی بلا لیا کرتے تھے اگر کھانے کا وقت ہوا تو کھانا ضرور کھلایا جاتا یا پھر چاء تو ہر حال میں پلائی جاتی۔ کبھی کوئی کتاب بھی عنایت کی جاتی۔

۲۵ نومبر ۸۵ء کو میری بائیں آنکھ کا آپریشن ڈاکٹر شراف چیریٹی ہسپتال دہلی میں ہوا۔ اخبارات اور لکھنے پڑھنے کی سخت ممانعت تھی جناب سرور تونسوی ایڈیٹر شان ہند حسب معمول شب میں آئے اور آتے ہی یہ منحوس خبر سنائی لو بھائی تمہارے ازہر شاہ قیصر بھی خدا کو پیارے ہو گئے۔ اس کے بعد تفصیل سے خبر سنائی۔ ظاہر ہے اس خبر سے اس وقت مجھ پر

کیا گذری اور کیا بیتی ہوگی اور اس عالم بیچارگی میں مرا کیا عالم اور کیا حالت ہوئی ہوگی۔

— شاہ صاحب — مرگئے — شاہ صاحب بھی گئے —
— شاہ صاحب تو کئی ماہ قبل اس وقت مرچکے تھے جب میں ان کو دیکھنے کے لئے مظفر نگر کے ایک ہسپتال میں آیا کرتا تھا اور شاہ صاحب موت و زیست کی کشمکش کا شکار تھے کبھی امید و بیم کے عالم میں تھے کبھی ان کی حالت دیکھ کر مایوس تھے چپ تھے ہر کوئی آکر سرگوشیاں کرتا تھا شاہ صاحب اس وقت کیسے بچ گئے۔ اتنے عرصہ کیسے زندہ رہے — ؟

جب میں پہلی بار ٹاؤن ہال کے سامنے تلاش کرتا ہوا ایک ہسپتال میں پہنچا تو شاہ صاحب کو دیکھتے ہی میرے پاؤں تلے سے زمین کھسکتی نظر آئی اور میں نے تو اس وقت صبر کر لیا تھا۔ دوسری بار آیا تو مجھے دیکھ کر ہفت روزہ قومی آواز کی طرف اشارہ کیا اس میں شاہ صاحب کے ادبی لطائف تھے اور میری کتاب "اسے کیا کہئے" سے چند شعراء کے لطائف دیئے گئے تھے۔ اس دن کچھ تسلی ہوئی کہ شاہ صاحب اس خطرہ سے بچ گئے۔ تیسری بار پھر حاضری دی تو چاء بھی پلوائی اور حسب عادت ذرا تفریحاً ادھر ادھر کی باتیں بھی کیں۔ مجھے شبہ ہوا کہ فالج کا اثر تو نہیں ہے یہ میرا وہم تھا ایسا نہیں تھا۔ پھر آیا تو موجود نہیں تھے دریافت کرنے پر بتلایا گیا دیوبند چلے گئے ہیں۔ گھر گیا تو اب وہ پہلی سی حالت نہیں تھی اب کچھ بولنے بھی لگے تھے کبھی کبھی تیور بھی بدلتے اور بگڑتے بھی تھے میں ان کو ہنسانے کی کوشش کرتا رہا لیکن آج وہ باغ و بہاراں شاہ صاحب بجھے بجھے سے تھے بیحد کمزوری تھی۔ بہرحال جب پلٹا تو خوش تھا چلو اچھا ہوا اس بار شاہ صاحب بچ نکلے۔

شاہ صاحب کیا تھے اور کیا نہیں تھے شاہ صاحب کس شخصیت کا نام تھا شاہ صاحب کس پایہ کے مصنف مؤرخ، باکمال ادیب، لاجواب شاعر، مستند صحافی، میزبان، مربی اور معلم علم و ادب تھے ان کی خوبیاں کس طرح گنائی جائیں ان کے بارے میں کیا لکھا جائے وہ علم و ادب کا تابناک اور درخشاں آفتاب تھے۔ اب سورج کے سامنے کسی چراغ اور شمع کی کیا حقیقت اور حیثیت۔ وہ علم کا ایسا بے پایاں سمندر تھے کہ جس کی گہرائی کا کوئی پتہ ہی نہیں تھا ایسے سمندر کے سامنے دریا اور ندی کی حقیقت معلوم وہ ایسے صحافی تھے کہ جن کو مولانا ظفر علیخاں روزنامہ زمیندار لاہور میں جگہ دیتے تھے حالانکہ یہ اخبار ملک کے چند مشاہیر اہل قلم کے لئے یا خود مولانا ظفر علی خاں کے لئے وقف تھا اگر اس اخبار میں کسی کا نام بھی چھپ جاتا تو اسے بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ اور شاہ صاحب اپنے ابتدائی دور میں زمیندار میں برابر چھپتے تھے۔ ملک کے کسی بھی عظیم اخبار اور موقر رسالہ میں ان کے مضامین قسطوار چھپتے اور انکی پذیرائی ہوتی ان کے مضامین کے لئے انتظار کیا جاتا۔

— اسے چھوڑیئے کہ اس محنت کا صلہ کیا عطا کیا گیا۔ یہ یہاں کا دستور ہی کہاں ہے۔ شاہ صاحب تو یوں بھی ایسی باتوں سے بیزار تھے ان کو طمع زر تھی نہ حرص دولت۔ ان چیزوں سے زندگی بھر بے نیاز رہے۔ بڑے قلندر اور درویش مزاج تھے کبھی دب کر اور گر کر بات نہیں کی۔

جب شاعری کی طرف توجہ فرماتے تو خوب کہتے لیکن تفریحاً جب کسی پر تنقید کرتے تو مزا آجاتا بہترین نقاد بھی تھے ان کے پسندیدہ اور محبوب شعراء فانی و جگر، میر تقی میر احسان دانش اور روش صدیقی تھے کبھی کبھی ان کے بیشمار اشعار سناتے۔ کبھی ان شعراء کے کسی شعر پر تبصرہ اور تنقید بھی فرماتے وہ جو بات کہتے ذرا بھی رورعایت اور نرمی نہیں کرتے اور بلا جھجک کہہ گذرتے بڑے حق گو تھے۔

دار العلوم کے ایڈیٹر رہے تو اس کی شان بڑھادی اور اس میں لکھنے والوں کا ایک معتبر، مستند اور مشاہیر صاحب قلم

اور باکمال حضرات کا مجمع اکٹھا کر لیا اور اس طرح اس کو بلند پایہ رسالہ بنا کر اہل علم و ادب کے سامنے پیش کیا ـــ دار العلوم میں ایک جنگ لڑی گئی۔ لیکن، شاہ صاحب اگر چاہتے تو خوب لکھ کر کم از کم اور قلمکاروں کی طرح روٹی کما لیتے مگر وہ اس جنگ سے دور رہے اور دونوں فریق کی نظر میں قابل احترام رہے۔

شاہ صاحب قلم کے بادشاہ تھے وہ ہر وقت ہر عالم میں بلا تکلف قلم برداشتہ ہر موضوع پر لکھتے تھے ان کے لکھنے کا کوئی خاص رنگ، خاص انداز اور طرز تحریر نہیں تھا وہ ہر رنگ میں بے تکان لکھنے کے عادی تھے یہاں تک کہ ریڈیو کے لئے بھی ان کی فرمائش پر لکھا کرتے تھے وہ ایک صاحب طرز اور منفرد ادیب و صحافی تھے جو چو مکھی طرز تحریر کے مالک تھے۔ آخر وقت میں اچھا ہوا چند مضامین جو ادھر ادھر بکھرے اور اخبارات میں چھپے ہوئے تھے کتابی صورت دیکر اردو ادب پر عظیم احسان فرمایا۔

میری کتاب "تبصرے" پر کچھ لکھنے کے لئے خواہش کا اظہار فرمایا۔ میں نے بڑے اعتماد سے مسکرا کر عرض کیا شاہ صاحب، جو اردو جانتا ہے وہ حضرت کریمی الاحسانی صاحب کو ضرور کسی بھی حیثیت سے سہی ضرور جانتا ہے۔ پھر اب کچھ لکھانے کی ضرورت ہے نہ ایسا سہارا چاہیئے۔

شاہ صاحب کبھی کبھی حوصلہ افزائی اس طرح بھی فرماتے کہ میں بلا تکلف اپنے تازہ اشعار پیش کرتا تو سنتے داد بھی دیتے کبھی کسی مصرعہ کے لئے فرماتے اس طرح کہو اب یہ معیاری ہو جائیگا ورنہ شاہ صاحب کسی شاعر سے ذرا کم ہی سنتے تھے۔ کبھی فرماتے اب تم کیا لکھنے لگے ہو اس طرح مت لکھو اب کریمی کا ایک مقام ہے۔ میں اس ذرہ نوازی پر قہقہہ لگاتا اور اسی طرح چیخ کر کہتا جی ہاں کریمی صاحب کا ایک مقام ایک درجہ اور شہرت ہے لیکن یہ سب آپ کی دعائیں اور کرم ہے ـــ کبھی ڈانٹتے اس مضمون میں تم درباری بن گئے۔ میں عرض کرتا کہ شاہ صاحب میں کانگریسی ہوں اس لئے الیکشن کے وقت ایسے ہی بے سر و پا باتیں اور ہنگامہ خیزی ہوا کرتی ہے یہ سب کچھ ہنگامی باتیں ہیں۔ حالانکہ شاہ صاحب کسی ازم اور سیاست کے مقلد اور قائل نہیں تھے لیکن ذرا جھکاؤ حریت پسندی کی طرف ضرور تھا اس قسم کے بیشمار مضامین اس بات کی گواہی دیتے ہیں ـــــ

اس بار تمہارے تبصرے فلاں اخبار میں پڑھے خوب تھے۔ اور پھر دو ایک شعر بھی سنا دیتے۔ یہ بات مجھ ایسے طالب علم کے لئے باعثِ فخر تھی۔ ایک بار فرمایا، مولانا ظفر علی خاں نے "سب مزے میں ہیں" ردیف میں اشعار کہے ہیں، تم بڑا اچھا کہہ لو گے، تم کو اس رنگ اور طنز سے مناسبت ہے، کہو۔ میں نے عرض کیا کہاں ظفر علیخاں کی زمین اور کہاں بندہ ناچیز بات آئی گئی ہوئی۔ اس زمین میں کچھ جھک ماری شاہ صاحب کو سنانے کی سعادت حاصل کی بہت خوش ہوئے۔ یاد پڑتا ہے دیوبند ٹائمز اور دار العلوم میں بھی یہ اشعار شائع کئے گئے تھے جس کا مطلع یہ ہے ؎

سرحد کے پار کی ہے خبر سب مزے میں ہیں
ہم بھی تو کہہ رہے ہیں ادھر سب مزے میں ہیں

دار العلوم کے اجلاس صد سالہ کے موقع پر خصوصی طور سے پریس گیلری کے لئے کارڈ دلایا اور فرمایا شروع سے آخر دن تک کی تمام کارروائی نوٹ کر کے اپنے انداز سے لکھ کر مجھے دینا میں دار العلوم میں شائع کروں گا۔ یہ اعزاز میرے لئے کچھ کم نہیں تھا چنانچہ میں نے حکم کی تعمیل کی اور یہ آنکھوں دیکھا کانوں سنا حال (کمینٹری) کی صورت میں پیش کیا بہت خوش ہوئے اور اگلے ماہ دار العلوم میں شائع کیا۔ شاہ صاحب اپنے نیازمندوں حلقۂ احباب کو اس طرح بھی بڑھاتے اور ہمت افزائی کرتے تھے۔

نہ جانے کتنے ریسرچ اسکالر شاہ صاحب سے مشورہ کرتے اور کچھ ضروری ہدایات لے کر جاتے شاہ صاحب

ایک معلم بھی تھے۔ شاہ منزل اس بات کی گواہ ہے کہ نہ جانے کب سے اس درسگاہ میں بیشمار، لاتعداد اور ان گنت طلباء قیام کر چکے اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ سب کی ہر طرح سے مدد کی جاتی ہے۔ شاہ صاحب بڑے فراخدل مخیر، مہمان نواز، کرم گستر، جاں نثار اور مردم شناس تھے شاہ صاحب سے زیادہ ان کی اہلیہ محترمہ مہمان نواز ہیں میں نے صد سالہ اجلاس دارالعلوم کے دنوں میں ان کی بلند حوصلگی یہ دیکھی کہ شاہ منزل میں مہمان رسول ؐ کا ایک جم غفیر تھا۔ بالائی منزل سے لیکر نیچے تک مہمان ہی مہمان نظر آتے اور اور بڑے بڑے تھے اور سبھی کو ناشتہ سے لیکر کھانا تک یہیں سے ملتا تھا۔ یہ ایک دو دن کی بات نہیں تھی بلکہ ہفتوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ شاہ صاحب نے بڑی دریا دلی اور ہمت سے یہ بار عظیم برداشت کیا۔

دارالعلوم سے علیحدگی کے بعد ان کے گھر کے اخراجات میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی بلکہ علالت اور انتقال سے قبل دو شادیاں کیں۔ مولانا نسیم اختر شاہ قیصر کی شادی ہوئی جب میں نے دعوت ولیمہ میں شرکت کی تو میں نے چپکے سے عزیزی نسیم اختر سے کہا، پورے ہی شہر کی دعوت کردی ہے کیا؟ — اس پر انھوں نے مسکرا کر فرمایا کیا کیا جائے، سب چلتا ہے۔ میں دانستہ کھانے کا وقت گذار کر جانے لگا تو شاہ صاحب حسب عادت کھانے کے لئے اصرار کرتے میں انکار کرتا تو فرماتے صبیحہ! کریمی کے لئے کھانا لاؤ، کریمی! اگر میں دارالعلوم میں نہیں ہوں، میں اتنا غریب بھی نہیں ہوں کہ تجھے کھانا بھی نہ کھلا سکوں۔ کھانا آتا میں کھاتا شاہ صاحب اسی دوران گفتگو شروع کرتے جب شاہ صاحب، بولنے پر آتے تو بہت بولتے اور تسلسل برقرار رکھتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پان بھی اسی شدت سے کھاتے رہتے۔ چائے کے بھی رسیا تھے۔ پرہیز کے عادی نہیں تھے لاکھ ڈاکٹر اور طبیب چند چیزوں کے لئے بتلاتے کہ شاہ صاحب یہ نہ کھائیے لیکن شاہ صاحب کبھی بھی ان کی باتوں پر عمل نہ کرتے یہی وجہ ہے کہ وہ ایک طویل عرصہ سے علیل تھے۔ ابھی ایسی خارش میں مبتلا رہے کہ تمام رات نہیں سوتے تھے لیکن چائے بدستور جاری رہی بدپرہیزی ان کی کمزوری تھی۔

بڑے شاہ صاحب کسی کروفر اور ٹیپ ٹاپ سے نہیں رہتے تھے بڑی سادہ زندگی گذارتے تھے لباس میں بھی کوئی نمایاں فرق نہیں تھا وہی قمیص پاجامہ سردی کے دنوں میں شیروانی استعمال کرتے بڑے شاکر و صابر تھے۔

شاہ صاحب کی شخصیت بڑی تہہ در تہہ تھی وہ یاروں کے یار تھے بڑے باغ و بہاراں اور محفل کی جان تھے ان کا قلم ایک روشنی کا مینار تھا اور بڑا ارفع و اعلیٰ تھا اس کی بلندی کے سامنے کتنے ہی قلمکار بونے سے نظر آتے تھے۔ ان کے قلم کی جولانگاہ اور پرواز فکر ہمالہ سے بھی اونچی تھی اسکے سایہ میں نہ کتنے صاحب قلم دبے رہتے اور سرنگوں نظر آتے۔ ان پر کس جہت کس پہلو، کس رُخ سے لکھا جائے اب ہم ایسے نہ جانے کتنے طالبان علم و ادب ان کی کمی محسوس کریں گے۔ اہم اور نازک مسائل سمجھنے کے لئے اب کس کے پاس جایا کریں گے اردو ادب کے لئے یہ عظیم المیہ بڑا سانحہ ہے اب خلا کا پُر ہونا ممکن نظر نہیں آتا کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کس طرح ان کو خراج عقیدت پیش کروں قلم لرزاں ہے خیالات منتشر، قوت گویائی پراگندہ، دل بے چین آنکھیں اشکبار۔ اس عالم میں کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں ایک عجیب موڑ اور عجیب مقام بے بسی و مجبوری ہے۔ خداوند کریم ان کی روح کو سکون ابدی اور ہم سبھی کو صبر عطا کرے۔ آمین

بھلا اس حقیقت سے انکار کی جرأت کون کرسکتا ہے کہ انسان قدرت کا ایک حسین شاہکار ہے اور گلستانِ قدرت کا سب سے خوبصورت پھول مگر جس طرح چمن میں خاردار شاخوں پر گلاب کے پھول کی خوشبو سے پورا چمن معطر ہوگیں ہوتا ہے اور ہر ذرہ مست و سرشار، ٹھیک اسی طرح دنیائے رنگ و بو کے شاداب شبستاں میں بھی صبح ازل سے کچھ ایسے پھول کھلتے آئے ہیں جس کے اندر ظاہری خوشبو اس قدر رچی بسی ہوتی ہے جس سے ہمیشہ چمنستان انسانیت معطر رہی ہے اور مولانا سید ازہر شاہ قیصرؒ کی شخصیت بھی انھیں پھولوں میں ایک شگفتہ و شاداب پھول کی حیثیت رکھتی تھی؛ جس کی خوشبو نصف صدی سے پوری دنیا پر پھیلی ہوئی ہے آپ فہم و فراست کا مجسمہ، ذکاوت و ذہانت کا پیکر، اردو کے مایۂ ناز ادیب اور قابل فخر مضمون نگار، ہندوستان کے لائق صد ستائش مصنف اور ازہر الہند دارالعلوم دیوبند کے علمی و دینی جریدہ کے کامیاب ایڈیٹر تھے۔ ان کی ادبی نگارشات ہوں یا علمی شہ پارے، تنقیدی مضامین ہوں یا دینی مقالات۔ ان میں آفتاب کی جلالت، ماہتاب کی صباحت سبزہ زاروں کی تراوٹ، آبشاروں کا نغمہ، جھرنوں کا ترنم، صبح کی شگفتگی، شام کی دلآویزی، پہاڑوں کا وقار ستاروں کی تابناکی، تاج محل کا حسن، قطب مینار کی بلندی، لال قلعہ کا استحکام یہ ساری خصوصیات اس حسین تناسب کے ساتھ ملیں گی کہ آپ کو ایسا محسوس ہوگا کہ آپ ان مضامین و شہ پاروں کا مطالعہ ہی نہیں کررہے ہیں بلکہ عرش کی سربلندیوں سے فرش کی شادابیوں کا نظارہ بھی ہو رہا ہے۔ خاص کر آپ کے ادبی مضامین تو رعنائیوں کا مظہر اور دل فریبیوں کا مرقع ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس کے مطالعہ سے مزاج میں کیف و سرور دل میں مسرت خوشی کی لہریں دوڑنے لگتی ہیں انسان حزن و ملال، غم و اندوہ سے کوسوں دور نظر آتا ہے۔ فضا رنگ و نور میں ڈوبی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ہر ذرہ رقصاں دکھائی دیتا ہے، کائنات جھومتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

آپ نے دسمبر ۱۹۲۰ء میں عالم امکان کا پہلا جلوہ دیکھا ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی حفظ قرآن کے بعد اپنے ماموں مولانا حکیم محفوظ علی صاحب سے فارسی پڑھی۔ پھر دارالعلوم دیوبند میں عربی اور دینیات کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ ڈابھیل اپنے والد ماجد حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی معیت میں تشریف لے گئے اور وہیں پر درس نظامی کے درمیانی درجہ تک کی کتابیں پڑھیں مگر چند وجوہات کی بنا پر عربی دینی تعلیم کی تکمیل نہ ہوسکی لیکن اس کے باوجود دینیات اسلامیات پر وسیع نظر رکھتے تھے یہ کثرت مطالعہ اور وسعت معلومات کا نتیجہ تھا۔ بہرحال آپ کی زندگی کی بارہ بہاریں ہی گزری تھیں کہ آپ کی یتیمی کا شہرہ مشرق سے مغرب کی وسعتوں تک جا پہنچا یعنی آپ کے عظیم والد دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث

عالم اسلامی کی عدیم النظیر شخصیت، دنیا کا فقید المثال محدث اور سرزمین ہند کا چلتا پھرتا جیتا جاگتا کتب خانہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ حیات مستعار کے قیمتی لمحات کو علم وفن کی لازوال وادیوں میں بسر کرکے معبود برحق سے جا ملے۔ ایسی ہستیاں جنھیں قدرت اپنے دست کرم سے بناتی اور سنوارتی ہے انکی وفات کسی ایک شخص کا ماتم نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک سماج ایک جماعت ایک طبقہ کا ماتم ہے تو بے شک حضرت شاہ صاحب بھی انھیں ہستیوں میں ایک ہیں جو صدیوں کے بعد افق و دنیا پر نمودار ہوتی ہیں۔ مگر محض حضرت شاہ صاحبؒ کا نام ایسی ہستیوں کی فہرست میں درخشاں ہی نظر نہیں آتا بلکہ ان کی انفرادیت کی تابانی اور درخشانی کی بھی صاف اور نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ کہنے والے نے کیا خوب کہا ہے۔

یہ جہاں فانی ہے کوئی چیز لافانی نہیں
پھر بھی اس دنیا میں انور شاہ کا ثانی نہیں (شورش)

بہرکیف حضرت شاہ صاحب کی وفات کی خبر آندھی کی طرح ملک میں پھیل گئی ہر طرف سے آنے والوں کا ایک تانتا بندھ گیا ان آنے والوں میں ایک مولانا ظفر علی خاں مرحوم بھی تھے ان کی آمد پر دیوبند ہی کی جامع مسجد میں ایک استقبالیہ جلسہ کا انعقاد ہوا جس میں مولانا ازہر شاہ قیصر نے اپنے پورے بچپن کے باوجود فوری طور پر ایک سپاس نامہ لکھ کر مولانا ظفر علی خاں مرحوم کی خدمت میں پیش کیا تو مولانا مرحوم سپاسنامہ سنکر انگشت بدنداں ہوگئے اور بلا اختیار یہ جملے ان کی زبان سے موتیوں کی طرح بکھرنے لگے کہ اس کم عمری میں ایسی تحریر آج تک میری نظر سے نہیں گذری پھر اس سپاسنامے کو زمیندار کے پہلے صفحہ پر شائع کیا اور اس کے ساتھ ہی ایک تعریفی نوٹ بھی مولانا ازہر شاہ قیصر پر لکھا۔ اس سنہرے واقعہ سے مولانا ازہر شاہ قیصر کی انشاء پردازی کا اندازہ بحسن وخوبی لگایا جا سکتا ہے جنھوں نے کم سنی ہی میں مولانا ظفر علی خاں مرحوم جیسے بے مثال صحافی سے خراج تحسین وصول کیا

اس کے علاوہ پاکستان کے مشہور و معروف شاعر جناب احسان دانش نے ماہنامہ الرشید کے دارالعلوم دیوبند نمبر میں آپ کو ان وقیع کلمات سے یاد کیا ہے کہ "مولانا ازہر شاہ قیصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے بڑے صاحبزادے ہیں نظم ونثر پر دسترس ہے اور دارالعلوم دیوبند کے رسالہ دارالعلوم کو مرتب کرتے ہیں۔ اس رسالے کے قلم کی جولانی اور فکر کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ بحیثیت انسان خوش خلق، حلیم، مخلص اور انسان دوست واقع ہوئے ہیں۔ اور وہ دن دور نہیں کہ وہ بھی علامہ انور شاہ کشمیری رہ کی طرح اپنا مقام پیدا کریں گے۔" اس کے علاوہ بہت سے ارباب کمال نے آپ کو خراج تحسین پیش کیا ہے قلت صفحات مانع ہیں کہ ان کو پیش کیا جائے مگر یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی ناقدری اور کم ذوقی نے سینکڑوں صاحب علم وفضل ارباب زبان و بیان کے چہروں پر گمنامی کے دبیز اور تہہ بہ تہہ پردے ڈال دیئے ہیں۔ میرے کہنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مولانا ازہر شاہ قیصر کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ جب تک یہ صنم خانہ ہستی قائم ہے اس وقت تک آپ کے نام کی گونج بھی سنائی دیتی رہے گی۔

بہرکیف آپ نے وقت کی ہر ضرورت پر قلم اٹھایا بیشمار مضامین لکھے جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہوکر ہزاروں تک پہنچ چکی ہے اور ایسے مشہور و معروف رسالے جن میں صفحہ اول کے لکھنے والوں کی تخلیقات ہوتی تھیں مثلاً نیرنگ خیال، لاہور۔ ساقی، دہلی۔ سہاگ، لاہور۔ حور، لاہور۔ اخبار زمیندار، لاہور۔ انقلاب، لاہور۔ شہباز، لاہور۔ اس کے علاوہ بہت سے رسالے آپ کے مضامین سے ایک عرصہ تک مزین ہوتے رہے اور ان رسالوں کے صفحات پر آپ کے بے شمار ادبی شہ پارے پھیلے ہوئے ہیں۔ دینی وعلمی جریدوں میں قاسم العلوم دیوبند، پیام اسلام جالندھر شمس الاسلام پنجاب۔ نور جالندھر اور اس کے

علاوہ بہت سے جریدوں میں آپ کی تخلیقات بکھری ہوئی ہیں۔ متعدد رسائل بھی آپ کی ادارت میں نکلتے رہے ہیں جن میں اخبار انور دیوبند۔ صداقت سہارنپور ہادی دیوبند وغیرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں جن کے آپ ایڈیٹر رہے ہیں اور آپنے قلم کی جولانیوں سے کتنے گم کردہ منزل کو منزل آشنا کیا۔ آپ کے وہ مضامین جو مشہور شخصیات پر لکھے ہوئے ہیں ان سے بہت سے لوگوں کو زندگی ملی اور ان مضامین سے لاکھوں افراد نے استفادہ کیا۔ دین بیزار دین پرست ہو گئے۔

اور [illegible] سے دارالعلوم دیوبند کا علمی، دینی شاہ کار دارالعلوم کی ادارت بھی آپ ہی کے ذمہ رہی آپ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے اور مرتب بھی جن میں اذان بلال لاہور سے شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ لی گئی تھی جو اب نایاب ہے۔ صدیق اکبر دیوبند سے شائع ہوئی جو کمیاب ہے۔ اور علامہ انور شاہ اور قادیانیت — یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ۔ جو شخصیات پر لکھے ہوئے مقالات کا مجموعہ ہے جس میں آپ کا قلم اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ گری کر رہا ہے جس کے مطالعہ سے آپ کو ایسا محسوس ہو گا کہ وہ ہستیاں چل رہی ہیں پھر رہی ہیں آ رہی ہیں جا رہی ہیں اور یہ ہی انشاء پردازی کا کمال ہے

اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی بال بال مغفرت فرما کر بلند درجات سے نوازے

ازمیرج

بقیہ ص ۵۶

آسمان صحافت کا ایک چراغ

ابھی ۱۶ر نومبر کو میں دیوبند گیا ہوا تھا شاہ صاحب کی علالت سنکر فی الفور حاضر خدمت ہوا۔ یوں حاضری کا ارادہ پہلے سے تھا۔ وہاں جا کر دیکھا تو وہ بالکل صاحب فراش تھے۔ صورت بہ بیں حالت مپرس والا معاملہ تھا۔ میں چپکے سے بیٹھ گیا۔ تو انھوں نے ایک ہلکی آواز میں دریافت فرمایا،

کون ہے؟'

بھائی نسیم اختر نے کہا۔ "صادق علی بستوی"

فرمایا: "بھائی ماہنامہ طیب کا خیال رکھنا اس کی سرپرستی کرتے رہنا۔"

فرائض کی انجام دہی کی اس سے بہتر مثال کیا اور کہاں مل سکتی ہے۔

غرضیکہ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی وفات حسرت آیات دنیائے ادب و تحریر کے لئے ایک بڑا سانحہ ہے — میدان صحافت کی وہ جگہ خالی ہوئی ہے جو کبھی پُر نہیں ہو سکتی۔ بقول بھائی نسیم اختر، "یہ واقعہ ہے کہ دیوبند کی ادبی و قلمی راہیں ہمیشہ کے لئے ویران و سنسان ہو گئیں۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے (آمین)

مالک کل تجھ پہ آسانی کرے
حشر تک تیری نگہبانی کرے

موت سے کس کو رستگاری ہے آج وہ کل ہماری باری ہے

یگانۂ روزگار، امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی ایک زندہ یادگار مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر، آسمانِ صحافت کا آفتاب کامل بھی غروب ہو گیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ منحوس خبر سنکر دل کو زبردست دھکا لگا، دماغ کئی دنوں تک متاثر رہا مگر کیا کیجئے یہی نوشتۂ تقدیر اور قانون الٰہی ہے اسی طرح ہر ایک کو یکے بعد دیگرے اس جہانِ فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کرنا ہے یہی ہوتا چلا آیا ہے اور آئندہ بھی یہی سلسلہ جاری رہے گا کوئی بڑا ہو یا چھوٹا، نبی ہو یا ولی ہو موت سے کسی کو رستگاری نہیں دراصل ایسے وجود کا بھروسہ ہی کیا جو "نہیں تھا" اور "نہیں رہے گا" کے درمیان پل کا مہمان ہو سے

کون ہے دنیا میں رہنے کے لئے * زندگی سب کی ہے کہنے کیلئے

دو کل کا وجود اور ایک آن کی زندگی کا حال ایسا ہی ہے جس طرح چکی کے دو پاٹوں کے درمیان گیہوں کے چند حقیر دانے۔ مختصر سے وجود کے ماقبل و مابعد دو عدم چکی کے دو پاٹے ہیں ہر دو کے بیچ وجود کسی وقت بھی پس سکتا ہے، دم توڑ سکتا ہے۔ اسی لئے ممکنات میں وجود کو ایک شئے سے تعبیر کیا گیا ہے گویا دو عدموں کے درمیان وجود بھی عدم ہے پھر ایسے وجود کا، ایسی زندگی کا کیا بھروسہ اور کیا غم۔ مگر انسان ہے کہ وجود کی تبدیلیٔ صورت پر ماتم کرتا ہے گریہ وزاری کرتا ہے، کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہزار اُپائے کے باوجود قدرت نے اپنی امانت واپس لے لی، شئی مستعار مانگ لی۔ لیکن جو انسان قرض لیکر واپس کرنے میں تردد محسوس کرتا ہو اُسے اپنوں کے عزیز وجود کے ختم ہونے پر غم کیوں نہ ہوگا۔ یہ ایک فطری جھکاؤ ہے اس کے لئے شاید وہ فطرتاً مجبور ہے۔ ماں باپ بہن بھائی، دوست احباب کی جدائی کا مرحلہ بڑا گمبھیر ہے اس موقع پر رسول اللہؐ کی چہیتی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی فطرت سے مجبور ہوئیں اور آنحضورؐ کے وصال پرملال پر انتہائی صدمے کا اظہار فرمایا۔ فرمائی

صبت علیّ مصائب لو انها
صبت علی الایام صرن لیالیا

یعنی مجھ پر ایسی مصیبتیں ٹوٹ پڑیں کہ اگر یہ مصیبتیں دن پر ٹوٹ پڑتیں تو وہ دن رات ہو جاتے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔

شیئان لو بکت الدماء علیهما
عیناي حتی تؤذنا بذهاب

لو يبلغ المعشار عن حقيهما
فقد الشباب وفرقة الاحباب

جوانی کے جانے اور احباب کی جدائی پر اگر اتنا آنسو بہا دیا جائے کہ دونوں آنکھیں ضائع ہوجائیں تو بھی سمجھو کہ ان کے حقوق کا دسواں حصہ بھی ادا نہیں ہوا۔

معلوم ہوا یہ مرحلہ اتنا کٹھن ہے کہ نہ صبر کی تلقین آسان ہے نہ نوحہ و ماتم کی تائید۔ لیکن چونکہ مرحوم کا مسلسل غم موجود کو بھی وجود سے محروم کرسکتا ہے۔ زندگی خطرات مول لے سکتی ہے اسلئے تلقین صبر اور صبر سے کام لینا ہی دانائی، دین ہے، اسلام ہے جس پر عمل ہر انسان خصوصاً ہر مسلمان کا فرض ہے۔

مرحوم شاہ صاحب جیسی یگانۂ روزگار ہستی کا حادثۂ فاجعہ کوئی معمولی بات نہیں۔ مگر صبر سے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں۔ اس لئے میں شاہ صاحب کے پسماندگان کو صبر ہی کی تلقین کرونگا اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں جلد صبر جمیل عطا فرمائے (آمین) اور شاہ صاحب مرحوم کے صاحبزادے شاہ صاحب کی زندہ یادگار ثابت ہوں جسطرح شاہ صاحب امام العصر علامہ انور شاہ (اپنے والد محترم) کی زندگی بھر زندہ یادگار رہے اور شاہ صاحب کے نقش قدم پر چلنے کی سراپا جدوجہد کریں۔ ؎

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر از بر ہو
پھر پسر قابل میراث پدر کیوں کر ہو

ـــــ شاہ صاحب مرحوم اپنے والد محترم کی طرح خداداد صلاحیتوں کے مالک، ذہانت و طباعی کے سراپا پیکر، ادب وصحافت کے کامل آفتاب و ماہتاب ہونے کے باوصف انتہائی سادہ، متحمل مزاج اور استقلال و عزم کے کوہ گراں تھے۔ فرائض کے انجام دینے میں اپنی مثال آپ تھے۔ جس وقت وہ رسالہ دارالعلوم کے ایڈیٹر تھے میں سمجھتا ہوں کہ ہفتہ میں دو خطوط میرے پاس ضرور تحریر فرماتے کہ رسالہ دارالعلوم کا خیال رکھو، خریدار مہیا کرکے بھیجتے رہو، "دارالعلوم" بڑے خسارہ میں چل رہا ہے" اس طرح کے خطوط جانے کتنے متعلقین و منتسبین کو لکھتے اور بھیجتے رہے ہونگے۔ دو ایک خطوط میں تحریر فرمایا، "تم کچھ دنوں کے لئے موقع نکال کر دارالعلوم چلے آؤ اور "علماء دیوبند اور علم حدیث" کے موضوع پر ایک جامع کتاب لکھ ڈالو، ابھی اس موضوع پر کوئی کام نہیں ہوسکا ہے جو بہت ضروری ہے۔ اس کتاب کو انشاء اللہ دارالعلوم ضرور شائع کردے گا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب مرحوم کو رسالہ دارالعلوم اور خود دارالعلوم کا کتنا خیال تھا، علماء دیوبند اور ان کے علمی و تحقیقی کارناموں کو اجاگر کرنے کی کتنی فکر تھی وہ دارالعلوم کے مفاد میں کیا ذہن رکھتے تھے اور کس ڈھنگ سے سوچتے تھے اور کیا کیا قابل لحاظ مقاصد اور پروگرام ان کے ذہن میں پرورش پارہے تھے جو کسی وجہ سے شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے۔

میرا ایک مضمون "افکار و اخبار" کے مستقل عنوان سے ایک مدت تک مسلسل "دارالعلوم" میں شائع ہوتا رہا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت کامیاب رہا اور بڑی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور پڑھا گیا یہ سلسلہ بھی شاہ صاحب کے حکم پر شروع ہوا تھا عنوان بھی انھیں کا تجویز کردہ تھا۔

غرض شاہ صاحب اپنے متعلقین پر کتنے شفیق اور ہمدرد تھے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے وہ دل سے چاہتے تھے کہ دارالعلوم کے ہونہار فضلاء میدان تحریر میں نکلیں اور ملک کے عظیم فنکار ثابت ہوں۔ اس طرح کے اوصاف آج کل ناپید سے نظر آرہے ہیں۔

(باقی صفحہ ۵۶ پر دیکھیے)

سنہ ۱۹۷۱ء میں دارالعلوم دیوبند میں میری طالب علمی کا چوتھا سال، دورۂ حدیث میں داخل تھا۔ اس لحاظ سے طلبہ میں گویا نمایاں اور تبصرے کرنے یا انتظامی امور میں تنقید کرنے کا مجاز تھا، دارالعلوم دیوبند ایک اسلامی، دینی ادارہ ہے جس کا عام یونیورسٹیوں اور کالجوں سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے دوسرے اداروں سے قطع نظر یہاں کے طالب علموں کا یہ مزاج ہے کہ جب چند سال یہاں گذار لیں تو وہ اپنے آپ کو ہوشیار، مہذب، اور تجربہ کار ثابت کرنے کے لئے حالات، انتظامات اور کبھی کبھی بعض اساتذہ کے اسباق پر تبصرے کرنے شروع کر دیتے ہیں اور جو طالب علم اپنی علمی مشغولیت سے وابستہ ہو وہ اپنا یہ اختیار استعمال نہ بھی کرے تو کم سے کم ان تبصروں کو سننے پر مجبور ہوگا۔

چنانچہ دورۂ حدیث یعنی فراغت کے سال میں طلبہ میں جو شکایتیں ہوا کرتی تھیں ان میں ایک یہ تھی کہ رسالہ "دارالعلوم" کا معیار باقی نہیں رہا۔ یا یہ کہ "ایڈیٹر دارالعلوم" اب کچھ لکھتے نہیں بلکہ الٹے سیدھے مضامین چھاپ دیتے ہیں۔

کچھ اسی قسم کے تبصرے عام طور پر طلبہ کرتے اور گویا اپنی رسالہ بینی اور مطالعہ کی دھاک بٹھانے کی کوشش کرتے اور سچ تو یہ ہے مجھے بھی عام طلبۂ مدارس عربیہ کی طرح اخبار و رسائل یا تاریخ و ثقافت سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا اسلئے ان تبصروں پر یقین سا آجاتا۔ پھر دارالعلوم سے فراغت کے بعد مطالعہ کا کچھ شوق ہوا۔ اخبار و رسائل سے دلچسپی ہوئی، جب یہ صحیح طور پر معلوم ہوا کہ رسالہ دارالعلوم کیا ہے اور اس کے مدیر کون ہیں۔

رسالہ دارالعلوم مسلک اکابر، اہل سنت والجماعت دیوبندی مکتب فکر اور اسلامی روایات کا ترجمان تھا جس کے مدیر اعلیٰ تھے مولانا سید ازہر شاہ قیصر، فرزند اکبر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رح۔ لیکن چونکہ ایک تاثر یہ قائم ہو چکا تھا کہ رسالہ دارالعلوم "بس یوں ہی سا ہے" اور محترم مدیر اس کے معیار کو بلند کرنے میں کوئی رغبت نہیں رکھتے اسی لئے رسالہ سے بھی ہمیں دلچسپی نہ ہو سکی ہاں مدیر محترم جناب ازہر شاہ صاحب کا صورت آشنا ضرور ہو گیا۔

وقت گذرتا گیا پھر جب میں دارالعلوم کے دفتر "الداعی" (عربی) میں ملازم ہوا تو دیگر کارکنان دارالعلوم سے بھی تعارف ہوا۔ دفتر الداعی کا محل وقوع کچھ اس طرح تھا کہ احاطہ مولسری میں دفتر تعلیمات کے سامنے سے جب اترنا ہوتا یا دفتر اہتمام کا رُخ ہوتا تو دفتر رسالہ دارالعلوم پر نظر پہلے پڑتی اور سامنے ہی ازہر شاہ صاحب نظر آتے اور صبح کے وقت وہ اکیلے نہیں ہوتے تھے ان کے دفتر میں بعض اساتذہ اور منتظمین کا اجتماع رہتا تھا۔ ہمیں یہی احساس ہوتا کہ یہ سب حضرات اپنے علاوہ مدیر محترم کا بھی وقت ضائع کرتے ہیں۔

اس نشست میں عام طور پر سید محبوب رضوی مرحوم

مولانا محمد اسلم قاسمی، عبداللہ جاوید، عبداللہ سلیم، قاری نعمان، حکیم عزیز الرحمٰن کے علاوہ مولانا انظر شاہ مسعودی مولانا محمد عثمان مرحوم، مولانا عبدالحق پیشکار مرحوم، مفتی ظفیر الدین مولانا محمد گل مرحوم وغیرہ نظر آجاتے تھے۔ شاہ برادران کی موجودگی میں نام لئے بغیر اگر صرف شاہ جی کہا جاتا تو مولانا ازہر شاہ صاحب ہی مراد ہوتے اور مولانا انظر شاہ کو "شاہ صاحب" کا لقب دیا جاتا۔ گویا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے دونوں شاہ کے درمیان "جی" اور "صاحب" کا حد فاصل قائم کر کے امتیاز کر دیا جاتا۔ یا پھر بڑے شاہ جی اور چھوٹے شاہ جی کہلاتے۔

یہ ۱۹۷۷ء کی بات ہے جب الداعی کا اجراء ہوا مولانا وحید الزماں کیرانوی کے زیر نگرانی مولانا بدر الحسن قاسمی اور میں نے دفتری نظم و نسق مکمل کر لیا تھا لیکن ہم دونوں نوآموز مولانا وحید الزماں ہدایات دیتے، الداعی کی ترتیب اور دفتری امور میں رہنمائی کرتے۔ ہمیں پھر بھی پریشانی تھی کہ مکمل رہنمائی نہیں مل پا رہی تھی اسی اثناء میں ایک روز صبح کے وقت کسی معاملہ میں مولانا عبدالحق مرحوم سے معلومات کے لئے دفتر اہتمام کا رُخ کیا سامنے ازہر شاہ صاحب اکیلے تھے۔ دیکھتے ہوئے بولے۔ "بیٹا اسلام، ادھر تو آؤ"

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس ایک جملہ میں کس درجہ شفقت اور توجہ تھی، فوراً ہی ان سے ذرا دور "باادب باملاحظہ" کے انداز میں بیٹھ گیا۔ فرمایا کہ کیا کر رہے ہو، دفتری نظم و نسق کی کیا صورت ہے، کچھ تجربہ بھی ہے یا نہیں۔؟

میں نے عرض کیا شاہ جی! ہمیں تو اس کا تجربہ بھی نہیں اور نہ یہ معلوم کہ دار العلوم کے دفاتر کی ترتیب رجسٹر وغیرہ کی خانہ پری کس طرح ہوگی۔ کہنے لگے، چلو اطمینان سے بیٹھ جاؤ میں بتاتا ہوں، پھر وہ بہت سی باتیں بتانے لگے جس سے مجھے اپنے فرائض کی انجام دہی میں بڑی آسانی ہوئی تھی۔ کہنے لگے، چلو کل کو پھر آنا مزید رہنمائی کرونگا

اب ظاہر ہے کہ جو دوری ایک طرح سے تھی وہ ختم ہو چکی تھی اور پھر انھوں نے جس شفقت اور مہربانی کا برتاؤ کیا تھا اس کے ردِ عمل میں انسیت ہوگئی۔ دوسرے دن ان کے دفتر میں حاضر ہوا تو انھوں نے کہا کچھ پاکستانی معزز شخصیات اور اداروں کے پتے لکھو جن پر تمھیں الداعی بھیجنا ہے وہ املا کراتے رہے اور میں لکھتا رہا۔ جب پچاس سے زائد پتے ہو گئے کہنے لگے پھر لکھ لینا، میں نے کہا شاہ جی! آپ نے یہ پتے زبانی اس طرح لکھوائے جیسے آپ پاکستان کا سفر بارہا کر چکے ہوں۔ جواب دیا کہ بیٹے! میں آج تک پاکستان نہیں گیا ہوں۔ مجھے بڑی شدید حیرت ہوئی کہ اتنے پتے اس طرح حافظہ میں ہوں کیسے ہو سکتا ہے۔

لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب مجھے اس حقیقت کا پوری طرح علم نہیں تھا کہ شاہ جی محدث عصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رح کے وارث ہیں جن کا حافظہ ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے اور فرزند اکبر نے اپنے والد بزرگوار سے قوت یادداشت وراثت میں پائی ہے۔

رفتہ رفتہ مجھ پر یہ بات عیاں ہو گئی کہ ازہر شاہ کی شخصیت اپنے اندر بے پایاں خوبیاں رکھتی ہے اور سب سے بڑی خوبی یہ کہ خوردوں کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی تو ان کی فطرت بن چکی ہے۔

چنانچہ ایک دفعہ مجھے بلایا اور پوچھا کہ تم اور مولوی بدر الحسن صرف عربی ہی سے وابستہ رہو گے یا اردو میں بھی اپنی صلاحیت آزماؤ گے؟ ہمت جہت اور ہمہ صفت بنو۔

میں نے کہا اردو میں بھی لکھنے کا شوق ہے جسے پورا کرتا ہوں علمی مضامین لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کہنے لگے کہ لکھو اور مجھے دو میں دار العلوم میں شائع کرونگا اور تمھیں ترقی کے مواقع فراہم کرونگا۔ حیرت ہوتی تھی کہ اس زمانے میں بھی ایسے لوگ ہیں جو فرزندان دار العلوم کو اپنی حوصلہ افزا باتوں کے علاوہ مواقع فراہم کرنے کا وعدہ

بھی کرتے ہیں، جب کہ فی زمانہ ایسا مزاج بن گیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے میدان میں اترتا ہے اور زور آور ثابت ہوتا ہے تو اسے مختلف طریقوں سے پچھاڑنے اور نیچا دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

وقت اور آگے بڑھا جب شاہ جی مرحوم نے اپنی عنایتوں اور شفقتوں سے مجھ جیسے ناتجربہ کار اور کم عمروں کو ایک حیثیت اور مرتبہ دیا اور بے تکلفی کے ساتھ ہر علمی، تاریخی، ثقافتی موضوع پر گفتگو کرنی شروع کی تو وہ بات کہہ دی جو طالب علمی کے دور نے میرے ذہن میں نقش کردی تھی، عرض کیا :۔ کہا جاتا ہے کہ رسالہ دارالعلوم کا وہ معیار نہیں رہا جو پہلے ہوا کرتا تھا اس کی کیا وجہ ہے؟ یا پھر اس میں کس حد تک صداقت ہے۔

ان کا جواب رسالہ دارالعلوم کی تاریخ پر محیط تھا اور ان واقعات وحقائق پر مبنی جسے کوتاہ ذہن افراد کے فکرونظر کی رسائی وہاں تک نہیں ہوتی — رسالہ کے معیار میں کوئی کمی نہیں آئی۔ لیکن اگر کوئی "کمی" تھی تو یہ کہ وہ دارالعلوم کے ان فضلاء کو نمائندگی دیتے رہے جن میں شعور تھا، آگہی تھی، سلیقہ تھا، علم تھا اور جنھیں حوصلہ افزائی کے لئے مدیر رسالہ دارالعلوم حضرت مولانا ازہر شاہ قیصر مواقع فراہم کرتے رہے۔

ورنہ اگر وہ چاہتے تو از خود مکمل رسالہ کے لئے مضامین کا انبار لگا دیتے۔ تاریخی واقعات اور سیاسی نکتہ آفرینیوں میں تو وہ یکتائے زمانہ تھے۔ دوسرے رسالوں اخباروں کی فرمائش پر وہ برابر لکھتے رہے اور ادبی انفرادیت کے ساتھ اخیر عمر تک جلوہ گر رہے۔

اور ان کی تحریر جس میں ادب کی پختگی، فکرونظر کی گہرائی، سلاست اور شگفتگی کا منفرد اسلوب موجود ہے آج بھی صحافیوں اور ادیبوں کے لئے مشعل راہ ہے صحافت میں انھوں نے نصف صدی تک اپنے جوہر دکھائے ہندوپاک کے مؤقر رسالے اور اخبارات ان کی تحریروں سے مزین ہوئے اور ان کی یہ تحریریں ہی ان اخبارات ورسائل کے لئے باعث فخر ہوئیں۔

واقعات نگاری ان کا انفرادی اسلوب ہے، تاریخی واقعات، اکابر دارالعلوم، مجاہدین آزادی برصغیر ہند کے قلمکاروں اور شاعروں کے واقعات کو اپنی تحریر اور زبانی بھی اس طرح بیان کرتے کہ ہر پہلو نمایاں ہوجاتا اور ان کے موروثی حافظہ نے ان خصوصیات کو دوبالا کردیا تھا، حوالے اور مستندات کا ذکر ان کے مضامین میں بھی ملتا ہے اور ان کی مجلسوں میں بھی سنائی دیتا۔

ایک دفعہ ان سے سوال کیا کہ آپ کے دفتر میں تقریباً روزانہ ہی مجلس ہوجاتی ہے اور سب سلجھے ذہن اور اچھی نظر رکھنے والے افراد ہوتے ہیں آخر کس کس موضوع پر گفتگو ہوتی ہے؟ یا یوں ہی وقت ضائع کیا جاتا ہے۔ کہنے لگے کسی دن آجائیے ایک دن خود ہی بلوایا۔ پھر اپنا دفتری کام رسالہ کی ترتیب وغیرہ مکمل ہوتی تو خود ہی حاضر ہوتا رہا۔

یہ مجلس ہم جیسوں کے لئے ایک تجربہ گاہ تھی۔ تاریخ کے اوراق کھلتے، اکابر دارالعلوم کے کارنامے اور خدمات آشکارا ہوتے، دارالعلوم کے اہم مسائل (جو غیر انتظامی ہوتے) زیر بحث آتے، ادیبوں کے تذکرے، شاعروں کے تجزیے، ملکی اور بین الاقوامی حالات پر تبصرے، علمی مباحث پر تحقیق وتنقیح، مسلمانوں کے دینی حالات اور معاشرے کی اصلاح کے طریقے بیان ہوتے، پھر خورد ونوش کی باتیں پروقار مزاحیہ جملے اور معلوماتی چیزیں پیش ہوتیں۔

ہم جیسے نوآموز اور حالات سے مکمل آگاہی نہ رکھنے والوں کے لئے یہ مجلس ایک نعمت تھی جس سے میں نے بہت کچھ سیکھا، سمجھا، حاصل کیا۔

پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس مجلس کے تمام افراد دارالعلوم کے اجلاس صد سالہ کے انتظام میں منہمک

ہوئے تو اس بین الاقوامی اجتماع کو کس خوبی سے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔

لیکن چشم بینا طرح طرح کے تماشے دکھاتی ہے۔ کبھی دوسرے کی آنکھوں کے تنکے دکھائی دیتے ہیں اور کبھی اپنی آنکھ کا شہتیر بھی چھپا لیتی ہے۔ اجلاس صد سالہ کے بعد دارالعلوم میں ایسے ہنگامے ہوئے کہ جس میں کچھ لوگوں کو دارالعلوم کی انتظامیہ میں ہر طرح کا نقص دکھائی دینے لگا اپنے عیوب نہیں دکھائی دیئے، ان سازشوں اور ہنگاموں کا نتیجہ یہ ہوا کہ دارالعلوم کا ایک سنہرا دور ختم ہو گیا

شاہ جی کی یہ مجلس بھی ختم ہو گئی۔ سید محبوب رضوی پہلے ہی انتقال کر گئے تھے باقی ماندہ افراد کا شیرازہ بھی بکھر گیا۔ شاہ جی رسالہ دارالعلوم سے جدا ہوئے تو بجھ سے گئے۔ طبیعت کی شگفتگی ختم ہو گئی ولولے پژمردہ ہو گئے۔ دارالعلوم کے انتشار کا غم انھیں بے بسی اور بے کسی کی حالت میں لے آیا۔

اسی دوران میں نے اپنا عربی کا ماہنامہ "الثقافۃ" جاری کر لیا تھا۔ ادھر ہم لوگوں کے مربی و محسن، کاروان دارالعلوم کے سالار اعظم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند بھی ہم سے جدا ہو گئے۔

شاہ جی کے مشورے پر مولوی نسیم اختر شاہ قیصر نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں ایک اردو ماہنامہ "طیب" کے اجراء کا ارادہ کیا، شاہ جی کی عنایتیں راقم الحروف کے ساتھ اس وقت بھی رہیں انھوں نے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے مجھے اس رسالہ سے وابستہ کر دیا اور کہا کہ اردو میں بھی لکھتے رہو ابھی تم لوگ جوان ہو، حوصلہ ہے، موقع ہے۔ حالات اور پریشانیوں سے مقابلہ کرو، جد و جہد جاری رکھو۔

رفتہ رفتہ شاہ جی بھی اپنی تحریروں سے نوازتے رہے مگر چند ماہ کے بعد اپنی مصروفیات کی وجہ سے ادارت کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گیا۔ پھر بھی ان کا اصرار رہا کہ کچھ نہ کچھ لکھتا رہوں۔

پھر شاہ جی جب بیمار ہوئے تب بھی املا کراتے رہے تا آنکہ ۲۷ر نومبر ۱۹۸۵ء کو اسی طویل علالت میں انتقال ہو گیا اور اپنے والد ماجد علامہ انور شاہ کشمیری رح کے مزار کے برابر میں مدفون ہوئے۔

بلاشبہ ان کو معمار ادب و صحافت اور بلند پایہ صحافی کہا جائیگا جنھوں نے تقریباً ۵۰ سال تک قوم کی خدمت کی دارالعلوم دیوبند کی ترجمانی کے فرائض انجام دیئے اور چار ہزار سے زائد مضامین لکھے جو علمی، اصلاحی، تاریخی، سیاسی دینی اور ادبی مواد پر مشتمل تھے۔

وہ بالغ نظر صحافی اور نہایت ہی ذہین قلمکار تھے انھیں شخصیات پر سوانحی مضامین لکھنے کا ملکہ تھا جسے وہ خوب سے خوب تر بنا دیتے ان کی تصنیف "یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ" اس حقیقت کی دلیل ہے

ان کی دیگر تصانیف حیات انور، متفرقات، سفینہ جن کے ناخدا، ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا "ان کی تحریروں کے بعض نمونے ہیں۔ ورنہ ان کی تخلیق کا بیشتر حصہ ان رسالوں میں موجود ہے جس کی وہ خود ادارت کرتے رہے۔ ماہنامہ صداقت انور، ہادی، خالد، دارالعلوم، طیب یہ وہ رسالے تھے جنھیں انھوں نے اپنے فکر و فن سے آراستہ کیا اور دوسرے اخبارات مثلاً زمیندار، احسان، انقلاب وغیرہ میں بھی ان کے مضامین نمایاں طور پر شائع ہوتے رہے۔ اور رسالہ دارالعلوم کی ترتیب اشاعت اور ترسیل میں ان کے کمال کا اعتراف نہ کرنا ناانصافی ہوگی، بہرحال کے عرصہ میں صرف ایک دفعہ یہ رسالہ اپنے وقت پر شائع نہیں ہوا۔ ورنہ کبھی تاخیر نہیں ہوئی جو تاریخ صحافت میں ایک ریکارڈ ہے۔

یہ تو ان کی زندگی کے بعض گوشے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کس طرح ملک و قوم اور دارالعلوم دیوبند کی خدمت کی اور کس طرح صحافت و انشاء پردازی کیلئے نئی نسل کو تعمیر کیا اور انھیں پروان چڑھنے کا موقع دیا۔ "خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را"

قرطاس وقلم کے امین

از: مولانا محمد حنیف صاحب ملی
مالی گاؤں

مولانا سید ازہر شاہ قیصر

[illegible]

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر سلسلۂ تاریخ کے وہ صاحبِ اوصاف عالم دین تھے جنھیں زمانہ کبھی نہ بھلا سکے گا مرحوم نہ صرف بڑے باپ کے بڑے بیٹے تھے بلکہ اس اضافی نسبت سے کہیں زیادہ اپنے فکر و خیال کردار و عمل اور زبان وقلم کے کمال سے بھی انھوں نے دنیائے علم و معرفت، عالم شعر و ادب اور جہانِ فکر و معنی سے اپنی عظمت کا لوہا منوالیا ہے ان کی زندگی کی تقریباً پچاس بہاریں علم و معرفت اور زبان وادب کی چمن بندی کے لئے وقف تھیں، وہ ایک صوفی منش کم گو اور خلوت پسند انسان تھے لیکن ان کی زندگی کے اس خاموش سمندر کی تہہ میں قرطاس وقلم اور فکر و شعور کا بحر مواج پوشیدہ تھا ان سے ملتے ہی پہلا تاثر یہ ہوتا تھا کہ وہ ساکن سمندر ہیں جس کی ساکن لہروں میں نہ صرف روانی بلکہ ہمہ گیر صدف ہائے گہر بار پوشیدہ ہیں۔ وہ جب اظہار تمنا اور درد دل کے لئے اپنے لب خاموش کو جنبش دیتے تو قلم کی طرح زبان کی گوہر افشانیاں بھی ان کی عظمت کا اعتراف کرتی تھیں۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رح کی قوتِ حافظہ، ماضی کی پارینہ یادوں کا استحضار، اسلاف کے سربستہ اوصاف تاریخ فضل و کمال کی بڑے سلیقہ سے ترتیب اور اپنے باغ و بہار قلم سے اس کی عکاسی مرحوم ازہر شاہ قیصر صاحب کو والد کی وراثت میں ملی تھی۔ بلاشبہ وہ خطۂ دیوبند کے رئیس التحریر اور امام القلم تھے۔ کسی موضوع پر قلم اٹھانا ان کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ اپنے اسلاف کی تاریخ کا تذکرہ لکھ کر انھوں نے منزلِ دعوت و عزیمت کے خط و خال نہ صرف یکجا فرمادئے بلکہ تاریخ کی شکستہ کڑیوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر مکمل بنادیا۔ "یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ" ان کے قلم کا وہ عظیم شاہکار ہے جس سے مرحوم ہردم زندہ رہیں گے۔

مولانا ازہر شاہ مرحوم بڑے بے تکلف، سادہ مزاج سادہ دل اور گوشہ نشین تھے لیکن ان کے قلم کی شوخی نے انھیں اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ ممتاز بنادیا تھا۔ وہ دارالعلوم دیوبند کے بزرگوں سے قریبی ربط اور عقیدت رکھتے تھے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند ان کے قلم کے نہ صرف معترف تھے بلکہ ان کی تحریر پر حضرت کو اتنا اعتماد تھا کہ ماہنامہ دارالعلوم کی ادارت کیلئے حضرت نے ازہر شاہ کا ہی انتخاب فرمایا اور مرحوم دارالعلوم کے ناخوشگوار حادثہ تک اس اہم ترین منصب سے وابستہ رہ کر قرطاس وقلم کی ذمہ داریوں کو بہ حسن وخوبی انجام دیتے رہے انھوں نے اپنے رواں قلم شستہ تحریر، نو وا فکر ونظر سے نہ صرف یہ کہ ایشیا کی مرکزی درسگاہ کے کامیاب ترین آرگن کا حق ادا کیا بلکہ ملک کے بدلتے ہوئے حالات

میں بھی مسلک دیوبند اور علماء دیوبند کی کامیابی کے ساتھ پرزور وکالت اور ترجمانی بھی ان کا قلم دار العلوم اور روایات دار العلوم کے لئے بھی ڈھال تھا اور تلوار بھی انھوں نے اس اہم منصب سے وہ اہم فرض ادا کیا جس کے لئے ادارے اور عمر دراز درکار ہوتی ہے۔

مرحوم اپنے خوردوں کی حوصلہ افزائی اپنا فرض سمجھتے تھے میں ان کے عہد ادارت میں ۸۰ء میں دار العلوم کا طالب علم تھا ان سے اگرچہ ایک مرتبہ کے علاوہ کبھی ملاقات کی ہمت نہ ہوئی تاہم ان کی خیر خواہی اور مضمون نگاری کے لئے ترغیبی کلمات آج بھی ذہن و دل کے صفحات پر نقش ہیں۔ دار العلوم سے فراغت کے بعد جب میں نے مضمون لکھنا شروع کیا تو مرحوم نے سب سے پہلے حوصلہ افزائی کی اور راقم کے متعدد مضامین مرحوم کی خصوصی توجہ سے ماہنامہ دار العلوم کے صفحات کی زینت بھی بنے۔ گلشن جب جاری ہوا تو مرحوم بہت خوش ہوئے اور گلشن میں شائع ہونے والے مضامین کو نہ صرف نظر استحسان سے دیکھا بلکہ مجھے انھوں نے کچھ مفید مشورے بھی دئے ان کی یہ کشادہ ظرفی اور خورد نوازی دنیائے صحافت میں بہت کم ملتی ہے وہ صحافت میں جتنے امتیاز کے مالک تھے اس عاجز کو وقتاً فوقتاً اپنی خیریت سے نوازتے تھے۔ دار العلوم کی توسیع واشاعت کے لئے جب میں نے تقریباً پندرہ خریداروں کی رقم ارسال کی تو مرحوم نے جو خط لکھا۔ ملاحظہ ہو۔

"محترم! سلام مسنون

رسالہ کے لئے منی آرڈر پہنچا اور سب خریداروں کے نام رسالے بھیجدئے گئے۔ اللہ کریم آپ کو دار العلوم کی اس خدمت کا اجر عظیم دے دار العلوم کی حفاظت فرمائیں اور علم و عمل کے اس مرکز کو ہولناک فتنوں اور آپس کے اختلافات سے محفوظ رکھیں۔ سب مخلصین دار العلوم سے گذارش ہے کہ دار العلوم کے لئے دل وجان سے دعا کریں۔ امید ہے کہ آپ سب حضرات بہ عافیت ہونگے حضرت مہتمم صاحب بجد کمزور اور بستر نشین ہیں۔

آپ نے جس کتاب کا ترجمہ کیا ہے اس کا کچھ حصہ کتاب کے ضروری تعارف کے ساتھ روانہ فرمادیں تاکہ دار العلوم میں قسطوار شائع ہوتا رہے۔ والسلام۔

ازہر شاہ قیصر۔ ۲۵ اگست ۸۰ء"

مرحوم ازہر شاہ صاحب نے جس کتاب کے ترجمہ کی اشاعت کا ذکر اپنے خط میں فرمایا ہے اس کی کتنی ہی قسطیں آپ کی حیات میں شائع ہوچکی ہیں اور تازہ ماہنامہ میں بھی اس ماہ سے شائع ہو رہی ہے اور یہ سب حضرت مولانا ازہر شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصی توجہ اور نظر کرم کا ہی ثمرہ ہے خدا انھیں بخشے۔

مرحوم اگرچہ درس وتدریس سے کبھی منسلک نہیں رہے لیکن اپنے قلم اور "دار العلوم" کی ادارت سے انھوں نے ملت کی جو خدمت انجام دی ہے اسے آسانی سے بھلایا نہیں جا سکتا اور ان کے دور ادارت میں باذوق رواں قلم اور فکر وخیال کے حامل طلباء کرام کے مضامین بھی زیب قرطاس ہوتے رہے۔ جب دار العلوم آپس کی چپقلش اور ناخوشگوار حالات سے دوچار ہوا تو مرحوم خود دل برداشتہ اور بادل ناخواستہ نہ صرف میگزین بلکہ دار العلوم دیوبند کی ملازمت سے بھی علیحدہ ہوگئے اور آخر تک گوشہ گمنامی میں ہفت روزہ "اشاعت حق" اور ماہنامہ "طیب" کے ذریعے پرورش لوح وقلم کرتے رہے اور ان کے لائق ترین فرزند مولانا نسیم اختر صاحب قیصر کے لئے مہاراشٹر کے کسی مدرسے میں ملازمت کی خواہش بھی ظاہر کی۔ افسوس کہ خدمت کے اس محاذ پر اس عاجز کو عملاً شرکت کا موقع نہ مل سکا

جس کا قلق ہر دم رہیگا۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند سے مرحوم کو خاص عقیدت تھی قاری صاحب کی بے لوث خدمات اور قربانیوں سے بے حد متاثر تھے اسی لئے ازہر شاہ مرحوم نے حضرت کی یاد میں اپنے دل کی تشنگی بجھانے کے لئے ایک صحیفہ "طیب" کے نام سے جاری کیا جو "بقامت کہتر بقیمت بہتر" کا نمونہ ہے مضامین معیاری عنوانات اثر انگیز اور موزوں تبصروں سے معمور ہوتے ہیں۔

آخر میں دمہ کی بیماری نے انھیں کافی لاغر بنا دیا تھا دو سال قبل جب میں دیوبند گیا تو مرحوم نے مجھے اپنے یہاں بلایا اور بہت سے مسائل پر بڑی تفصیلی گفتگو ہوتی رہی کسے معلوم تھا کہ قلم کا یہ بادشاہ اور قلمدان صحافت کا یہ عظیم تاجدار اتنی جلدی ہم سے بچھڑ جائے گا لیکن خدا کی مشیت میں کسی کی نہیں بنی ہے بلاشبہ مرحوم کی جدائی ان کے عزیزوں خصوصاً ان کی بیوہ اور بچوں کیلئے کسی طرح حادثۂ جانکاہ سے کم نہیں ہے لیکن صبر کے سوا چارۂ کار بھی نہیں۔

تاب لاتے ہی بنے گی غالبؔ
حادثہ سخت ہے اور جان عزیز

میں شخصی طور پر اپنے دیرینہ مراسم اور مرحوم کی چشم عنایت کی وجہ سے ان کی جدائی کو ذاتی حادثہ سمجھتا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ کریم کارساز مرحوم کی خطاؤں کو بخشے ان کی بال بال مغفرت فرمائے ان کے درجات کو جنت الفردوس میں بڑھائے ان کی قلمی خدمات کو ان کے لئے نجات اور حصول جنت کا ذریعہ بنائے اور ان کی غمزدہ بیوہ اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ان کلمات کے ذریعے عزیزم مولوی نسیم اختر شاہ قیصر اور قیصر فیملی تک تعزیت مسنونہ پہنچا رہا ہوں۔

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر

جمیل مہدی
ایڈیٹر روزنامہ عزائم لکھنؤ

کچھ یادیں

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر کے تصور کے ساتھ کم و بیش ۴۵ برسوں کی ایک پوری داستان نظروں کے سامنے متحرک ہونے لگتی ہے، اور اس تیزی کے ساتھ اس کے مناظر ذہن سے گذرتے ہیں کہ کسی ایک منظر پر نگاہ جمنے نہیں پاتی کہ دوسرا شروع ہو جاتا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ ان سے پہلی بار ملنا کب ہوا تھا لیکن جب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک جزو لاینفک کی طرح میری زندگی سے وابستہ تھے۔ جس طرح آدمی کو یہ یاد نہیں رہتا کہ اس نے اپنے ماں باپ کا چہرہ کب پہلی بار دیکھا تھا لیکن وہ اس حقیقت کو جانتا ہے کہ یہ لوگ اس کی زندگی سے پوری طرح وابستہ ہیں۔ کم و بیش یہی صورت مولانا ازہر شاہ قیصر اور میرے تعلقات کی تھی۔

وہ مجھ سے عمر میں کافی بڑے تھے۔ محدث العصر علامہ انور شاہ رح کی صورت مجھے دھندلی سی یاد ہے ہزار کوشش کرتا ہوں تو بھی ان کا ہیولیٰ ہی باقی رہتا ہے خد و خال واضح نہیں ہو پاتے۔ اتنی بات اچھی طرح معلوم ہے کہ ان کی رحلت اور میری والدہ کی وفات میں بس دنوں کا ہی فرق تھا یہ بھی یاد نہیں آیا کہ ان کے گھر والے اماں جی اور شاہ جی پہلے ہمارے گھر تعزیت کے لئے آئے تھے یا میری دادی اماں علامہ رح کی تعزیت کو شاہ منزل پہلے گئی تھیں ـــ اور شاہ جی (ازہر شاہ) اس وقت ڈابھیل سے تعلیم و تربیت حاصل کر کے واپس دیوبند آ چکے تھے، میں نے ہوش سنبھال کر انھیں اپنے سے ویسا ہی بے تکلف شفیق اور مہربان دیکھا جیسے کہ وہ آخر تک رہے۔

انھوں نے دارالعلوم کے اس پہلے زلزلے کے مناظر کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا جس میں ان کے یگانۂ روزگار اور بے مثال محدث اور عالم علامہ انور شاہ کشمیری رح کے ساتھ علامہ شبیر احمد عثمانی علامہ ابراہیم بلیاوی، مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی جیسے اکابرین اور مفتی محمد شفیع، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، مفتی عتیق الرحمن عثمانی، جیسے درجنوں ایسے لوگ، دارالعلوم سے بے دخل ہو گئے جو آگے چل کر اکابرین ملت میں شمار ہوئے اور جن کے دارالعلوم دیوبند سے الگ ہو جانے کے سبب اس کی علمی روح اس طرح نکلی کہ پھر آخر تک واپس نہ آ سکی ـــ اور اس آخری انہدام جیسی کیفیت کا بھی نظارہ کیا جس کے بعد دارالعلوم دیوبند کا دینی اعتبار، مذہبی تقدس اور زیادہ صحیح یہ کہ اس کا وجود ہی ختم ہو کر رہ گیا۔ اس آخری تپھکے کی زد میں وہ خود بھی آئے اور مولانا قاری محمد طیب رح کی طرح وہ بھی اس صدمہ کے تحمل نہ ہو سکے جس کے بانی مبانی وہ لوگ تھے جن کی علمی دینی ثقاہت اور اعتبار شہرت و ناموری میں ان کے فقید المثال والد علامہ انور شاہ کشمیری رح کی نسبت اور تعلیم و ارشاد کا سب سے بڑا ہاتھ تھا۔

اب سے ۴۰، ۴۲ برس پہلے کا دیوبند آج جیسا ویران اور آثار قدیمہ جیسی کیفیتوں کا حامل نہیں تھا. مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا ادریس کاندھلوی، مفتی محمد شفیع دیوبندی، علامہ ابراہیم بلیاوی، مولانا عزیر گل اور مولانا نافع گل، مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی، مولانا محمد طاہر قاسمی علامہ شبیر احمد عثمانی جیسی مغتنم روزگار شخصیتیں تو دیوبند ہی میں موجود تھیں اور ان کی وجہ سے اقصائے عالم سے مشاہیر کھنچے ہوئے دیوبند چلے آئے تھے اور دنیا بھر کے مشہور سیاست دانوں، عالموں اور سر آمد روزگار شخصیتوں کا تانتا بندھا رہتا مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، عطاء اللہ شاہ بخاری، خان عبدالغفار خاں، آصف علی مولانا ابوالکلام آزاد، لال بہادر شاستری، پنڈت گووند بلبھ پنت، ڈاکٹر راجندر پرشاد، ظاہر شاہ والیٔ افغانستان حافظ محمد ابراہیم اور ایسے ہی نہ جانے کتنی شخصیتوں کو دیوبند والوں نے گھر بیٹھے ان ہی اکابرین کی وجہ سے دیکھا اور انکی باتیں سننے، انکے افکار سے واقف ہونے کا موقع حاصل کیا.

ان نابغۂ روزگار ہستیوں کے ہجوم اور دنیا کے منتخب لوگوں کے افکار کا سایہ ان لوگوں کے ذہن و قلوب پر پڑنا ہی تھا، جو علمی مذاق اور ادبی رجحانات رکھتے تھے اس لئے اس زمانے میں تحریر و تقریر سے دلچسپی رکھنے والوں کی ایک پوری نسل تیار ہو گئی اور دیوبند کی نسبت سے ازہر شاہ قیصر، سید محبوب رضوی، عامر عثمانی، زبیر افضل عثمانی، مخمور عثمانی، امتیاز نسیمی، انور صابری اور اقبال نسیم اس زمانے کے ادبی، سیاسی اور علمی حلقوں کے معروف نام تھے، امتیاز علی تاج، حامد الانصاری غازی، ابو سعید بزمی، دیوبند چھوڑ چکے تھے لیکن ہم ان کا شمار اپنے ہی میں کرتے تھے اردو زبان پر بھی سیاہ بختی کا سایہ اس وقت تک نہ پڑا تھا اس لئے ہر دن ادبی محفلیں ہوتیں. ہر رات صحبتیں جمتیں اور ہر وقت تحریر، تقریر، شاعری اور ترجمہ کے موضوعات گفتگو میں آتے رہتے. مولانا عبدالوحید صدیقی بھی، جنھوں نے بعد میں نئی دنیا، ہما اور ہدیٰ وغیرہ جریدے نکال کر بڑا نام پیدا کیا اس وقت دیوبند میں مقیم تھے اس لئے پوری فضا علمی اور ادبی ہوگئی تھی میری تحریری زندگی کا آغاز بھی اسی ماحول میں ہوا اور ابتداء میں ادب اور ادبی تنقید تک ہی یہ میدان محدود رہا.

سب سے بڑا فائدہ اس ماحول کا یہ تھا کہ سوسائٹی میں شامل سب لوگ اپنا ایک منفرد اسلوب تحریر رکھتے تھے. عامر عثمانی زبیر افضل عثمانی اور انور صابری شاعر تھے، سید محبوب رضوی، ازہر شاہ قیصر، مخمور عثمانی، امتیاز نسیمی اور اقبال نسیم کی انشاپردازی اور ادب و تاریخ اور ترجمہ سے دلچسپی تھی. یہ لوگ شاعری بھی کبھی کبھار اسی طرح کر لیتے جس طرح شاعر حضرات کبھی کبھار نثر لکھ لیتے لیکن ان موضوعات سے ان کا تعلق بس دعا سلام کی حد تک ہی رہتا.

شاہ جی کی افتاد طبع صحافت کی طرف مائل تھی، مزاج علمی تھا سید محبوب رضوی تاریخ اور تحقیق سے دلچسپی رکھتے تھے، مخمور عثمانی، امتیاز نسیمی کو ترجموں سے مناسبت تھی، اقبال نسیم افسانہ نگاری کا شوق رکھتے تھے، انور صابری، عامر عثمانی اور زبیر افضل عثمانی کا میدان شاعری تھا. کوئی بڑا ادبی سیاسی جلسہ اور کوئی بڑا مشاعرہ ایسا نہ ہوتا جن میں ان لوگوں کی آواز نہ گونجی ہو.

شاہ جی ۱۹۴۷ء سے کچھ دنوں پہلے لاہور گئے. جہاں زمیندار، شہباز، احسان، زمزم اور آزاد جیسے مشہور اخباروں میں ان کے مضامین علمی اور وقتی موضوعات پر چھپے اور پورے ملک میں مقبول ہوئے ۱۹۴۷ء سے پہلے وہ دیوبند آ کر مستقل طور پر مقیم ہوئے تو انھوں نے اپنی پہلی باقاعدہ کتاب حیات انور مرتب کر کے شائع کی. ۱۹۴۷ء سے بہت پہلے اس زمانہ کا نیشنلسٹ اخبار ہفتہ وار استقلال کے بھی وہ مستقل کالم نگار رہے. ۱۹۴۷-۴۸ء میں دیوبند سے

دو ماہوار رسالے دینی، سیاسی اور تاریخی موضوعات
پر نکلے ایک "تجلی" تھا اور دوسرا ہادی۔ تجلی کی ادارت
عامر عثمانی اور زبیر افقس عثمانی نے سنبھالی اور رسالہ کی
ضرورت سے شاعری کے علاوہ نثر کا میدان بھی سنبھالا
اور بہت جلد مسجد سے میخانے تک کے مستقل کالم میں ایک
منفرد سا اسٹائل بھی پیدا کرلیا۔ ہادی کئی برس تک
سید محبوب رضوی، ازہر شاہ قیصر اور میرے نام کے
ادارۂ تحریر کے ساتھ نکلتا رہا۔ پھر شاہ جی کا رسالہ
دارالعلوم کی ادارت کا دور شروع ہوا جو شاید ۲۵ برس
سے بھی زائد مدت تک جاری رہا۔

اتنی مصروفیات اور اتنی شہرت اور بے شمار مضامین
کے مصنف ہونے کے باوجود شاہ جی اس متنوع قابلیت
اس بے نظیر صلاحیت اور علمی تجربے کے شایان شان کام
نہیں کرسکے جو اُن کے اندر موجود تھیں اور قدرت کے
خاص عطیہ کا درجہ رکھتی تھیں ان کی عالمانہ شان علمی سرمایہ
پر انکی نظر اور ادق مسائل پران کی جچی تلی رائے کا جیسا
اظہار ان کی گفتگو میں ہوتا تھا اسے کسی مستقل تصنیف
میں منتقل کردینے کی مہلت وہ نہیں پاسکے۔

اپنے سے بڑوں کے ساتھ اپنے وقار کا جتنا
اہتمام اور اپنے چھوٹوں کے ساتھ شفقت اور
بے تکلفی کا جیسا برتاؤ وہ رکھتے تھے اس کی دوسری
مثال ان کے معاصرین میں نہیں پائی جاتی تھی۔ میں نے
مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی
مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی جیسے لوگوں کو ان کی
نازبرداری کرتے دیکھا۔ اور خود شاہ جی کو مولانا محمد سالم
قاسمی مولانا محمد اسلم قاسمی اور میرے اپنے چھوٹے بھائی
محزوں مرحوم کی نازبرداری کرتے پایا۔

وہ اختلاف ہر کسی سے کرسکتے تھے، مخالف
کسی کے نہیں تھے، ناراض ہونے اور ناراض کرنے
میں انہیں دیر نہیں لگتی تھی لیکن ناراض رہنے اور
ناراض رکھنے کے وہ قائل نہیں تھے۔ خود بہت جلد
مَن جاتے اور دوسروں کو بھی بہت جلد منا
لیتے تھے۔

وہ علمی درجہ اور دینی علویت میں اپنے قابل
فخر والد علامہ انور شاہ کشمیری رح کی ہمسری نہیں
کرسکے لیکن مظلومیت اور محرومیت میں انکی جانشینی
کا انھوں نے حق ادا کردیا۔

شاہ جی کے اس جہانِ فانی سے گذر جانے کے
بعد وہ پرانی، علمی، ادبی اور شعری بساط مکمل طور
پر اجڑ گئی جو پرانی اور نئی نسل کے درمیان پُل کا
کام دے رہی تھی۔

ایک میں اس کی سوگواری اور مجاوری کے لئے
باقی رہ گیا ہوں تو میری حیثیت بھی داغ فراق
شب کی جلی ہوئی، اس شمع جیسی ہے جو نہ معلوم
کس وقت بھڑک کر خاموش ہوجائے۔

"سدا رہے نام اللہ کا۔"

ہمیں سو گئے داستاں	بقیہ ص ۲۷

"یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ" "سفینۂ وطن
کے ناخدا" اور "ذرا عمر رفتہ کو آواز
دینا" کے افادے اور استفادے کو
عام وتام کردے تاکہ اس کا ثواب
مرحوم کو ہمیشہ پہنچتا رہے اور دعا ہے
کہ اللہ تعالیٰ محبین، معتقدین اور اعزہ واقربا
کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین۔

مولانا عطاء الرحمن القاسمی
جامعہ رحیمیہ نئی دہلی

فرصت ملے تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کئے

میانہ قد وقامت، متناسب الاعضا جسم، گندمی رنگ، کشادہ پیشانی، اس پر فکر و دانش کی غیر مرئی سلوٹیں، سر پر بال والی کشمیری ٹوپی جو آبائی وطن کی علامت و نشان، چہرہ پر متانت و سنجیدگی کے ساتھ عمر رفتہ کے نشیب و فراز روشن متفکر آنکھیں ان میں دار العلوم کی علمی و سیاسی شخصیتوں کی کہانیاں، موٹے موٹے لبوں پر بے ترتیب کتری ہوئی مونچھیں جس میں غمگین مسکراہٹ خود ساختہ شرعی سفید داڑھی، خاکی رنگ کی شیروانی شیروانی کی جیب میں کسی فاؤنٹین پین اور سیاہ و سفید کاغذ،

حق گو، خورد نواز، دوست پرست، تکلفات سے ناواقف، خود نمائی و خود بینی کے تازہ بتازہ فنکارانہ فلسفوں سے ناآشنا خلوص و محبت کی جیتی جاگتی تصویر، صورۃً مرثیہ گو حقیقتاً باغ و بہار۔

علامہ کشمیری رحؒ کا لخت جگر، مولانا عثمانی رحؒ کا نور نظر، مولانا سندھیؒ کے میکدہ کا محروم ع

میکدہ کا محروم بھی محروم نہیں

بلا کا فقرہ باز، دیوان صحافت کا بے باک و بے لوث بزرگ صحافی، بے شمار لطیفوں کا بلا شرکت غیر خالق و موجد۔ اس قلمی خاکے میں جو شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے وہ علمی و ادبی دنیا کی محبوب و قد آور شخصیت "مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصرؒ" کی ہے۔

مولانا سید محمد ازہر شاہ کی عبقری شخصیت علمی و ادبی حلقہ میں محتاج تعارف و تعریف نہیں۔ عصر حاضر کا شاید ہی کوئی ہندو پاک میں محروم القسمت پڑھا لکھا آدمی ہو جو شاہ جی کے ادارتی مضامین، تحقیقی دینی مقالوں سے ناآشنا ہو۔

عادل صدیقی صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ:۔

"ایک اندازے کے مطابق انھوں نے اپنی مدت العمر میں تقریباً ساڑھے چار ہزار مضامین مختلف ادبی، دینی سیاسی اور سماجی موضوعات پر لکھے۔ تقریباً ۳۳ برس سے دار العلوم دیوبند کے ماہنامہ رسالہ "دار العلومؒ" کے ایڈیٹر رہے ان کا زمانۂ ادارت اس ماہنامہ کی زندگی کا زریں دور سمجھا جاتا ہے وہ ایک بالغ نظر صحافی اور نہایت ذکی اور ذہین قلمکار رہے ہیں۔"

دیوبند سے شائع ہونے والے اخبار استقلال، ماہنامہ ہادی، ماہنامہ خالد کے

ایڈیٹر رہے۔ اس طرح انھوں نے سات یا آٹھ مختلف رسائل اور اخبارات کی ادارت سنبھالی۔"

ایک دفعہ شاہ جی نے راقم الحروف سے فرمایا تھا کہ میاں عطاء الرحمٰن، میں ۷، ۸ جرائد و مجلات کا مدیر رہ چکا ہوں اب کسی جریدہ کا مدیر ہونے کا شوق نہیں رہا۔

شاہ جی ذکی الحس، سریع الفہم، قوی الحافظہ اور وسیع المطالعہ وسیع النظر بزرگ تھے۔ موصوف ہر فن وعلم کے متعلق نہایت بے تکلفی اور بصیرت کے ساتھ گفتگو فرماتے۔

اگر کسی مجلس میں شعر و شاعری کا ذکر آجاتا تو عربی فارسی اور اردو کے پچاسوں منتخب اشعار سنا دیتے اور اس کے ساتھ تنقید و تحسین بھی کرتے جاتے۔ کسی خاص موضوع" سے متعلق کتابوں کا ذکر آجاتا تو بیسیوں مطبوعہ اور مخطوطہ کتابوں کا نام بتا دیتے، اور ساتھ ہی ساتھ مصنف کا تعارف اور کتاب کے محاسن و عیوب پر فاضلانہ و محققانہ روشنی بھی ڈالتے جاتے تھے اہل مجلس ان کی حیرت انگیز یادداشت پر ششدر و حیران رہ جاتے۔ کوئی بندۂ خدا ان تنقیدوں اور تبصروں کو قلمبند کر لیتا تو کتاب مذکور کے لئے اچھا خاصا مقدمہ بن جاتا۔

شاہ جی نے ایک مجلس میں فرمایا تھا، ارے میاں میں اپنی بے ترتیبی اور لاپرواہی کی وجہ سے اپنے بیشمار مضامین ضائع کر چکا ہوں واقعی شاہ جی کے بے شمار مضامین و مقالے معمولی بے توجہی کی وجہ سے ضائع ہو گئے ہیں جس کا شاہ جی کو احساس ضرور ہوا مگر رنج و الم نہ ہوا لیکن ان کے نیازمندوں کو تا زندگی غم و ملال ہوتا ہی رہے گا

موصوف کی مشہور تصانیف جو یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ" "سفینہ" "وطن کے ناخدا" "متفرقات" اور "حیات انور" ہیں یہ کتابیں کیا ہیں۔ ان کے ذاتی مشاہدات، تجربات اور احساسات کے ترجمان اور ان کی مختلف الجہات شخصیت کی یادگار ہیں۔

شاہ جی صحیح العقیدہ اور دیوبندی الفکر ہونے کے ساتھ ہر قسم کی جماعتی عصبیت و گروہی تنگ نظری سے بڑی حد تک پاک تھے۔ آپ کے مخلصانہ تعلقات و گہرے روابط ہر مکتب فکر کے افراد سے یکساں طور پر تھے۔ مثلاً شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رح، مولانا مناظر احسن گیلانی رح مفکر ملت مولانا عبیداللہ سندھی رح، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب رح، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رح، امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی، مفسر قرآن مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی، امیر شریعت عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ظفر علی خاں، مولانا غلام رسول مہر، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، علی محمد شیر میوات، جگر مرادآبادی، احسان دانش، سیماب اکبرآبادی، روش صدیقی، مولانا مظہر علی اظہر، شیخ عبداللہ کشمیری، غلام محمد صادق ——— ان بین الاقوامی اور شہرۂ آفاق شخصیتوں سے گہرے روابط و مخلصانہ و دیرینہ تعلقات تا زندگی قائم رہے۔ ان کے متعلق یہ کہنا زیادہ حقیقت و صداقت پر مبنی ہوگا کہ شاہ جی انسانیت کے پرستار اور انسان دوست تھے۔

شاہ جی اصطلاحی انداز کے بزرگ نہ تھے اگر موصوف "کان ابوہ صالحا" کی بنیاد پر اپنی زندگی کے قلعہ کی تعمیر شروع کرنا چاہتے تو بہت سے اجتماعی خلافت یافتہ" بزرگوں کو شکست دے جاتے

لیکن ان کی غیور طبیعت اور قلندری مزاج نے مخلوق خدا کو فریب و دھوکا دینا اور سادہ لوح مسلمانوں کے گھر اجاڑ کر اپنی بلڈنگ چمکانا گوارا نہیں کیا۔ میرے نزدیک شاہ جی کی عظمت کی دلیل ان کی بے ریا زندگی تھی ان کے ظاہر و باطن میں قائدانہ تضاد نہ تھا ان کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب کی مانند تھی جس کا کوئی باب پردۂ راز

میں نہیں تھا۔

وہ مرد قلندر مخلوق خدا سے نہیں خالق کائنات سے ہردم خوفزدہ رہتا تھا۔ ؎

قدر پہچانی نہیں اس گوہر دانا کی

شاہ جی صورتاً ظریف الطبع اور لطیفہ گو نہیں بلکہ مرثیہ گو معلوم پڑتے تھے لیکن ان کی گفتگو نہایت دلچسپ اور عالمانہ ہوتی تھی۔

ایک زمانہ تھا جب ان کے دلچسپ فقروں اور لطیفوں کی مثال دی جاتی تھی اور جو غریب ان کے فقروں اور لطیفوں کا نشانہ بنتا تھا اسے ہنستے بنتی نہ روتے۔

ہم خیال وہم مذاق بے تکلف دوستوں کی محفل ہوئی کوئی ان کی پسند کی بحث چھڑ جاتی پھر دیکھیئے

"انداز گل افشانی' تقریر"

شاہ جی آخر میں بالکل بجھ چکے تھے انقلاب زمانہ نے دل مرجھا دیا تھا۔ احساس تنہائی بڑھ گیا تھا۔

المختصر! دیس ہی میں پردیسی اور وطن ہی میں غریب الدیار ہوکر رہ گئے تھے۔ کبھی کبھی تنہائیوں اور خلوت کی صحبتوں میں ان کے دل ودماغ کے داغ کہن نمایاں ہوتے خود بھی آبدیدہ ہو جاتے، اور دوسروں کو بھی آبدیدہ کرتے لیکن بے بس تھے، مجبور تھے، شکست خوردہ تھے اور زندگی ہار چکے تھے۔

راقم الحروف نے پہلی دفعہ شاہ جی کو دفتر رسالہ دارالعلوم میں دیکھا

دوسری دفعہ کہاں دیکھا ان سے کیسے قریب ہوگیا یاد نہیں پڑتا راقم الحروف دارالعلوم کی رسمی تعلیم سے فارغ ہوکر جامعہ رحیمیہ (مرکز شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) میں تدریسی خدمت انجام دینے لگا تو شاہ جی کو اور قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ موصوف آل انڈیا ریڈیو کی دعوت پر دہلی تشریف لائے جامعہ رحیمیہ میں قیام فرماتے اور محترم علی محمد شیر میوات صاحب مدظلہ کے خصوصی مہمان ہوتے شاہ جی شیر میوات صاحب کی بلند حوصلگی وعالی ظرفی اور روایتی مہمان نوازی کی بڑی تعریف فرماتے اور ان کی قومی وملی خدمات کی بڑی قدر کرتے۔ مولانا اخلاق حسین قاسمی کے جامعہ رحیمیہ میں تدریس اور اہتمام کے تعلق پر خوشی کا اظہار کرتے تھے اور یہ فرماتے کہ مولانا اخلاق حسین قاسمی نے ولی اللہی خاندان کی قرآنی خدمات پر جو قابل قدر کام کیا ہے اسکی وجہ سے یہ اس جگہ اعزاز کے مستحق تھے۔

آخر دفعہ ۷ ستمبر ۸۳ء میں آل انڈیا ریڈیو کی دعوت پر دہلی تشریف لائے غالباً سیرت نبوی یا فلسفۂ قرآنی پر تقریر ٹیپ کرانی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد راقم الحروف کو کسی اہم ضرورت سے دیوبند جانا ہوا تو آستانہ انوری پر قدم بوسی کے لئے حاضر ہوا

شاہ جی حسب عادت بڑے خلوص ومحبت سے ملے اور پر تکلف ناشتہ کرایا۔ جب چلنے لگا تو فرمایا آل انڈیا ریڈیو سے دعوت نامہ آیا ہے جلد ہی آنے والا ہوں۔ میں برابر انتظار رہی میں تھا۔ مگر افسوس ان کو نہ آنا تھا، نہ آسکے۔

پھر کچھ ہی دنوں کے بعد مولانا محمد اسلام قاسمی مدیر الثقافۃ نے بتایا کہ شاہ جی صاحب فراش ہو چکے ہیں۔ یہ المناک خبر سنکر بڑا قلق ہوا۔

ملازمت بھی قید فرنگ سے کم نہیں۔ مدرسہ سے کسی طرح چھٹی لیکر دیوبند حاضر ہوا تو شاہ جی' شاہ جی نہ تھے۔ ان کی حالت زار دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ۲۹ نومبر ۸۳ء کو قومی آواز میں شاہ جی کی تصویر کے ساتھ یہ المناک خبر نظر سے گذری کہ شاہ جی ۲۷ نومبر ۸۳ء کو داعیٔ ملک عدم ہوگئے اور ہزاروں عقیدتمندوں اور نیازمندوں کو تڑپتے بلکتے ہوئے چھوڑ کر قبر کے گوشۂ تنہائی میں قیامت کی نیند سو گئے ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

مولانا رستم علی صاحب
استاذ جامعہ رحمانی مونگیر

کسی عظیم شخصیت کے وصال کی وجہ سے اگر اس دن کو منحوس قرار دیا جاتا تو ۲۷ر نومبر ۸۵ء کا دن نہایت ہی منحوس ہوتا لیکن اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے اسلئے ہم ۲۷ نومبر والے دن کو منحوس قرار دینے کے بجائے مشیت الٰہی پر رضا و رغبت کا اظہار کرتے ہیں۔

چلتے پھرتے کتب خانے، علامۂ بے نظیر، استاذ الاساتذہ مولانا انور شاہ کشمیری علیہ الرحمۃ کا علم وادب کا لگایا ہوا ایک انمول پودا جسے دنیا مولانا سید ازہر شاہ قیصر رح کے نام سے جانتی ہے۔ اجڑ گیا۔

مولانا سید ازہر شاہ قیصر رح سچے جانشین تھے اپنے والد محترم کے، مولانا ازہر شاہ قیصر رح بے نظیر ترجمان تھے اکابر دیوبند کے، مولانا مرحوم محافظ تھے علم وادب کے، مولانا مرحوم سچے نائب تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، مولانا مرحوم بہترین مبلغ و مفسّر تھے اسلامی احکام کے، مولانا مرحوم عمامہ بردار تھے بزرگان کرام کے، مولانا مرحوم ایک بہترین معلم علم وادب تھے جنھوں نے بہت سے افراد کو قلم پکڑنا سکھادیا، مولانا مرحوم ایک شخصیت ساز انسان تھے جنکی شخصیت سازی ملک کے گوشہ گوشہ میں کام کر رہی ہے۔ مولانا مرحوم کی نورانی مجلس میں علم کی کم مگر عمل کی باتیں زیادہ ہوا کرتی تھیں مولانا مرحوم ایک بہترین قدرداں انسان تھے جن کے یہاں بڑوں کا کامل لحاظ وادب تھا تو چھوٹوں پر شفقت و رحمت بھی بدرجۂ اتم تھی۔

ادارۂ دارالعلوم اور رسالہ دارالعلوم سے ہندوستان کا کون سا حلقہ ہے جو واقف نہ ہو؟ جس طرح ادارہ دارالعلوم حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رح کے زیر اہتمام درخشاں و تاباں ہوا ایسے ہی رسالہ دارالعلوم حضرت مولانا سید ازہر شاہ قیصر رح کے زیر ادارت مقبول خاص و عام ہوا۔

کسی شخص کے انتقال پر نوحہ کرنے اور گریباں چاک کرنے کی شریعت اجازت دیتی تو اب تک کتنے محبین متوسلین، اعزا و اقرباء کے گریبان چاک ہو چکے ہوتے لیکن چونکہ شریعت اجازت نہیں دیتی اسلئے رضا بالقضاء کو گلے لگانا پڑتا ہے۔

مولانا سید ازہر شاہ قیصر رح کے سانحہ ارتحال کا غم تقریباً تمام ہی علماء، ادباء اور صحافیوں کو ہے ہمارا غم الفت و محبت اور عقیدت کی نشاندہی ضرور ہوتا ہے لیکن محبت کا صحیح اظہار اس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم قرآن خوانی کا اہتمام کریں جگہ بجگہ تعزیتی اجلاس ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات کو بلند کرے ان کی لغزشوں کو درگذر فرمادے اور ان کی تصنیفات "حیات انور" "متفرقات" ——

(باقی مضمون صـ ۶۹ پر)

موت العالِم موت العالَم

حکیم سید مسعود احمد عباسی مبقر
امروہوی

آہ! مولانا سید ازہر شاہ قیصر،
یکے از من جملۂ خاصانِ ادب، جو کل تک یکے از باقیات و صالحات فن ادب و قائدان انوری کی نورافشانی کا مظہر تھے، راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کی رحلت پر بے ساختہ کہنا پڑا۔

"موت العالِم موت العالَم"

مولانا مرحوم نے نصف صدی تک دیوبند کی مقدس سرزمین کو اپنے خونِ جگر سے جس طرح سرسبز و شاداب کیا اس کی آئینہ دار اُن کی وہ تخلیقاتِ بیش بہا ہیں جو بشکل نثر و نظم ہمارے سامنے موجود ہیں۔ الفاظ و معانی صحافتی دسترس، نکتہ دانی، نکتہ شناسی جیسی عظیم و عمیق انکار یا کبھی فراموش نہ کر پائیں گی۔

بقول فراقؔ گورکھپوری دنیا سے رخصت ایک دور کے خاتمہ کا موجب ہے تو ہمیں اس حقیقت کے اعتراف میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کہ مولانا مرحوم کی رحلت کے ساتھ ساتھ صحافت اور فن ادب کا ایک زریں باب ختم ہوا۔

مولانا مرحوم کی ذات گرامی درحقیقت درج ذیل مصرع کا بعینہ مظہر تھی۔

یہ زباں اب نہ رہے گی بخدا میرے بعد

خدا کرے کہ مولانا مرحوم کی شب و روز کی کاوشات جگری باقیات و صالحات خاندان انوری کے لیے مشعلِ راہ بنیں اور اس عالی نسب خاندان کے کارہائے نمایاں بہ ہر عنوان منظر عام پر آتے رہیں۔

مولانا مرحوم کے اوصاف حمیدہ و خداداد صلاحیتوں پر رشتۂ فکر کی گرہیں کھولنا دراصل جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ آپ کی ذات عقدہ کشائے گیسوئے زبان تو تھی ہی اس کے علی الرغم آپ پر زبان کے اسرار سربستہ عیاں تھے جن کا مظہر ایک صیقل شدہ آئینہ کی شکل میں مرحوم کی تخلیقات ہیں۔ انشاء پردازی میں جہاں مرحوم کو یدِ طولیٰ حاصل تھا وہاں فن شعری پر بھی آپ کی دسترس آپ کا طرۂ امتیاز بن کر سامنے آئی۔

مولانا مرحوم کی مرنجاں مرنج شخصیت کو اہالیان ادب ان کی تخلیقات کے آئینہ میں دیکھتے رہیں گے جس میں اس نکتہ رس ہستی کی غیر معمولی ذہانت و تدبیر کے خط و خال نمایاں طور پر بہ وضاحت تمام دکھائی دیں گے۔

راقم الحروف کی یہ خواہش ہے کہ مرحوم کی تخلیقات کے عنوان سے آپ کے فن پر مکمل دسترس کی فکر ہر کس بقدر ہمت اوست کے مطابق محیط کرے

وما توفیقی الا باللہ

میرے تائے ابا ؒ

مولانا احمد خضر شاہ مسعودی
فاضل دیوبند
ایم، اے

بعض شخصیتیں ایسی پرکشش اور اتنی جاندار ہوتی ہیں کہ ان کے نقوش تادیر بلکہ کبھی کبھی تو ہمیشہ دل و دماغ پر مرتسم ہو کر رہ جاتے ہیں اور ان کی عظمت و رفعت کا سکہ مدتوں تصورات و خیالات کی دنیا میں رائج رہتا ہے۔

تائے ابا حضرت مولانا سید ازہر شاہ قیصر تغمدہ اللہ بغفرانہ کی شخصیت میرے لئے اتنی ہی پرکشش اور اتنی ہی جاندار تھی اور انکی محبت میرے قلب و دماغ میں جاگزیں۔ میرا بچپن محلہ خانقاہ ہی میں گذرا اور میں ان کی گود میں خوب خوب کھیلا اور شعور جب بالغ ہوا تو ان کے خیالات کے مطالعہ کا بھی موقعہ ملا۔ ان کو جانچا پرکھا اور رکھا پایا میں نے والد محترم مولانا انظر شاہ صاحب سے بارہا سنا کہ مضامین کا سلیقہ ہمیں بھائی نے سکھایا بلکہ ابتداء میں ان سے اپنے مضامین پر اصلاح بھی لی۔

عجیب بات ہے کہ سنہ ۱۹۷۵ء میں گجرات کے ایک اسکول میں مضمون نویسی کا مقابلہ ہوا عنوان تھا "سیرۃ النبی" انعام کافی رکھا گیا تھا۔ بچپن میں انعام کے شوق میں میں نے بھی چند الٹی سیدھی سطریں لکھیں اور تائے ابا کے پاس دکھانے پہونچ گیا۔ بھلا کہاں میں اور کہاں ان کا قلم انھوں نے یکسر تمام مضمون پر قلم چلادیا۔ مجھے سخت رنجیدہ اور اداس دیکھ کر خود اپنے قلم سے ایک مضمون تحریر کردیا میں نے وہ مضمون اپنے نام سے مقابلہ میں روانہ کردیا چنانچہ وہ مضمون نمبر اول قرار دیا گیا اور انعام کی رقم بھیجنے کا وعدہ کرلیا گیا۔ اب ادھر سے تاخیر اور ادھر اضطراب اور پریشانی۔ میں نے منتظمین کو خط لکھا کہ آپ جلد میری رقم بھیجدیں۔ ان کا جواب آیا کہ آپ خاطر جمع رکھیں آپ کو رقم مل جائے گی۔ خوب یاد ہے کہ میں وہ جواب لیکر ظہر بعد بھاگم بھاگ دفتر رسالہ واقع دارالعلوم پہونچ گیا۔ وہ حسب عادت دیکھ کر مسکرائے اور کہنے لگے کہاں پھر رہا! میں نے خط ان کے سامنے رکھ دیا انھوں نے پڑھا کہنے لگے کیا پریشانی ہے؟ میں نے کہا بھائی "یہ خاطر جمع" کیا چیز ہے اور اس کو کہاں جمع کراؤں تاکہ رقم مجھے مل جائے — یہ سنتے ہی ان کا قہقہہ نکل گیا دیر تک ہنستے رہے پھر میرا ہاتھ پکڑ کر اہتمام کے دفتر میں لے گئے۔ سید محبوب صاحب رضوی و مولانا عبدالحق صاحب پیشکار وغیرہ تشریف رکھتے تھے ان کو تمام واقعہ سنایا اور سب سے مل کر خوب لطف لیا، پھر مجھ سے کہنے لگے خاطر جمع، اطمینان رکھیں کے معنی میں ہے — تو یہ تھی ہماری قابلیت اور صلاحیت آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ کہاں سے ہم نے ان سے راہ نمائی حاصل کی تھی — پھر میں کوئی مضمون الٹا سیدھا لکھتا تو سیدھا ان ہی کے پاس لے جاتا دو تین مرتبہ سنتے بہت حوصلہ افزائی کرتے اور بہت انہماک سے کام لیتے اور نئے نئے عنوانات بتاتے کہ اس عنوان پر مضمون لکھو فلاں فلاں کتاب میں مواد مل جائے گا۔ یہاں تک کہ خود تمام مواد فراہم کردیتے۔ ان کے مزاج میں عجلت کافی تھی چنانچہ فوراً کہدیتے "لکھو میں بول رہا ہوں" اور پھر وہ انشاء پردازی کا حق ادا کردیتے۔ ان کا حافظہ غیر معمولی

طور پر قوی تھا مضامین کا استحضار اور الفاظ کی ندرت اور موضوع کا تسلسل باقی رکھنا ان کا کمال تھا وہ ہر چیز کو اپنے انداز پر سوچتے اور بےباکانہ اسکا اظہار کر دینے کے عادی تھے۔ فیض احمد فیض ہندوستان آئے تو یہاں کے اخبارات نے ان کو حد سے زیادہ اچھالا، اور ان کی تعریف و توصیف میں مبالغہ آرائی کی جانے لگی۔ فیض کی تعریف کے غلغلوں میں منفرد اور جچی تلی رائے صرف تائے ابا مرحوم کی تھی جس کا اخبارات میں انھوں نے برملا اظہار کر دیا اور لکھا کہ فیض اُس پائے اور اُس صف کے شاعر نہیں جس کا زبردستی ان کو مستحق ٹھہرایا جارہا ہے۔

عصری مسائل پر انکی نظر بہت گہری تھی ملکی سیاست پر نہایت صحتمند اور متوازن تبصرے کیا کرتے تھے —— شخصیات ان کا من پسند موضوع تھا ان کو سینکڑوں شخصیتوں سے ملنے اور ان کے خیالات جاننے اور سمجھنے کا موقعہ ملا تھا چنانچہ کسی بھی عالم، فاضل، ادیب، شاعر کے بارے میں ان سے دریافت کیا جاتا تو فوراً ان کے واقعات سنانے لگتے اور ان کی پیدائش سے لیکر موت تک زندگی کے تمام نشیب و فراز بتلایا کرتے تھے ہزاروں شعر ان کو ازبر تھے اور وہ بلا تکلف سنانے پر قادر تھے۔

میرے دادا' اور اپنے والد حضرت امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی ذات سے ان کو عشق تھا۔ کسی نہ کسی رُخ سے وہ مضامین میں ان کا تذکرہ کرتے تھے، کہتے تھے کہ ابا جی کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں، یہ تو میں برکت کے لئے ان کا تذکرہ کرتا ہوں۔

ہمیں بھی کہتے کہ ابا جی پر تحقیقی مضامین لکھو۔ اپنی وفات سے نو ماہ قبل انھوں نے مجھ کو آخری مضمون قلمبند کرایا عنوان تھا "علامہ سید انور شاہؒ" اور "ڈاکٹر اقبال" میں نے قلم سنبھال لیا اور انھوں نے بولنا شروع کر دیا۔ اول اقبال کی شخصیت، اس کی تعلیم، پروفیسر آرنلڈ کا اقبال پر گہرا تاثر۔ اس کے بعد حضرت شاہ صاحب سے ان کی عقیدت و وابستگی۔ نیز دونوں کی ملاقات —— بخدا وہ بول نہیں رہے تھے بلکہ الفاظ انکی زبان سے پھسل رہے تھے۔ ادب و انشاء کے گوہر آب دار تھے جو اُن کی زبان سے جھڑ رہے تھے یہاں تک کہ دادے ابا کا تذکرہ جب طویل ہوا تو ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

تقریر پر ان کو حیرت انگیز طریقہ پر قدرت حاصل تھی۔ خوب یاد ہے کہ سنہ ۱۹۷۷ء میں مرحوم شیخ عبداللہ نے کشمیر میں حضرت علامہ سید انور شاہ صاحبؒ پر عدیم المثال سیمینار منعقد کرایا تو ہندوستان کے چیدہ و چنیدہ علماء دیدہ ور محقق اور ممتاز اہل قلم و دانشوروں کا قافلہ کشمیر کی سرزمین پر پہنچ گیا۔ ایک جمعہ کو میر واعظ کشمیر مولانا فاروق صاحب نے سرینگر کی جامع مسجد میں بعد جمعہ اچانک ان کی تقریر کا اعلان کر دیا۔ وہ شیروں کی طرح منبر پر بیٹھ گئے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پیوست کرلیں اور سیرت نبی کریم ﷺ پر ایک گھنٹہ برجستہ و نہایت شستہ تقریر کی، قرآنی آیات و احادیث نبویؐ اور روایات کا انبار لگا دیا اور اس کثرت سے کہ سامع کو اپنی کم سوادی کا احساس ہونے لگے۔

انھوں نے یہ آٹھ ماہ نہایت کرب و بے چینی میں گزارے مجھے بہت کم ان کی خدمت کی سعادت نصیب ہوئی بلا مبالغہ ہمارے مختصر خانوادہ میں ان کو سب سے زیادہ مجھ سے تعلق تھا۔ گھنٹوں میرے ساتھ مختلف موضوعات پر بات کرتے، راستہ میں ملتے تو ہاتھ پکڑ کر گھر لیجاتے اخبار و رسائل جن میں ان کے مضامین شائع ہوتے

وہ دیتے پھر پوچھتے کہ "کیسا لگا مضمون"۔ میں بھی ان سے بچپن ہی سے بے حد مانوس تھا۔ میں شام کے وقت احباب کے ساتھ خانقاہ جاتا اور ان کو بیٹھک میں بٹھا کر ۵ منٹ میں آنے کا وعدہ کرتا، اندر تائے ابا سے ملاقات ہوتی تو میں انکی گفتگو میں منہمک ہو جاتا۔ گھنٹوں بیٹھا رہتا تھا۔ باہر احباب شور مچا مچا کر واپس چلے جاتے؛

میں آخر میں چار، پانچ دن ان کے ہمراہ مظفر نگر میں جہاں وہ زیر علاج تھے نرسنگ ہوم میں رہا صبح ہی وہ اخبار کے لئے اصرار شروع کر دیتے تھے۔ خود پڑھنے پر قادر نہ تھے تو تمام خبریں سنتے تھے

میرا نومبر میں والد صاحب کے ہمراہ اچانک پاکستان جانے کا پروگرام بن گیا وقت کم تھا اور دہلی سے صبح ۴ بجے ہوائی جہاز سے روانگی تھی، نہایت عجلت میں میں شب کو ساڑھے دس بجے ان کی مزاج پرسی کرنے گیا یہ میری اس ناسوتی عالم میں ان سے آخری ملاقات تھی۔

بارہ روز بعد پاکستان ان کی وفات کی اطلاع ملی۔ تائے ابا! مجھے بہت دکھ اور افسوس ہے کہ میں آپ کے آخری سفر میں آپ کو کاندھا بھی نہ دے سکا، اب بتائیے میں کیسے "خاطر جمع رکھوں"۔ بس یہی وجہ قلم سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں میرا تاثراتی مضمون آپ کی ذات سے گہری وابستگی کا آئینہ دار ہے۔

میری بارگاہ رب العزت میں دعا ہے کہ خدا تعالیٰ آپ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور آپ کے مراتب کو بلند کرے۔

آمین یا رب العالمین۔

والد مرحوم کے انتقال پر ملک کے طول و عرض اور بیرونی ممالک میں تعزیتی جلسوں اور ایصال ثواب کا اہتمام کیا گیا ایسے تمام اداروں اور انجمنوں نے ہمیں رپورٹیں ارسال کیں۔ ہم باوجود کوشش کے ان تمام چیزوں کو شائع کرنے سے معذور ہیں۔ ایک تو شاہ نمبر کی تیاری میں کافی وقت لگ گیا۔ دوسرے اس کی ضخامت اس قدر ہو گئی کہ یہ تمام رپورٹیں اس نمبر میں نہ آسکیں۔ جس کے لئے ادارہ معذرت خواہ ہے
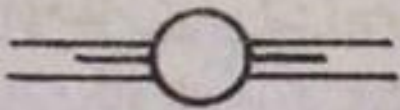
"شاہ نمبر" کے لئے ہمارے چند مخلص شعراء اور قلمکار حضرات نے اتنی تاخیر سے اپنی تخلیقات روانہ کیں کہ وہ نمبر کی زینت نہ بن سکیں۔ جس کا ادارہ کو افسوس ہے۔

انشاءاللہ ان کی یہ نثری اور منظوم تخلیقات آئندہ "طیب" اور "اشاعت حق" کے صفحات پر ضرور شائع کی جائینگی۔ ادارہ ایسے تمام حضرات کا ممنون ہے جنھوں نے اپنی تخلیقات سے بعد از وقت ہی سہی ادارے کو نوازا اور احسان فرمایا۔

(مدیر)

ایک عظیم انسان — مولانا سید ازہر شاہ قیصرؒ

جناب عبید اقبال عاصم صاحب
مدیر پندرہ روزہ اجتماع دیوبند

علم و فضل کے درخشندہ ستارے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ، تاریخ دانی کے آخری سند مانے جانے والے سید محبوب رضوی مرحوم رحؒ دار العلوم کی ایک عہد تاریخ کو اپنے سینے میں رکھنے والے مولانا عبد الحق، دیوبند اور دار العلوم کو ایک دھاگے میں پرونے والے مولانا محمد عثمان رحمہم اللہ کی وفات کے بعد دار العلوم کے عہد کہنہ کی اس تاریخ کا باب ۲۷ نومبر ۸۵ء کو ازہر شاہ قیصر کی وفات سے بند ہوگیا جو گذشتہ پچاس سال سے اپنے جواہر پاروں سے تشنگانِ علوم کو سیراب کر رہا تھا۔

ازہر شاہ قیصر کا انتقال ہوگیا، بظاہر ایک معمولی خبر ہے۔ اس کا بغور جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ صرف ایک شخص کی نہیں بلکہ ایک دور کے خاتمہ کی خبر ہے۔ ازہر شاہ قیصر اس شخصیت کا نام ہے جس نے اپنے قلم سے اردو ادب کی عرصۂ دراز تک خدمت کی اس طریقہ پر اردو ادب کا ایک محسن وفات پاگیا۔ ازہر شاہ نے چالیس سال تک دار العلوم دیوبند کو اپنی قلمی کاوش و کاہش سے بام عروج تک پہنچایا۔ کہا جائے گا کہ دار العلوم کے خادم کا انتقال ہوگیا۔ ازہر شاہ قیصر نے اپنی زندگی کے آخری ایام ظالموں کے ظلم کا اپنی کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہوئے اور اپنی تمامتر صلاحیتوں کے باوجود اپنے قلم پر پابندی عائد کر کے اس ظلم کا جواب جس ہمت اور صبر کے ساتھ دیا اور اسی عالم میں حسرت و یاس کی تصویر بن کر دنیا کی نظروں سے اوجھل ہوگئے، اس پر یہی کہنا مناسب ہوگا کہ ایک مظلوم کی موت ملت کے ان ظالموں کے ہاتھوں ہوئی جو تقریباً ۸۵ خاندان کے سینکڑوں افراد پر اپنی فرعونی و طاغوتی طاقتوں کا سہارا لے کر اقتصادی حملے کر کے تمام صلاحیتیں مفقود کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

ازہر شاہ قیصر کی مجلسیں، ان کا دفتر دار العلوم ان کے احباب و اقربا . . . .
سب ان کی زندگی کے ایسے انمٹ نقوش ہیں جو عرصۂ دراز تک ذہنوں سے فراموش نہیں ہوسکتے۔ ان پر کبھی کوئی کتنا ہی بڑا غم کیوں نہ پڑا ہو اس کو انھوں نے ہنسی مذاق کی طرح لیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ زندہ دل اور رونقِ محفل تصور کیے جاتے تھے۔

شاہ صاحب کی شخصیت میں اس بلا کی جاذبیت اور کشش تھی کہ ان کی مجلس میں جو ایک دفعہ چلا جاتا وہ انھیں کا ہو کر رہ جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ اگر ایک طرف جناب مولانا عبد الحق صاحب پیشکار دار العلوم دیوبند، مولانا محمود احمد گل

صاحب سابق ناظم تنظیم و ترقی، مولانا محمد عثمان صاحب سابق چیرمین دیوبند اور سید محبوب رضوی رح جیسے بزرگ اُن کے مجلس نشین تھے تو دوسری طرف جناب مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی، مولانا عبدالروف عالی صاحب مولانا عبداللہ جاوید صاحب، قاری عبداللہ سلیم صاحب جیسے متوسط العمر بھی ان کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔
حضرت شاہ صاحب بے انتہا خصوصیات کے مالک تھے ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ جو ان کو کہنا ہوتا وہ برملا کہتے اور بغیر کسی حیل و حجت اور مصلحت پسندی کا حیلہ تراشے بنا کہتے۔ اسی باعث ان کو اپنی زندگی میں اکثر و بیشتر پریشانیاں بھی اٹھانا پڑیں۔

جو کام ان کو سونپ دیا جاتا اُسے وہ وقت سے پہلے ہی مکمل کرنے کے لئے اپنی تمام تدابیر صرف کر دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ۲۵ سالہ دورِ ادارت میں رسالہ دارالعلوم صرف ایک بار تاخیر سے شائع ہوا۔

دارالعلوم دیوبند کے قضیۂ نامرضیہ کے بعد حضرت شاہ صاحب کی طبیعت بجھی بجھی سی رہنے لگی تھی، انھوں نے دارالعلوم سے حد درجہ لگاؤ اور عقیدت کی خاطر پہلے حتی المقدور یہی کوشش کی تھی کہ کسی بھی طرح دارالعلوم سے الگ نہ ہوں — لیکن معاندین نے گوارا نہیں کیا۔ ان کا مذاق اور طبیعت اندرونی طور پر بالکل پژمردہ ہو گئی اور وہ زندگی سے مایوس ہو گئے۔

جولائی ۱۹۸۳ء میں طیب ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیرِ اہتمام حضرت حکیم الاسلام پر ایک علمی سیمنار وسیع پیمانے پر منعقد کرنے کا پروگرام بنا اس سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب کے مفید مشورے لینے کے لئے شاہ صاحب کے پاس جانا پڑا یہی شاہ صاحب سے پہلی ملاقات تھی اور یہیں پر میں شاہ صاحب کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ شاہ صاحب نے میرا بازو پکڑ کر فرمایا کہ بیٹے! کام تم بہت ہمت کا کر رہے ہو لیکن یاد رکھنا میرا تجربہ یہ ہے کہ تم کو اس منزل تک پہنچنے سے پہلے تمھارے اپنے ہی تمھاری ٹانگ گھسیٹ لیں گے، اور تم منزل تک نہیں پہنچ پاؤ گے شاہ صاحب کا یہ تجربہ چند ہی دنوں بعد عملی طور پر سامنے آگیا۔

بہرحال یہ تو شاہ صاحب کا ضمنی تذکرہ تھا دارالعلوم کے غم نے ہی ان کی زندگی کو گھن کی طرح چاٹا اور لاکر موت سے ہمکنار کر دیا۔ ان کی زندگی میں یاسیت اس حد تک آچکی تھی کہ وہ موت سے قبل ڈاکٹروں اور اپنے عزیزوں سے کہتے تھے کہ تم میرے زندہ رہنے کی کوشش کر رہے ہو اور میں موت کی دعا مانگ رہا ہوں۔

اس وقت شاہ صاحب رح ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کی قلمی کاوشیں اور ادبی تحریریں انھیں تادیر زندہ رکھیں گی۔ بقول ذوقؔ

رہتا قلم سے نام قیامت تلک اے ذوقؔ
اولاد سے ہی سلسلہ ہی پشت دو چار پشت

برادرِ عزیز

نسیم اختر شاہ قیصر کی خدمت میں

ماہنامہ طیّب کا شاہ نمبر نکالنے پر

نیک خواہشات اور دلی مبارکباد

حسن احمد صدیقی

صدر

ادارہ خدمتِ خلق دیوبند (رجسٹرڈ)

رفتید ولے نہ از دل ما

مولانا مفتی جمیل الرحمن قاسمی ہاپوڑ

آج مولوی محمد صابر سیتا مڑھی متعلم دورۂ حدیث وقف دارالعلوم دیوبند، ہاپوڑ آئے ان کی زبانی حضرت مولانا سید ازہر شاہ قیصر صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کے سانحۂ ارتحال کی خبر شہر میں پھیلی۔ ایسی اندوہناک اور دل خراش خبر کہ ہر آنکھ نم ہو گئی ہر دل مضطرب ہو گیا اور ذہن و دماغ مبہوت و پریشاں، اور اعضا و جوارح پر لرزہ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ مدرسہ رحمانیہ عربیہ اور دیگر مکاتب و مدارس بند ہو گئے اور علماء و طلباء قرآن خوانی اور ایصال ثواب میں مصروف ہو گئے۔

غفر اللہ لہ واسکنہ فی فسیح جناتہ

حضرت مولانا سید ازہر شاہ قیصر مرحوم کی پُربہار شخصیت سے کون واقف نہیں۔ علم و حکمت، منطق و فلسفہ، ادب و صحافت، نثر و نظم ہر فن میں یکتائے روزگار تھے۔ نسبت اتنی قوی اور اعلیٰ کہ برصغیر اور ایشیا افریقہ اور بلاد یورپ کے تمام ارباب علم و فضل اس مقدس خانوادے کے بالواسطہ یا بلاواسطہ رہین منت ہیں۔ متکلم اسلام علامۂ دہر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر فرزند ہونے کے ساتھ ان کے علوم و معارف کے امین اور ان کے اخلاق عالیہ کا جیتا جاگتا نشان تھے ان بلند بالا کمالات کے ساتھ ظرافت، بذلہ سنجی اور سادگی نے ان کی ذات منظہر صفات کو چار چاند لگا دئے تھے۔ جرأت، بے باکی اور صاف گوئی میں اپنی مثال آپ تھے

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے اصرار پر اپنی تمام علمی، ادبی صلاحیتوں کو دارالعلوم کے لئے وقف کر دیا ماہنامہ دارالعلوم کے ۴۲ سال ایڈیٹر رہے اور دارالعلوم کے علمی دینی اور تاریخی لٹریچر کو مرتب کرنے میں اپنا گرانقدر تعاون پیش فرماتے رہے رسالہ دارالعلوم کو مقبول بنانے میں ان کی کاوشں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

مزاج میں استقامت اور وفا شعاری درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ مرکز دارالعلوم میں کیسے کیسے انقلاب آئے۔ تیز و تند آندھیاں چلیں اچھے اچھے صاحب فضل و طریقت جادۂ مستقیم کو چھوڑ بھاگے، مصلحت کوشی کو ترجیح دی اور وقت کے چیلنج کا مقابلہ نہ کر سکے۔ مگر حضرت شاہ صاحب رح کو کوئی منفعت یا وحشت لرزہ براندام نہ کر سکی۔ ترغیب و ترہیب کے نسخے اور فارمولے ان کے پائے استقلال کو متزلزل نہ کر سکے۔ انھوں نے حق کو حق اور باطل کو باطل کہا اور کبھی سمجھوتے یا سودے بازی کے لئے تیار نہ ہوئے۔۔

بقول اقبال رح ؎

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

حضرت شاہ صاحب مرحوم مردان حق کی اِن صفات سے آراستہ تھے۔ مولانا سید محبوب رضوی صاحبؒ، مولانا عبدالحق صاحبؒ، مولانا محمد اسلم قاسمی مولانا محمد عثمان صاحبؒ، مولانا قاری عبداللہ سلیم صاحب اور مولانا ظفیر الدین صاحب اکثر و بیشتران کے شریک بزم رہتے اور شعر و سخن اور نکتہ فہمی اور بذلہ سنجی کی محفلیں گرم رہتیں۔ بزرگوں کا احترام اور چھوٹوں پر شفقت و عنایت کا ماحول دیکھنے میں آتا۔ ایک ساعت اراکین شوریٰ اور قائدین ملک و ملت کے ساتھ بے تکلف دوسری ساعت ہم عصروں اور دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق، اور تیسری ساعت ہم جیسے خوردوں کے ساتھ تکلف برطرف راہ و رسم، مولانا مرحوم کا امتیازی وصف اور روایاتِ سلف کا جیتا جاگتا انداز بڑا پرکشش معلوم ہوتا۔ ؎

جمع ہیں تجھ میں سب وصف ہنر اے مجمع خوبی
ملاقاتی ترا گویا بھری محفل سے ملتا ہے

حضرت مہتمم صاحب قدس سرہٗ ۱۷ رجولائی ۸۳ء کو رحلت فرما گئے۔ ان کی وفات حسرت آیات پر پوری علمی دنیا سوگوار تھی۔ حضرت شاہ صاحب پر یہ صدمہ برق علی البرق کی حیثیت سے اثر انداز ہوا۔ ان دنوں میرے نام ایک خط تحریر فرمایا:۔

برادر عزیز۔ السلام علیکم

حد ہو گئی کہ آپ دیوبند آئے اور مجھ سے ملے تک بھی نہیں کم از کم اتنا ہی ہوتا۔ ؎

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

حضرت قبلہ (مہتمم صاحب) کا حادثۂ رحلت ہمارے دلوں کا ایک ناسور ہے جو ساری عمر بہتا رہے گا۔

میرا دلی تقاضہ ہے کہ مرحوم کے نام سے رسالہ جاری کروں اور حضرت مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے اپنے اخبار "اشاعت حق" کا ایک نمبر نکالوں۔ آپ سے میری استدعا ہے کہ اس وقت اپنے تعاون کو حضرت قبلہ کا ایک حق سمجھیں۔ اس مظلوم ہستی کے متعلق کوئی چیز تو ایسی آجائے جس سے اس کی ساٹھ سالہ خدمات کی ایک جھلک دنیا کو دکھائی جا سکے ہم نے حضرت رحؒ کے نام پر اور جو قربانیاں دی ہیں یہ ایک معمولی سی قربانی اور سہی۔

والسلام سید ازہر شاہ قیصر
شاہ منزل محلہ خانقاہ دیوبند

پوری آب و تاب کے ساتھ اشاعت حق کا "حکیم الاسلام نمبر" نکالا اور پھر چند دن کے بعد ہی ماہنامہ "طیب" جاری کیا۔ اپنے ہونہار اور قابل فاضل فرزند جناب مولانا نسیم اختر شاہ قیصر کو اس کا مدیر مسئول بنایا۔ بحمداللہ دو سال کے قلیل عرصہ میں رسالے نے عوام و خواص کے حلقوں میں مقبولیت تامہ حاصل کی اور حکیم الاسلام رحؒ کے کلماتِ طیبات، تبلیغ دین، فقہ حنفی، ادبی فیچر اور عصر جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ دیگر مضامین سے رسالہ آراستہ کرکے وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاکست

حضرت شاہ صاحب کی وفات سے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا، ان کے خاندان کو، پسماندگان کو علم و ادب اور مہر و وفا کے دیوانوں کو، ایثار پیشہ اور باضمیر انسانوں کو۔ ایک تاریخ مٹ گئی ایک نسل کا خاتمہ ہو گیا۔ بقول میر ؎

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ان کا جسدِ خاکی تودۂ خاک میں پنہاں ہو گیا مگر ان کا کردار زندہ ہے ان کا ایثار اور قابلِ تقلید مقدس تذکار تابندہ ہے۔ اس نقشِ تابندہ کا اتباع اور پیروی نئی نسلوں کے حال اور مآل کو بہتر بنانے کی ضمانت ہے ۔

اسی کے نقشِ کفِ پا تلاش کر کے چلو
عروج ہوش کی دنیا تلاش کر کے چلو

رسالہ طیب کے پہلے ورق پر حضرت شاہ قیصر صاحب کا نقشِ اول جلوہ گر ہوتا تھا حسب معمول ماہ نومبر کے شمارہ میں بھی ان کا مضمون گرامی اسی عنوان سے سامنے آیا۔ مگر یہ نقشِ اول، آخری پیغام ثابت ہوا شاید یہ سطور لکھتے وقت فرشتہ اجل نے سرگوشی کی ہوگی کہ یہ سطور آخری سطور ہیں اور یہ نقش آخری نقش ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کا لہجہ نہایت پرسوز ہے۔ درد بھرا انداز ہے اور ملت اسلامیہ کی تباہ حالی کا منظر نگاہوں کے سامنے ہے آنسو رواں ہیں اور ان آنکھوں نے حقیقت افروز کو خامہ میں لیکر یوں رقمطراز ہیں۔ مضمون کے آخری حصہ کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

"نوجوانانِ قوم نے سنا ہوگا۔!

کہ مسلمان ابتدا میں بہت تھوڑے، مگر درد در ماندہ اور ان کی آواز بہت پست تھی، پھر چند ہی دنوں میں انھوں نے صحن عالم سے مذاہب باطلہ کی بساط الٹ کر رکھ دی اور شرق و غرب کی آخری حدود تک کفر و شرک کی اندھیریوں میں اسلام کا اجالا کر دیا۔ سیدنا حضرت عمر فاروق رض کے متعلق عیسائی مورخین تک نے اعتراف کیا ہے کہ ان کے دورِ خلافت میں مسلمانوں نے چالیس ہزار شہر اور قلعے فتح کر لئے تھے۔ جن کا اوسط فی قلعہ روزانہ پڑتا ہے۔ قیصر و کسریٰ کی وہ عظیم الشان سلطنتیں، جن کی وسعت شوکت اور دبدبہ وصولت کا اس چرخ نیلوفری کے نیچے کوئی جواب نہیں تھا۔ مسلمانوں کے آگے یوں پارہ پارہ ہو کر رہ گئی تھیں جیسے عاشق نامراد کے جیب و آستین۔"

— حضرت شاہ صاحب رح یاس و بیم کے اس ماحول میں نوجوان نسل کو امید و بیم کی کرن سمجھتے تھے ان کو توقع تھی کہ اگر نوجوانانِ ملت نے خود کو پہچان لیا تو قسمت کا فیصلہ بدل سکتا ہے اور قوم سربلند حاصل کر سکتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے نوجوانوں کے خوابیدہ ضمیر پر اسطرح دستک دی:۔

"نوجوان قوم نے کیا اپنی زندگی کے کسی لمحہ میں بھی یہ سوچنے کی تکلیف گوارا کی ہے کہ دورِ اول میں ہماری کشور کشائی، جہانبانی اور حکمرانی آخر کس چیز کی مرہون منت تھی۔ اور آج کی یہ ذلت و مسکنت اور بے عزتی و بے حرمتی کن گناہوں کی پاداش ہے۔"

افسوس کہ یہ درد بھری صدا ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی لیکن دردمندانِ قوم اور نوجوانانِ ملت کے لئے نقشِ دوام چھوڑ گئی۔ اور دعوت فکر و عمل پیش کر گئی۔

لِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

بجھ گئی اک اور ادبی شمع

مولانا ازہر شاہ قیصر رح کی شخصیت گوناگوں محاسن و خصائل اور بے شمار خوبیوں وصفات کی پیکر تھی مگر زیادہ تر آپ صحافت و کتابت کے میدان کے شہسوار نثر و شعر میں کامل دستگاہ، مضمون نگاری و انشاء پردازی میں ید طولیٰ، ادب کی تمام خصوصیات و لوازم کے تاجور شمار کئے جاتے تھے یہی وجہ ہے کہ آپ کے انتقال پر ملال سے مجالس ادب سونی سونی، بزم سخن پر غم کے آثار، ادباء کے مابین صف ماتم شعراء کے درمیان اشعار میں غم و الم پنہاں مضمون نگاروں کے قلم اشکبار، انشاء پردازوں کے چہرے دھواں دھواں۔ تصورات خیالات کے گلہائے رنگا رنگ خستہ و پژمردہ، تخلیات و تخلیقات کی چادریں سوگوار، الفاظ کی لڑیاں بکھری بکھری، شعر کی محفل میں یاس و حرماں کی لہر بپا، اخبار کے کالم کے کالم مغموم، ہر ایک کی زبان گویا اور چشم اشکبار کیوں نہ ہو، جبکہ حلقہ کا ادیب، پرانا فنکار، دکھتی رگ پر نظر رکھنے والا کہ جس کے رشحۂ قلم سے نکلے ہوئے ہزارہا ہزار مضامین یادگار رسم سنہ کے درمیان در شاہکار جن کے قلمی شہ پارے سے پوری ملت احسان بارہ کہ دینی ادبی نگارشات اور قلمی اشاریات اور صحافتی اسلوبیات تحریری کنایات علمی و فنی اسرار و رموز فصیح و بلیغ کلمات، پر مغز نثریات فی البدیہہ محاورات، شستہ و شگفتہ تعبیرات جب مفسر قرآن محقق دوراں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رح اور حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی رح کی نظروں کے سامنے آئیں تو دونوں بزرگ بے حد متاثر ہوئے اور محسوس کیا کہ اگر انھیں "دارالعلوم" جیسے علمی و معیاری رسالہ کی ادارت تفویض کی جائے تو مادر علمی دارالعلوم کی خوب خوب ترجمانی و عکاسی کر سکتے ہیں چنانچہ ان حضرات کی دلی خواہش کی تکمیل کے لئے رسالہ دارالعلوم سے منسلک ہو گئے۔ چہار دانگ عالم نے دیکھا کہ آپ سے جتنی توقع و امید تھی اس سے کئی گنا زائد آپ نے اپنے اداریوں کے ذریعہ "دارالعلوم" کو اوج فلک پر پہنچا دیا اور ملت کو ملت کے دھڑکتے ہوئے دل سے روشناس کرایا۔

ویسے تو آپ کے قیمتی مضامین ہند و پاک کے مشہور ترین رسائل و جرائد میں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوتے رہے مثلاً نیرنگ خیال، رسالہ سہاگ، رسالہ حور، رسالہ واعظ پیام اسلام، نور، زمیندار، احسان، انقلاب، شہباز دائرے پاکستان آزاد وغیرہ لیکن آپکی شہرت چہار سو عالم میں رسالہ دارالعلوم کے مدیر کی حیثیت سے بہت ہوئی آپکی طلاقت لسانی، برجستہ بیانی، الفاظ کی روانی زبان آوری کلام میں شگفتگی اپنی مثال آپ تھی دیکھنے میں سیدھے سادے منکسر مگر ستار کی طرح چھیڑنے پر انتہائی سنجیدگی و وقار کے ساتھ الفاظ و معانی اسرار و معارف کے موتی بکھیر دیتے پھول کی طرح نرم و نازک مگر سوز و گداز سے پُر۔ تمام ہی لوگ محسوس کرتے تھے کہ یہ خداداد صلاحیت ہے جسمیں کسب کا دخل بہت ہی کم تھا یہ خوبی ص

سید محمد ازہر شاہ قیصر ادیب اور ان کی مضمون نگاری

از علامہ انور صابری مرحوم

دنیائے نگارش اپنی اس خوش بختی پر جسقدر بھی فخر و مباہات کا اظہار کرے کم ہے کہ اس کے علم و اقتدار کو بلند کرنے کے لئے قدرت کے مبارک ہاتھوں نے شیخ الاسلام والمسلمین حضرت العلامہ سید محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہٗ کے جو عصر حاضر کے بے مثال محدث و مفسر اور ایسے وسیع النظر عالم تھے کہ اسلامی دنیا کے چپہ چپہ سے ہزاروں تشنہ کامانِ علم دشوار گزار راہوں کی تکلیف جھیل کر حضرت مرحوم کے آگے زانوئے تلمذ طے کرنے کے لئے آئے اور جنھوں نے اس پرآشوب دور میں اسلامی علم و عمل کی زندہ تصویر بنکر اسلام کی کبھی نہ فراموش ہونے والی خدمات انجام دیں، فرزندار جمند مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر کو پیدا کیا۔

میں جناب قیصر کو بخوبی جانتا ہوں ان کی زندگی اور ادبی و صحافتی زندگی کے دور فراز و بلند کو میری نگاہوں نے اچھی طرح دیکھا ہے۔ اگر کوئی شخص اکتسابی قوتوں کو بروئے کار لاکر کامیاب انشاء پرداز یا لائق مضمون نگار بنجائے تو یہ کوئی کمال نہیں بلکہ جو دماغ فطرتاً اس دولت عظمیٰ سے مالامال ہوتے ہیں ان کے رشحات فکر، ان کی کائنات تخیل کے جواہر پارے حسن و قبول کا وہ رتبۂ کمال حاصل کرتے ہیں جہاں غیر فطری ذوق رکھنے والے لوگوں کی رسائی دشوار ہوتی ہے۔ خدائے برتر و بزرگ کا احسان ہے قیصر قیود اکتساب سے بے نیاز اور بے پرواہ ہوکر پروان چڑھے اور آج ان کی قوت قلم اپنوں سے گذر کر بیگانوں سے بھی خراج تحسین وصول کر رہی ہے وہ ادیب ہیں اور بلند پایہ ادیب، وہ نثر نگار ہیں اور ہونہار نثر نگار، ان کی تحریریں ادب آموز، ان کا انداز نگارش درس آفریں، اسلامیت ان کی مضمون نگاری اور خود ان کی جان ہے اسلامی عنوانات پر انھوں نے آج تک جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی جگہ بیحد قابل قدر اور اس کا مطالعہ عالمگیر افادہ کا متحمل ہے — یوں تو انشاء پردازی کی ہر صنف پر جناب قیصر کو قدرت ہے۔ کئی سال سے وہ صداقت کا بہرۂ اسرار و لطائف مرتب کر رہے ہیں۔ اسرار اس کے شاہد ہیں کہ قیصر سنجیدہ و متین اور لطیف و معنیٰ خیز مزاحیہ نگاری کا بھی ایک خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔ لیکن قیصر کا زور قلم اسلامی عنوانات پر جو بہار آفرینیاں کرتا ہے خود قیصر کی پوری مضمون نگاری میں اس کا کوئی جواب نہیں وہ لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں اور بہت زیادہ لکھتے ہیں۔ زور بیان کی مدح و ستائش کے لئے خود لکھے

وہ مختلف مضامین جو صداقت کے خاص نمبر میں یکجا شائع کئے جا رہے ہیں داعی ہیں۔

سب سے زیادہ تعجب انگیز اور محیر العقول شے آپ کو یہ نظر آئے گی کہ قیصر ابھی زندگی کے ابتدائی دور میں ہیں، مگر ان کی پختگی نگارش پیرانہ سالی کی آئینہ دار ہے کوئی شخص ان کے مضامین سے قطعاً یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ اس کا لکھنے والا کوئی نوجوان مضمون نگار ہے۔

جہاں تک میری وسعتِ نگاہ کا تعلق ہے مجھے یہ عرض کرنے میں مطلق باک نہیں کہ قیصر جو آج نو عمری کے باوجود کہنہ مشق انشاء پردازوں کی صف میں نظر آ رہے ہیں اگر زمانہ کی ناسازگار ہواؤں سے انھیں سابقہ نہ پڑا اور وہ موجودہ فضائے جمود میں اپنے اصلی خدوخال کے ساتھ نمایاں ہوتے رہے تو مستقبل میں ان کی رسائیوں کے حدود بہت بلند ہوں گے اور بلاشبہ چشم عالم کو وہ مہر سماءِ علم و ادب اور اردو زبان کے بام فلک پر چمکنے والے ماہ تاباں نظر آئیں گے۔

یہ مجموعہ مضامین بھی اربابِ ذوق کو مکمل سامان بہجت و سرور پیش کرتا ہے اور اس قابل ہے کہ اربابِ ذوق اس کی اشاعت میں سرگرمی سے حصہ لیکر ایک نوجوان مضمون نگار کی حوصلہ افزائی کریں۔

بہت ممکن ہے کہ بعض احباب میری جانب سے شاکی نظر آئیں کہ میں نے ان چند سطور میں رسم و رواجِ عالم کے مطابق قیصر کا پورا پورا تعارف کیوں نہیں کرایا۔ میرے نزدیک کسی شاعر یا مضمون نگار کا تعارف خود اس کا کلام یا مضامین بہت عمدہ پیمانے پر کرا سکتے ہیں۔ قیصر کے تعارف کے لئے یہی چیز کیا کم ہے کہ وہ خاتم المحدثین، راس المفسرین، اجبالِ علم و عمل حضرت العلامہ مولانا سید محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند ہیں۔ اور بحمد اللہ صالح، باکمال، صاحب عزم و ارادہ اور اپنی خوبیوں کے لحاظ سے قابل قدر فرزند وہ دن اب دور نہیں کہ انشاء اللہ قیصر اپنے سلف کا حقیقی خلف بن کر قدیم و جدید قرائن علمیہ کا حقیقی حامل، اور ان کا زورِ قلم باطل کے جامۂ فکر کی دھجیاں بکھیر کر پیروانِ حق آگاہ کو حق کی شعاعِ نور کو

دور دور تک پھیلانے

میں امداد

دے گا۔

رہی دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

نوٹ مندرجہ بالا مضمون علامہ انور صابری مرحوم نے اخبار صداقت سہارنپور کے خاص نمبر "مضامین قیصر" کے لئے لکھا تھا۔ ہم صابری صاحب مرحوم کا یہ مضمون اور اس نمبر میں شامل صابری صاحب کی نظم ایک یادگار کی حیثیت سے شائع کر رہے ہیں۔

یاد رہے کہ اخبار "صداقت" سہارنپور اپنے دور کا مشہور اخبار تھا جس نے آج سے ۴۶ سال قبل مضامین قیصر نمبر شائع کر کے مولانا سید ازہر شاہ قیصر مرحوم کی ادبی و صحافتی خدمات کا بھرپور اعتراف کیا تھا۔.............

(مدیر)

مولانا
غلام نبی
قاسمی کشمیری

حضرت شہنشاہ قلم مولانا سید ازہر شاہ قیصر صاحبؒ کا سانحہ ارتحال کسی ایک خاندان یا ایک قبیلے کا درد نہیں ہے بلکہ یہ ایک مشترکہ درد ہے جسکو ہر صاحب دل محسوس کرتا ہے اور کرنا چاہیئے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی شخصیت ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت تھی ان کی جدائی کا درد و کرب بھی ہمہ گیر ہے حضرت شاہ صاحبؒ ہزاروں سے متجاوز ارباب قلم اور اصحاب فکر و فن کے مربی و محسن تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی ۴۵ سالہ تاریخی زندگی حضرت مرحوم کے تعارف کے لئے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اس سے بڑھ کر حضرت امیر المومنین فی الحدیث علامہ انور شاہ کشمیری رحؒ کے بڑے صاحبزادہ ہونے کی نسبت یقیناً ایک عالی نسبت ہے۔ یہ تین بلند نسبتیں ایسی ہیں جو حضرت شاہ صاحب کی شخصیت کو کسی بھی دور میں فراموشی کی نذر نہیں ہونے دینگی۔ وہ رجالِ کار کی تاریخ میں ایک ممتاز عنوان بیکر رہے ہیں اور انشاءاللہ رہیں گے۔

حضرت شاہ صاحبؒ لاکھوں میں ایک انسان تھے جنکی ادیبانہ یلغار، ہنرمندانہ قلم کاری اور فنکارانہ انشاء پردازی نے دنیاء ادب کو احساس و فکر کی وہ گرمی عطا کی جس کو ہر عہد میں محسوس کیا جاتا رہے گا۔ وہ مسلکِ دیوبند اور جماعت دیوبند کے ایک باحوصلہ، باہمت جراتمند اور وسیع القلب ترجمان تھے، وہ تاریخ کی پیداوار نہیں بلکہ وہ خود تاریخ ساز تھے۔ حضرت شاہ صاحب پر زبان وادب اور اسلاف دارالعلوم کی عظمت و شوکت کا ایک سنہری دور ختم ہوا وہ مسلح کے ٹمٹماتے دیئے کی دھندلی اور مدہم روشنی میں ایک فانوس تھے جس کے بجھ جانے کے بعد ایک تاریکی اور وحشت کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کو قدرت نے وہ محاسن و کمالات ودیعت فرمائے تھے جنکے فقدان کی اب ہمیشہ کے لئے دلوں میں حسرت موجود رہیگی۔

حضرت شاہ صاحبؒ مجسمۂ ذہانت و ذکاوت تھے جن کے خدوخال انکی شاندار صلاحیتوں کے آئینہ دار، انکے چہرے کی لکیریں ان کے فہم و فراست کی مشیر تھیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ کو رب العلمین نے بے پناہ کمالات و اوصاف سے نوازا تھا جو انشاءاللہ ان کے مقام شناس ارباب فکر کے نوک قلم سے منصۂ شہود پر آتے رہیں گے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کا سانحۂ ارتحال رہتی دنیا کے لئے ایک ناقابل تلافی حادثہ ہے مگر قدرت خداوندی کے سامنے تمام تر تدبیریں ہیچ ہیں۔ یہ ایک طے شدہ قانون خداوندی ہے جس سے مفر کہاں ممکن۔ ہر آنے والا جانے ہی کے لئے آتا ہے اس حد تک تو آہ و بکا اور فریاد و شیون بے معنی مگر فطرتی غم و الم ایک دوسری چیز ہے اسلئے یہ چند سطور بطور تعزیت رقم ہیں اللہ رب العالمین حضرت شاہ صاحبؒ کو غریق رحمت فرمائے ان کے درجات کو بلند فرمائے ان کی قبر کو نور سے منور فرمائے، تا حد نگاہ کشادہ فرمائے پسماندگان و متوسلین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

سید وجاہت شاہ انور
ایم۔ اے

بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

انسانی زندگی ہر پل اور ہر لمحے حادثات سے عبارت ہے۔ حادثہ معمولی ہو یا غیر معمولی۔ اس کے اثرات ایک زمانے اور ایک دور تک دیکھے اور محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ پھر ایسا حادثہ جس پر (ظاہری) کئی زندگیوں کا دار و مدار ہو ایک عرصہ اور ایک مدت تک دل و دماغ کو مفلوج کئے رکھتا ہے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سمٹ کر اور سکڑ کر رہ جاتی ہیں اور اس وسیع و عریض دنیا میں انسان تنہا اور اداس کھڑا رہ جاتا ہے۔

۲۷ نومبر کو جو حادثہ پیش آیا سات آٹھ ماہ سے زائد گذر جانے کے باوجود یقین نہیں آتا کہ ایسا ہو چکا ہے۔ مگر حقیقت حقیقت ہے اور کسی صورت میں اس سے فرار حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ مگر آج بھی یہ ہوتا رہتا ہے کہ

نیند اس سوچ سے ٹوٹی اکثر
کس طرح کٹتی ہیں راتیں اس کی

والد مرحوم نے بیماری کا ایک بڑا وقت گذارا۔ مارچ ۸۳ء سے لیکر نومبر ۸۵ء تک وہ مختلف بیماریوں اور امراض میں گھرے رہے، ہم نے راتیں جاگ کر گذاریں، دن بھاگ دوڑ اور دیکھ بھال میں گذرے۔ گو وہ ہر لمحہ زندگی سے دور، موت سے قریب ہوتے چلے جا رہے تھے اتار چڑھاؤ، کبھی مائل بہ صحت، کبھی حالت یکدم غیر، مگر ہمارے ذہن میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے روتا اور بلکتا ہوا یہ خاندان خود اپنے ہاتھوں سے انھیں ہزاروں من مٹی کے نیچے دفنا آئے گا۔

والد مرحوم نے زندگی کی جتنی بھی بہاریں اس عالم فانی میں گذاریں وہ ایک مقصد اور ایک نصب العین کے تحت گذاریں، وہ بڑے باپ کے بڑے فرزند تھے۔ فطری ذکاوت و ذہانت اور ذاتی مطالعے و مشاہدے نے ان کی تحریروں میں وہ پختگی اور بے ساختگی شروع سے پیدا کر دی تھی جو دوسروں کو سالہا سال کی محنت اور طویل ریاض کے بعد حاصل ہوتی ہے اور زندگی کی سانسیں ختم ہونے تک وہ اس مقام پر تھے جہاں سے بجا طور پر یہ اعلان کیا جا سکتا ہے کہ

رہ رہ کے لوگ مجھ کو پڑھیں گے ورق ورق
میں تجربات کے وہ سبق چھوڑ جاؤں گا

تحریر کے میدان میں انھوں نے اپنے قلم اور اپنی تحریروں کے وہ لازوال شہ پارے اپنے پیچھے چھوڑے جو بلاشبہ آنے والے وقت کا تجربات کا وہ ذخیرہ ثابت ہوں گے جنھیں زمانہ اپنے

سینے سے لگائے رکھنے پر مجبور ہو گا۔

ہم نے جو وصف ان میں سب سے نمایاں دیکھا وہ ہر حال اور ہر عالم میں ان کی زندہ دلی اور عزائم میں پختگی تھا۔ وہ حالات کی سختیوں، وقت کی یورشوں اپنوں اور غیروں کی زیادتیوں سے ہراساں اور مرعوب ہونے والی طبیعت کے مالک نہ تھے۔ رائے کی پختگی ارادے کی مضبوطی اور عمل کی راہوں میں اپنا مقام بنانے کی زبردست صلاحیت کے مالک تھے۔ ہر غم میں مسکرانا، ہر حادثہ پر قہقہہ لگانا اور ہر زخم پر خندہ زن رہنا ان کی عادت تھی۔ بیماری کے سخت ترین دنوں میں بھی انھوں نے کبھی تکلیف کا اظہار نہ کیا پوچھنے والے پوچھتے اور وہ بڑے اطمینان سے جواب دیتے کہ ٹھیک ہوں۔ پوچھنے والا مطمئن ہو جاتا حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ ؎

اس طرح تھا ہائے وہ زخم جگر پر خندہ زن
چارہ گر سمجھے کہ بس دردِ نہاں جاتا رہا

بیماریاں اندر ہی اندر بڑھتی رہیں، پھیلتی اور بڑھتی رہیں مگر انھوں نے کبھی یہ نہ کہا کہ آج بے چین ہوں آج بے قراری زیادہ ہے اور آج برداشت جواب دے رہی ہے۔ صبر، خاموشی اور دعا، یہ تینوں چیزیں آخر وقت تک ان کا سرمایہ رہیں اور یقیناً یہ تینوں چیزیں ان کے لئے ذخیرۂ آخرت بنیں گی۔

لکھنے کے لئے بہت کچھ ہے اور یاد کرنے کے لئے ہزاروں واقعات ہیں۔ کس واقعہ کا ذکر کریں کس بات کو لکھیں۔ گذرنے والا ہر لمحہ ان کی جدائی کا احساس افزوں کرتا ہے اور غم واندوہ کا ایک ماحول بن جاتا ہے، جہاں آنسوؤں کی جھڑی، آہوں کا سلسلہ اور چیخ و پکار کی آوازیں بلند ہونے لگتی ہیں کیا دنیا میں کوئی ایسا انسان بھی ہے جسے اپنوں کے بچھڑنے کا غم نہ ہو، اپنوں کے جدا ہو جانے کا احساس نہ ہو۔ اگر ایسا کوئی شخص نہیں تو کیا ہم اس سنگین غم سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ غم تو ہماری روح اور ہمارے جسم میں پیوست ہو چکا ہے اور سانس کی آمد و رفت کا یہ سلسلہ جب تک جاری ہے تب تک یہ غم بھی اسی طرح پھیلتا اور بڑھتا رہے گا۔

ہاں اتنا ضرور ہے کہ ان کی یادیں، ان کی زندگی، زندگی کی اداس اور تاریک راتوں میں ہمارے لئے "چراغ راہ" بنی رہے گی!

آغاز و انجام عالم کے متعلق انسانی عقل کے ان معرکۃ الآراء سوالات کا تسلی بخش جواب تو صرف مذہب نے دیا، اور مذہب ہی دے سکتا ہے کہ اس کی نگہ بصیرت پر محسوسات وغیر محسوسات کے سب اسرار پنہاں ظاہر، ہستی و عدم کی سب تفصیلات عیاں اور ماضی و مستقبل کی ہر ہر چیز روشن ہے!

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصرؒ

ولیم ہما میرٹھی۔ ایم اے۔ ایڈیٹر مسیحی دور

۲۷ر نومبر ۱۹۸۵ء، ۱۳ر ربیع الاول ۱۴۰۶ھ ۶ مگھر ۱۹۰۷ شاکا، ۳۰ کارتک ۱۳۹۳ فصلی، ۱۲ مگھر ۲۰۴۲ بکرمی، ۱۲ مگھر ۱۳۸۹ بنگلہ، بدھ کا دن جو زندگی اور موت کے یدھ کا دن تھا۔ حیات و ممات میں جنگ ٹھنی ہوئی تھی، زندگی اور موت کے کارزار میں صف بندوں کی لڑائی جاری تھی — معمول کے مطابق آج بھی سورج طلوع ہوا اور پھر غروب بھی ہوا لیکن اس تاریخی دن ایک آفتاب علم و ادب بھی غروب ہوگیا۔ صحافت کے آسمان سے ایک درخشاں ستارہ بھی ٹوٹ گیا — مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر جو گذشتہ آٹھ مہینوں سے سخت موذی مرض سے نبرد آزمائی کر رہے تھے اپنی عمر بھر کی بے قراری کے بعد آخر قرار پا گئے اور اس جہان فانی میں زندگی مستعار کے دکھ درد، غموں اور کلفتوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوٹ گئے۔

کہنے کے لئے یہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہوا روز ہمارے بنی نوع انسان پیدا بھی ہوتے ہیں اور مرتے بھی ہیں اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ لیکن مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر ایک ایسے عہد ساز انسان تھے جن کے وصال سے ایک علمی دور، ایک ادبی عہد بھی ختم ہوگیا۔

کہنے کے لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم روشن عقائد سے عبارت ہیں۔ ہمارا یہ ایمان ہے کہ ہم بچھڑنے والوں سے یوم قیامت میں پھر مل سکیں گے۔ انھیں پھر دیکھ سکیں گے۔ لیکن ایسے عہد ساز اور عظیم المرتبت سالار ادب کے اس طرح بے وقت اور ناگہانی کوچ سے اردو علم و ادب نوازوں میں صف ماتم بچھ گئی چاروں طرف سناٹا طاری ہوگیا۔

ہم شخصیت پرست نہیں ہیں بلکہ اہل کمالوں کے کمال فن کے مداح اور معترف ہیں۔ مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر بے حد روشن دماغ کے مالک تھے۔ مسائل حاضرہ پر انھیں پوری پوری دسترس حاصل تھی نثر بھی بڑی بے داغ قسم کی لکھتے تھے بنی نوع انسان سے بلا امتیاز مذہب و ملت انھیں بے حد محبت تھی، انسانیت پرست تھے۔

پندرہ روزہ "اشاعت حق" دیوبند کے، فروری

۱۹۸۲ء میں ان کا وہ اداریہ شائع ہوا ہے جو انھوں نے ۱۹۷۳ء سال کے شروع میں تحریر فرمایا تھا اس میں انھوں نے فلسفۂ حیات ومات، ملت پروری، خیرسگالی سے شرابور الفاظ میں اپنے نادر خیالات کا اظہار اس طرح فرمایا تھا۔

"عجیب بات ہے کہ وقت جوں جوں آگے بڑھتا ہے اسی طرح انسانی زندگی گھٹتی اور کم ہوتی ہے۔ مگر انسان عجیب فریب نفس میں گھرا ہوا ہے کہ ایک مہینہ ختم ہوکر دوسرا مہینہ اور ایک سال گذر کر دوسرا سال شروع ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ ہماری عمر بڑھی۔

بہرحال عمر گھٹے یا بڑھے وقت کو اسی طرح گذرنا اور زندگی کو یونہی آگے بڑھنا ہے ؎

کس کا خیال کون سی منزل نظر میں ہے
صدیاں گذر گئیں کہ زمانہ سفر میں ہے

۱۹۷۲ء اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ ختم ہوا اور ۱۹۷۳ء اپنی جدت آرائیوں اور عشوہ آفرینیوں کے ساتھ سامنے کھڑا ہے اور ہم اس نووارد مہمان کا استقبال کر رہے ہیں۔

خبر نہیں کتنی امیدیں، کتنی آرزوئیں اور کتنے ارمان ہیں جو ۱۹۷۳ء سے وابستہ ہیں کاش اس سال ویٹ نام میں پائیدار امن قائم ہو، فلسطینی مسلمانوں کو امن نصیب ہو۔ ممالک عرب توانائی اور ہوشیاری کی کروٹ لیں، ہندوستان پاکستان میں امن دوستی کے جذبات پیدا ہوں۔ امریکہ اور روس بڑی طاقتوں کی حیثیت سے انسانی زندگی کے لئے اپنے فرائض کا پاس کریں، ہمارا ملک اپنی ترقیات میں کامیاب ہو۔ اور ہمیں غریبی و بے روزگاری سے نجات ملے ـــ ہم ان پُرشوق تمناؤں کے ساتھ نئے سال کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اپنے ملک اور پوری انسانیت کو نئے سال کی مبارکباد دیتے ہیں۔" لے

جناب عتیق احمد صدیقی نے ان الفاظ میں ایسے عظیم و باکمال فنکار کے لئے عقیدت کے پھول چڑھائے ہیں۔

"آہ! ادب و صحافت کا سورج غروب ہوگیا۔

۲۷ نومبر ۱۹۸۵ء کو تیسرا پہر کتنا منحوس تھا جب ہمارے درمیان سے ہمارے دل کی دھڑکنوں اور قلم کے بے تاج بادشاہ مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر صاحب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زمین کے آغوش میں چھپا یا گیا۔

حضرت شاہ صاحب مرحوم نے اپنے قلم اور اپنی تحریروں سے سیاست و ادب، دین اور مذہب کی جو خدمت کی اس سے وہ ہزاروں لوگوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئے تھے انھوں نے اپنے آپ کو ملت، مذہب اور اردو کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ وہ ۶۵ سال کی عمر میں آٹھ ماہ کی طویل ترین اور سخت بیماریوں کے باوجود لکھنے پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ ماہنامہ طیب آپکی ادارت میں آخر وقت تک شائع ہوتا رہا۔ آپ کی کئی تصانیف ہیں اور کئی کتابوں کے مسودے وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ان کے چلے جانے سے ادب و صحافت کی دنیا میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ پُر نہ ہوسکیگا انسانی زندگی پانی کا بلبلہ ہے لیکن صفحۂ ہستی

لے پندرہ روزہ اشاعت حق دیوبند شمارہ ۱، فروری۔ سرورق

پر ایسے لوگ بھی نمودار ہوتے ہیں جن کے اُٹھ جانے سے ایک دنیا ویران اور سنسان ہو جاتی ہے۔" وغیرہم [لہ]

اپنے شفیق والد کی یاد میں ان کے دل بند جناب سید نسیم اختر شاہ قیصر کے دل پر کیا بیتی وہ ان الفاظ سے ظاہر ہے:۔

"۲۷ نومبر ۱۹۸۵ء کو ہمارے لئے اور اردو ادب کے لئے ایک ایسا سانحہ پیش آیا کہ جس کو بیان کرنے پر نہ دل قابو میں ہے اور نہ قلم والد مرحوم مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر اپنی آٹھ ماہ کی طویل ترین بیماری کے بعد اس جہانِ فانی سے عالم جاودانی کی طرف سفر کر گئے۔ اس طرح سے آٹھ مہینے کی بیقراری، بے چینی، اضطراب، تڑپ سب کچھ ختم ہو گئی۔ راتوں کا جاگنا، دنوں کی بھاگ دوڑ، صبح و شام دوائیوں کا سلسلہ، اب کرنے کے لئے کچھ بھی تو نہیں رہا۔ شاعر کے قول کے مطابق ہمارا یہی حال ہو گیا ہے۔ ؎

بس آج چین سے تیمار دار سو جائیں
مریض پھر نہ کہے گا سحر نہیں ہوتی

مگر چین کہاں، سکون کس کو، اطمینان کس کے پاس۔ کون مطمئن ہو سکتا ہے اور کون پاؤں پسار کر سو سکتا ہے؟ وہ چلے گئے مگر دل اور روح کی گہرائیوں میں غم کا جو طوفان اتار گئے وہ کہاں سونے دے گا وہ کہاں اس قابل چھوڑ گئے ہیں کہ مطمئن ہو سکیں۔ ان کی جدائی کا غم جسم میں دوڑتے ہوئے لہو کی ایک ایک بوند میں رچ بس گیا ہے۔ ان کو کیسے بھلائیں اور کیسے فراموش کریں۔" [لہ]

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر نے اردو میں اپنا سب سے پہلا مضمون معروف اخبار "زمیندار" میں لکھا تھا حالانکہ یہ ان کی کچی عمر کی تخلیق تھی جسے تجربات زمانہ اور علمی بصیرت کی آنچ درکار تھی لیکن ہونہار لاڈلے کے پاؤں پالنے ہی میں پہچان لئے جاتے ہیں۔ چنانچہ ظفر علیخاں جیسے پختہ کار ادیب اور شاعر نے یہ اندازہ لگالیا کہ جو لڑکا ۹ برس کی کم عمری میں ایسا مضمون لکھ سکتا ہے وہ ضرور آگے چل کر مینار صحافت کے کنگورے پر جلوہ افروز ہو سکتا ہے۔ یہ مضمون مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر کے ادبی سفر کی انتہائی نیک اور مبارک فال تھی چنانچہ اٹھارہ اُنیس برس کی عمر سے انھوں نے باقاعدہ لکھنا شروع کر دیا اور تقریباً پچاس سال تک وہ اردو علم و ادب، دین و مذہب، سیاست و ثقافت پر انتہائی مستند مضامین لکھتے رہے ان گراں مایہ مضامین نے ملک کے کونے کونے میں اور بیرون ملک بھی ان کی دھوم مچا کر رکھ دی غیر منقسم ہندوستان میں ان کے بیش قیمت رشحاتِ قلم ملک کے معروف اور مؤقر جرائد میں باقاعدگی سے منظر عام پر آتے رہے۔ ملک کا عظیم المیہ اس کی تقسیم کی صورت میں ظاہر ہوا اور اردو جو وطن میں شہزادی کی طرح راج کر رہی تھی اب ایک لونڈی اور باندی بنادی گئی۔ مولانا اردو کے ان وفا شعاروں میں تھے جو تقسیم وطن کے بعد بھی جلا وطن زبان اردو سے رشتۂ وفا نبھاتے رہے اور ساری عمر عزیزاسے سینے سے لگائے رہے

ایک جادو تھا جو وہ اپنے قلم سے جگا رہے تھے۔ پورے پچاس برس وہ اردو علم و ادب کی بے لوث خدمات انجام دیتے رہے اور اب جب ان کا ادبی سفر اختتام کو پہنچا

[لہ] پندرہ روزہ اشاعت حق ص ۳

[لہ] نقش کامل نسیم اختر شاہ قیصر - ماہنامہ طیب دیوبند - دسمبر ۱۹۸۵ء

تو ہزاروں بیش قیمت مضامین اور مقالات اپنے پیچھے اپنی یاد کو برقرار رکھنے کے لئے چھوڑ گئے ہیں۔

ان کے قلمدان ادارت سے بیش بہار رسائل و جرائد شائع ہوتے رہے۔ مثلاً صداقت، سہارنپور۔ انور، دیوبند خالد، دیوبند۔ دارالعلوم، دیوبند۔ طیب، دیوبند وغیرہم جو رسائل و جرائد ان کی زیر ادارت شائع ہوئے وہ ایک نقش مکمل کی حیثیت رکھتے رہے اور اپنے زمانے کے معروف ترین جرائد تسلیم کئے جا چکے ہیں۔

وہ منفرد اسلوب کے مالک تھے، ایک مشاق صحافی تھے جہاں جہاں ان کی تحریر کی روشنی پہنچتی تھی وہاں وہاں ہر اہل نظر ان کا مداح و معترف ہو جاتا تھا۔

اپنے لائق اور قابل والد حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری رح کی طرح ان میں بھی ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ حافظہ بھی انھیں جیسا پایا تھا۔ برسوں کی بات کو اس طرح بیان کر دیتے تھے جیسے ابھی کل کا واقعہ ہو۔ حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری رح کو امام العصر کہا جاتا تھا انھیں کی طرح ان کے بڑے بیٹے یعنی مولانا سید ازہر شاہ قیصر بھی ایک بے مثل اور نادرہ ہستی ثابت ہوئے موصوف کو مطالعہ سے عشق تھا اور ان کا مطالعہ ہمیشہ بڑا گہرا اور بھرپور ہوتا تھا اردو کے مصنفین شعراء اور ادباء اور چوٹی کے فنکاروں میں وہ بے حد عزیز رہے۔ ان کے مداحوں میں جگر مراد آبادی، احسان دانش، سیماب اکبر آبادی، روش صدیقی، شورش کشمیری، مولانا محمد عثمان فارقلیط، ناز انصاری انور صابری۔ سالک، کریمی الاحسانی۔ وشوا ناتھ طاؤس مولانا عبدالحق وغیرہم شامل تھے۔

سیاسی قائدین میں مولانا ظفر علی خاں۔ شیخ محمد عبداللہ مرزا افضل بیگ وغیرہم ان کی خدمات کے معترف تھے۔

اپنے زمانے کے ممتاز ترین علماء سے بھی ان کی قربت رہی مثلاً سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا غلام رسول مہر۔ مولانا محمد چراغ صاحب وغیرہم۔

ان کی تصانیف " یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ، متفرقات، حیات انور، سفینۂ وطن کے ناخدا، ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا، وغیرہم ان کی دائمی شہرت کی ضامن ہیں۔

شعر و سخن کے میدان میں ان کی غزلیات، منظومات اور نعتیں انھیں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔

بڑی حسین شخصیت کے مالک تھے آواز بلند تھی مگر لہجہ انتہائی دلکش۔ سنجیدہ مزاج ضرور تھے مگر بات بات میں لطیفوں کے شگوفے چھوڑتے رہنے سے ہمیشہ چہرے پر شگفتگی رہتی تھی۔ بے حد خوش اخلاق انسان تھے اپنے سے کمتر کو اپنے برابر سمجھتے تھے۔ برابر کے لوگوں کو خود سے بہتر سمجھ کر ان کی عزت کرتے تھے۔ بڑوں کا احترام تو کرتے ہی تھے۔

اکثر ایسا دیکھا گیا ہے جو انسان جتنا زیادہ بڑا ہوتا جاتا ہے اس کے پاس اس کے گھر والوں کے لئے وقت ہی نہیں بچتا ہے کبھی کبھی آدمی چڑ چڑے مزاج کا بھی ہو جاتا ہے مگر وہ زندگی بھر کسی سے بد مزاجی سے پیش نہیں آئے۔ خاندان کے ہر فرد کی چھوٹی سے چھوٹی بات کا خیال رکھتے تھے۔ اپنے علمی مشاغل کی بے پناہ مصروفیت کے باوجود اپنے خاندان کے افراد کو کبھی نظرانداز نہیں کیا۔ مقام شکر ہے کہ ان کی یہی خصوصیات ان کے دل بند سید نسیم اختر شاہ قیصر میں بھی بعینہٖ موجود ہیں۔

دراصل مولانا سید ازہر شاہ قیصر محض ایک فرد نہیں

بلکہ مجسم ادارہ تھے۔ وہ اردو علم و ادب کا ایک عہد تھے۔ اردو صحافت کا ایک دور تھے۔ وہ یوپی اردو اکاڈمی کے ممبر بھی تھے۔ ضلع وقف کمیٹی کے صدر بھی تھے اور بیشتر علمی ادبی اور سیاسی انجمنوں سے نہ صرف گہری طرح وابستہ ہی تھے بلکہ ان کے قائدین میں سے بھی تھے۔ آل انڈیا ریڈیو سے اکثر ان کی تقریریں بھی نشر ہوتی رہتی تھیں۔

ان کی کچھ تحریروں سے ان کی استعداد علمی کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ جیسے :-

"سچ یہ ہے کہ اردو کو سنبھالنے اور اس کو ترقی و توسیع دینے میں حکومت اترپردیش نے کافی حصہ لیا ہے۔ ہیم وتی نندن بھوگنا کے زمانۂ وزارت میں اترپردیش میں ساڑھے تین ہزار اردو ٹیچر اسکولوں میں رکھے گئے۔ اب بھی ۶ ہزار ٹیچر پرائمری اور جونیر اسکولوں میں رکھے جانے کی تجویز ہے جسمیں کچھ حکومت کی ڈھیل اور کچھ ہر ضلع کے بیسک شکشا ادھیکاریوں کے متعصبانہ اور مخالفانہ رویے کی وجہ سے تاخیر پہ تاخیر اور امیدواروں کے لئے سخت الجھنیں پیش آ رہی ہیں۔ لیکن امید رکھنی چاہیئے کہ جلد ہی یہ مسئلہ طے پا جائیگا۔ حکومت نے اکثر صوبوں میں اردو اکاڈمیاں قائم کی ہیں۔ ان کے لئے بڑی بڑی رقمیں امدادی طور پر منظور کی ہیں مگر اخبارات میں اکثر ان اکاڈمیوں کی کارگذاری کے متعلق شکایات ہی آتی رہتی ہیں۔

مجھے بڑی شکایت اس وقت ۶ ہزار ٹیچروں کے تقرر کے سلسلہ میں اکاڈمی سے ہے اکاڈمی نے مسٹر نرائن دت تیواڑی کو اپنے یہاں بلا کر ان کے سامنے ایک لمبا چوڑا میمورنڈم رکھ دیا۔ بیگم حامدہ حبیب اللہ نے ایک تقریر کر دی۔ بس اتنی کارروائی پر چھٹی ہوتی۔ حالانکہ اردو ٹیچروں کا مسئلہ بڑی دوڑ دھوپ کا طلبگار تھا۔" [1]

—— وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ :-

"اکتوبر ۸۴ء کے پرچے میں میری ایک چھوٹی غزل شائع ہوئی تھی جس کے یہ دو شعر اس نوٹ پر اشاعت سے رہ گئے تھے۔

ان کی قدغن تھی کہ میرے گھر نہ آنا پھر کبھی
دل کی مجبوری سے اس کوچہ میں ہم جانے لگے
بام و در ہلنے لگے، دل بھی تڑپتا رہ گیا
جب کبھی پچھلے فسانے آپ دہرانے لگے

اوپر کے شعر میں کوچے کا ذکر آیا تو راقم کا ذہن کی طرف منتقل ہوا کہ فارسی اور اردو شاعری میں کوچوں اور کوچہ گردی ایک مستقل عنوان رہا ہے جس پر بہت سے شعراء نے طبع آزمائی کی ہے اور نئے نئے مضامین باندھے ہیں۔ حافظہ کو ٹٹولا تو ذیل کے چند اشعار کوچہ گردی کا ذکر لئے سامنے آ کھڑے ہوئے جو اہل ذوق کی دلچسپی کے لئے حاضر ہیں ؎

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق
او بصحرا رفت و ما در کوچہا رسوا شدیم

ترے کوچے میں ہمدم مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا، کبھی اس سے بات کرنا

---

[1] ماہنامہ طیب دیوبند - اترپردیش کی اردو اکاڈمی۔ مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر۔ مارچ ۱۹۸۵ء ص ۲، ۳

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے
خضر کیا جانیں غریب۔ اگلے زمانے والے
(امیر مینائی)

بس اپنا تو ہر پہر کے یہ مشغلہ ہے اندھیرے اجالے، دیر سویرے
کبھی نازنینوں کے کوچوں کے چکر کبھی مہ جبینوں کی گلیوں کے پھیرے
(ریاض گوالیاری)

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری امیدیں ٹوٹ گئیں دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا
(امیر مینائی)

موت ان کی ہے جو مر کر وہیں دفن ہوئے
زندگی ان کی ہے جو اس کوچہ سے گھائل آئے
(نامعلوم)

ہر اک قدم اجل تھا ہر اک گام زندگی
ہم گھوم پھر کے کوچۂ قاتل سے آئے ہیں۔
(فیض)

دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی، تصویر نظر آئی
(میر تقی میر)

.... وغیرہم

یہاں تک تو تھا عشاق کی کوچہ گردی کا قصہ، پر اب ان شعراء کے متعلق جنھوں نے عشاق کی کوچہ گردی کا یہ نقشہ کھینچا ہے قرآن کریم کا فرمان بھی سنئے:-

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُنَ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِىْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ

یعنی۔ "اور شاعروں کی راہ تو بے راہ لوگ چلا کرتے ہیں۔ اے مخاطب کیا تم کو معلوم نہیں کہ وہ شاعر لوگ خیالی مضامین کے ہر میدان میں حیران پھرا کرتے ہیں اور زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔" [1]

ان کی تحریروں کے چند دلکش نمونے اور دیکھئے:-

"جس طرح سونے کو کندن بنانے کے لئے اسے دیر تک بھٹی میں تاپنا اور بار بار کوٹنا ضروری ہے ٹھیک اسی طرح انانیت اور شرف انسانیت کی تکمیل کے لئے یہ لازمی اور لابدی امر ہے کہ انسان مہالک و موبقات کے ان تمام پُرخطر راستوں سے گذر کر جن کے قدم قدم پر کانٹوں کے جھاڑ انسان کی ناپاک خواہشات کے دامن ہستی کو چاک کر دینے پر تلے رہتے ہیں، اپنے کو راضی برضائے مولا کے مرتبۂ بلند تک پہنچائے۔

انانیت اپنی اغراض کی تکمیل کے لئے نئی نئی تجویزیں سوچنے اور نئی نئی تحریکیں پیدا کرنے کا نام ہے اور نہ اچھا کھانے، اچھا پہننے، تھوڑا کام اور زیادہ آرام کرنے اور اپنی نگاہوں کو اس تیرۂ خاکدان اور اس کی بے اصل دلچسپیوں میں گم کر دینے کو کہا جا سکتا ہے بلکہ انانیت ایک سرِ نہاں ہے، قربانیٔ نفس کا ایک راز ہے اپنا سب کچھ لٹا کر اللہ بالا و برتر کی رضا و خوشنودی کی تحصیل کا ......

مسلمان جب مرے تو سولی کا ایک تختہ اور پھانسی کا پھندہ۔ نیزہ کی انی۔ شمشیر و سنان کی نوک بندوق کی نال اور بم کا گولہ یہ سب اس کے ارد گرد ہوں ....." [2]

---

[1] ماہنامہ طیب دیوبند مارچ ۱۹۸۶ء "در کوچہ رسوا شدیم" مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر ص ۱۸۔
[2] ایضاً اکتوبر ۱۹۸۵ء ..... "نقش اول" ..... ایضاً ص ۲ و ۳

"ہندوستان میں خلافت اسلامیہ کی تحریک شروع ہوگئی۔ انگریز اور اس کے اتحادی ترکی اور جرمنی کے ساتھ نبرد آزما تھے اور پوری جنگی اور سیاسی جدوجہد یہ تھی کہ ترکی کو تباہ و برباد کرکے خلافتِ اسلامیہ کے ڈھانچے کو توڑ دیا جائے اس تحریک کے سربراہ تو محمد علی اور شوکت علی تھے جنھوں نے نہایت جانبازی کے ساتھ اس تحریک کو منظم کیا اور لمبی لمبی قیدیں اس سلسلہ میں کاٹیں نثار احمد کانپوری، محمد فاخر الہ آبادی، ظفر علی خاں، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، پیر غلام مجدد سندھی شیخ عبدالمجید سندھی، عطاء اللہ شاہ بخاری، حبیب الرحمٰن لدھیانوی، عبدالقادر منصوری یہ سب حضرات اس تحریک میں شامل تھے۔ دیوبند نے بھی اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا اور اس کی فضا

بولی اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت میں دے دو
ساتھ ہے تیرے شوکت علی بھی
جان بیٹا خلافت میں دے دو

...... وغیرہم [1]

" ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک مسلمان صرف قید و بند کا شکار ہی نہیں ہوئے بلکہ انگریزوں نے انھیں تہس نہس کرنے کی کوئی تدبیر باقی نہیں چھوڑی۔ بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کرکے رنگون بھیجا گیا جہاں تیموری سلطنت کے اس آخری تاجدار نے لکڑی کے ایک بوسیدہ سے مکان میں سسک سسک کر جان دی اور خود ان کا یہ قول صحیح ثابت ہوا کہ ع

دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں۔

تیموری شہزادوں کے سر طشت میں رکھ کر بہادر شاہ کے سامنے پیش کئے گئے، قلعۂ معلّےٰ کی بیگمات اور شہزادیاں اپنی عصمت و عفت بچانے کے لئے قصبات اور دیہات میں جا چھپیں اور خوشحال گھرانوں میں ماماؤں کی حیثیت سے انھوں نے اپنی زندگی گذاری۔ ہزاروں مسلمانوں کی جائیداد ضبط کی گئیں ہزاروں زمینداروں کو نان شبینہ کا محتاج بنا دیا گیا............

...... مولانا ظفر علی خاں نے کم و بیش ۱۷ برس کی قید کاٹی۔ ایک دفعہ مولانا منٹگمری کی جیل میں تھے کہ ان کا عزیز پوتا منصور علی خاں ان سے ملنے کے لئے جیل میں گیا۔ مولانا کس پدرانہ شفقت اکس حسرت اور کس مجبوری کے ساتھ فرماتے ہیں کہ

"مجھ سے ملنے کے لئے زنداں میں منصور آگیا
ڈھونڈتی تھیں جس کو نظریں چشم بد دور آگیا
اس کا رونا اس کا ہنسنا اسکی شوخی اسکی ضد
مجھ کو یاد اختر ترے بچپن کا دستور آگیا

....

یہاں ہمیں مشہور محب وطن اشفاق اللہ خاں کی بھی یاد آئے گی جو کاکوری سازش کیس میں گرفتار ہوکر فیض آباد جیل میں رہے اور وہیں انھیں پھانسی دی گئی۔ یہ پنڈت رام پرشاد بسمل، ٹھاکر روشن سنگھ اور راجندر لہری کے ساتھی تھے اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار تھے.........

...... ۲۰ ستمبر ۱۹۲۷ء کو اشفاق اللہ خاں حسرت کو پھانسی کے تختہ پر لٹکا یا گیا اس حالت میں کہ قرآن شریف ان کے ہاتھوں میں تھا اور آیات قرآنی ورد زبان

---

[1] ماہنامہ طیب دیوبند - اکتوبر ۱۹۸۵ء
"سفینۂ وطن کے ناخدا" ص ۷

تھیں۔ پھانسی پانے سے کچھ پہلے اشفاق اللہ خاں حسرت نے ایک شعر کہا تھا ؎

تنگ آکر ہم بھی ان کے ظلم اور بیداد سے
چل دیے سوئے عدم زندانِ فیض آباد سے

پھانسی کی کوٹھری میں اکثر اپنا یہ شعر پڑھا کرتے تھے

وطن ہمیشہ رہے شادکام اور آزاد
ہمارا کیا ہے اگر ہم رہے رہے نہ رہے

ایک شعر ان کے جذبہ حب الوطنی کی پوری عکاسی کرتا ہے ؎

کچھ آرزو نہیں ہے، ہے آرزو تو یہ ہے
رکھ دے کوئی ذرا سی خاکِ وطن کفن میں[1]

"دنیا میں ہزاروں لاکھوں کروڑوں، اربوں انسان آباد ہیں۔ مشرق اور مغرب کے آخری سروں تک انسان پھیلے پڑے ہیں۔ کسی ایک شخص کا ان سب تک پہنچنا محالات سے ہے۔ لیکن بیسیوں پچیسیوں اور سینکڑوں آدمیوں کو میں نے دیکھا ہے انکے چہروں کو پڑھا ہے۔ ان کے ظاہر کا جائزہ لیا ہے۔ میں سوچتا ہوں اور یہ سوچتے سوچتے میری عمر گذر گئی کہ وہ شرف انسانیت جس نے انسان کو ساری مخلوق پر برتری بخشی تھی کہاں گم ہو گیا انسانیت کہاں گئی، انسان کہاں مرگیا، میری موت کہاں گئی جو میرے اور اس دنیائے دنی کے درمیان ایک فاصلہ، ایک بُعد اور ایک حجاب پیدا کر دیتی۔ ؎

طولِ روحیات سے گھبرا گیا ہے دل
اے موت آ بھی جا کہ تیرا انتظار ہے...."[2]

"افسوس ہے کہ ہندو مسلمانوں کے ذہن کا یہ بُعد آج تک بھی ختم نہیں ہوا اور انھوں نے اب تک اس حقیقت کو نہیں سمجھا کہ ہندوستان کی تعمیر و ترقی اور اس کے استحکام کے لئے یہاں کی سب قوموں میں اتحاد و یک جہتی کا ہونا لازمی ہے۔

بہت موٹی سی بات ہے جو ہر شخص کی سمجھ میں آجانی چاہئے کہ ایک گھر کے افراد آپس ہی میں لڑیں گے اور آپس ہی میں اپنے گھروں کے سازوسامان اور اس کے مختلف عمارتی حصوں کو منہدم کرتے چلے جائیں گے تو مکان کیسے باقی رہے گا اور اس کا سازوسامان کیسے بربادی سے بچے گا؟...."[3]

اگر میں مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر کی تصانیف سے مزید اقتباس پیش کروں تو یقیناً یہ مقالہ بہت طویل ہو جائیگا لہٰذا اتنے ہی اقتباسات پر کفایت کرتا ہوں۔ مگر ان اقتباسات سے مولانا کا زورِ قلم ان کا طریقۂ استدلال، ان کے اسلوب کی دل کشی، اظہار مطالب کے لئے ان کا دل نشین لہجہ اور ان کی تحریر کی پُر تاثیری پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ہر خدا رسیدہ کا ایک داغ دار ماضی ہو سکتا ہے اور ہر گنہگار کا روشن مستقبل ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہر قوم کا بھی ایک ماضی ہوتا ہے اور ایک مستقبل بھی۔ مولانا کو تاریخ پر کافی عبور حاصل تھا ہندوستانی قوم کی تشکیل حیات میں مولانا نے خود ایک اہم رول ادا کیا تھا۔ وہ ان مصنفین میں سے نہیں تھے جو دور سے موجوں کے تلاطم کو دیکھ کر ان پر اپنے تخیل کی مدد سے کچھ لکھتے۔ وہ خود گہرے پانی کے بہاؤ میں گھس کر طوفان بداماں لہروں کو محسوس کر چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں

---

[1] ماہنامہ طیب دیوبند نومبر ۱۹۸۵ء "سفینۂ وطن کے ناخدا"۔ سید محمد اظہر شاہ قیصر ص ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴
[2] " " " دسمبر ۱۹۸۵ء "نقش اول" ——— " " " " " " ص ۲، ۳
[3] " " " " " " "سفینۂ وطن کے ناخدا" " " " " " ص ۳۱، ۳۲

ان کی تحریر تاریخ کی خوشبو سے معطر نظر آتی ہے وہاں ان کے الفاظ بھی انتہائی پُر تاثیر ثابت ہوتے ہیں وہ اپنے انشائیوں سے پوری ہندوستانی قوم کے جذبات اور واردات دل کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کا اظہار پُر تاثیر تو ہے ہی لیکن بڑا جاندار اور پر وقار بھی ہے وہ اپنے مطالب کی ادائیگی کے لئے جو طریقہ تحریر میں استعمال کرتے ہیں وہ ان کی چابکدستی ہوشیاری اور عالمانہ انداز کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ ان کا ایسا اہم اور قابل ستائش کارنامہ ہے جس سے نہ صرف ان کے انشائیوں میں چمک اور جان پڑ گئی ہے بلکہ مفہوم میں گہرائی بھی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اردو کے بے مثل انشاء پرداز مہدی حسن کی طرح مولانا کے یہاں بھی حسن آفرینی کے ساتھ ساتھ معنی آفرینی اور اختصار آفرینی پیدا ہو گئی ہے۔ مولانا کی نثر میں حکیمانہ انکشافات اور نکتہ آفرینیاں ملتی ہیں جس پر تاریخ اور فلسفہ کا رنگ بھی چڑھا ہوا ہے۔

مولانا نے آنکھیں اس فضا میں کھولی تھیں جب پورا ملک غلام تھا۔ ملک کو آزاد کرانے کے لئے مختلف تحریکیں اپنے پورے شباب پر تھیں۔ اپنے غلام ملک کے لئے درد مندی کا جذبہ انھیں ورثے میں ملا تھا انھوں نے غلام ہندوستان کی فضا میں سانس لی اور تلخی حالات سے تلخ کام بھی ہوئے اس سے ان کے قلم کے مزاج میں ایک مخصوص کیفیت پیدا ہو گئی۔ ان کا شعور بیدار ہو گیا۔ وہ حالات حاضرہ پر بڑی مہارت سے قلم اٹھاتے ہیں اور اس طرح اٹھاتے ہیں کہ اس کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ اور وہ اپنے دل کی دھڑکنوں کو الفاظ کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ یہاں ان کا قومی شعور مکمل طور پر ابھر آتا ہے۔ انھوں نے قارئین کو بہت کچھ دیدیا یہاں تک کہ ان کے احسانات کا وزن محسوس کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اردو سے ٹوٹ کر محبت کی! اردو نثر پر انھیں بے پناہ عبور حاصل تھا وہ زبان کے صحیح استعمال سے واقف تھے۔ ان کے سحر آفریں اسلوب کی کرشمہ سازی اردو علم وادب کے شیدائیوں سے سدا ہی اپنا خراج وصول کرتی رہے گی۔

مرزا غالب نے اردو کو دلنشین اسلوب بخشا تھا جس کے شاہد دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے اُن کے خطوط ہیں جو مسجع عبارت سے قطعی بے نیاز تھے۔ مولوی محمد حسین آزاد نے اسی اسلوب میں نزاکت اور سادگی کی آمیزش کر دی تھی۔ مولوی نذیر احمد نے اسی اسلوب کو متین بنا دیا تھا حالی اور شبلی نے اسے ایک نئی تہذیب کا قالب پہنا دیا اور ایک مخصوص شائستگی بخش دی تھی مولانا ابوالکلام آزاد نے اسی اسلوب کو ندرتِ ذوق و فکر سے آراستہ کر دیا تھا، منشی پیارے لال شاکر میرٹھی نے اپنی انشا پردازی کے جوہروں سے اس اسلوب کو انتہائی آب دار اور ستاروں سے زیادہ چمکدار بنا دیا تھا، مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر نے اسی اسلوب کو ایک انوکھا لب و لہجہ اور انداز بیان بخش دیا تھا انتہائی الجھے ہوئے معاملات پر بھی وہ اپنے مخصوص لہجہ میں اس طرح قلم آرائی کر جاتے تھے کہ تحریر میں الفاظ کا ربط ترتیب، وقار اور انداز پڑھنے والے کے دل میں اترتا چلا جاتا، اور اس کی روح تک کو سرشار کر دیتا اور وہ مسحور ہو کر رہ جاتا تھا تخلیقات میرے سامنے نہیں ہیں چند اشعار اور ایک سہرا جو اُن کی جولانیٔ طبع کے ترجمان ہیں ضرور مجھے کہیں پڑھنے کو ملے تھے مگر طوالتِ مضمون کے خوف سے ان کی شاعری پر اپنے تاثرات کسی اور وقت بیان کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔

بہر حال مولانا ایک ہفت رنگ دانشور تھے وہ دور حاضرہ کے عظیم مصنف تھے جن کی تخلیقات میں ابدیت کا جوہر موجود ہے۔

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر کی موت سے علم وادب کے میدان میں واقعی ایک خلا پیدا ہو گیا ہے جس کے پورے ہونے میں یقیناً مدت درکار ہوگی۔

٭ ٭ ٭

دار الکتاب دیوبند کی تین تازہ مطبوعات
تیس۳۰ ضخیم جلدوں کے تقریباً اکیس۲۱ ہزار صفحات پر مشتمل قرآن کریم
کی ایک عظیم تفسیر، لاثانی شاہکار اور نادر روزگار مجموعہ
معالم القرآن
مفسر
جناب مولانا محمد علی الصدیقی الکاندھلوی
یہ ایک ضخیم کتاب ہے اردو زبان میں اتنی مفصل تفسیر کا وجود نہیں ملتا پھر یہ تفسیر محض ضخیم ہی نہیں ہے، بلکہ انتہائی مستند اور معتبر بھی ہے اپنی طوالت کے باوجود رطب و یابس سے پاک ہے اور قرآن کریم کے تمام اہم تفسیری پہلوؤں کا پورے طور پر احاطہ کرتی ہے ● مفسر کا دعویٰ ہے کہ اس نے اپنی تفسیر میں تمام مشہور علماء کرام اور مفسرین عظام کی تفاسیر سے بھرپور استفادہ کیا ہے بلکہ ان مفسرین کی تحقیقات اپنی کتاب میں سمو دی ہیں ● ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ یہ تفسیر اپنی خوبیوں کے لحاظ سے ایسی تفسیر ہے جس کی نظیر اردو میں کیا دوسری زبانوں میں بھی مشکل سے ملے گی۔
پروگرام:- ہم یہ تفسیر دو ماہی پروگرام کے تحت قسط وار شائع کر رہے ہیں ہر قسط ۲۰×۲۶/۸ سائز کے ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہوگی
قیمت:- ممبران کے لئے ۱۰/۰۰ روپے۔
آج ہندوستان میں ہر طرف مسلم پرسنل لاء کا موضوع زیر بحث ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ مسلم پرسنل لاء کیا ہے؟ اور شریعت اسلامیہ نے آپکی زندگی کے تمام پہلوؤں میں کیا رہنمائی کی ہے؟ اگر آپ اسلامی احکام و قوانین سے واقف نہیں تو
احسن الفتاویٰ
برصغیر کے نامور اور ممتاز عالم دین صاحب قلم اور مفکر حضرت مولانا مفتی رشید احمد کے ہزاروں فتاوی اور یک صد فقہی موضوعات پر مفصل رسائل کا مجموعہ ہے۔
پروگرام:- فتاوی کا یہ گرانقدر مجموعہ کم و بیش چار ہزار صفحات پر مشتمل ہے ادارہ اس مجموعے کو سات جلدوں میں شائع کر رہا ہے ● طباعت فوٹو آفسیٹ، کاغذ سفید عمدہ، پہلی جلد کے صفحات ۵۶۸، سائز ۲۰×۲۶/۸ ہر جلد کی قیمت ۶۰ روپے مستقل ممبران کی خدمت میں جلد اول ۴۵ روپے میں روانہ کی جائے گی بشرطیکہ دس روپے بطور زر ضمانت پیشگی جمع کرا دیں یہ دس روپے آخری جلد کی وی پی سے وضع کر دئے جائیں گے۔ اگر دس روپے ایڈوانس نہ بھیجیں تو پھر ہر جلد ۵۰ میں جائیگی۔ (ڈاک خرچ ہر دو صورت میں بذمہ ادارہ)
مدارس عربیہ کے طلباء کے لئے ایک نادر علمی تحفہ
"کشف المعضلات" فی حل سوالات جامع الترمذی
تالیف و ترتیب:- مولانا مفتی محمد عبد القوی ملتانی۔
کتاب کی چند اہم خصوصیات:- ● اردو عبارت سادہ سہل، عام فہم ● ہر مسئلہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جس میں سے ایک "الحل" اور دوسرا حصہ "الشرح" کے عنوان سے معنون ہے الحل کے تحت ان جملہ امور و مباحث کو بیان کیا گیا ہے جنکے بارے میں حضرات ممتحنین نے طلباء سے پوچھا ہے اور الشرح کے ذیل میں ان بقیہ مباحث کو لکھا گیا ہے جو فراغت کے بعد تدریسی زندگی میں کام آسکتے ہیں ● دلائل جوابات اور وجوہ ترجیح کے لانے میں استیعاب سے کام لیا گیا ہے۔
ملنے کا پتہ
دار الکتاب دیوبند یوپی

اجاب کا رخصت ہوجانا بڑا سخت اور صبر آزما مرحلہ ہے اور پھر احباب بھی از ہر شاہ صاحب جیسے سدا بہار اور زندہ دل ——! جو زندگی بھر روتوں کو ہنساتے رہے، ایک مخلص غمخوار جو ہمیشہ ہر ایک کے غم بانٹتے رہے سب کے زخموں پر پھاۓ رکھتے رہے۔ اور آخر کار خود رخصت ہوۓ تو ایسی ٹیس اور ایسا درد دے گئے جو زندگی بھر ان کے چاہنے والوں کو تڑپاۓ گا۔

یہ تصور بھی ناقابل یقین لگتا ہے کہ شاہ صاحب ہمیشہ کے لئے جدا ہو چکے ہیں اور ان کی محفلیں سدا کے لئے اجڑ چکی ہیں۔ تصور میں جب ان کا ہنستا مسکراتا چہرہ اور ان کی منفرد خوبیاں ابھرتی ہیں تو کلیجہ مونھ کو آتا ہے۔ یہ بھی قدرتی بات ہے کہ ایسے میں جانے والے کے قریبی ساتھیوں سے ہی مرحوم شخصیت کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالنے کے لئے کہا جاتا ہے لیکن قریبی احباب کے لئے یہ مرحلہ بڑا نازک اور صبر آزما ثابت ہوتا ہے۔ شکستہ دلی، سینے کی کسک اور ذہنی پراگندگی اس لائق ہی نہیں چھوڑتی کہ بکھری ہوئی یادوں کو سمیٹا جا سکے۔

شاہ صاحب ایک ہمہ صفت موصوف قسم کے آدمی تھے جو ہر طرح کے ماحول اور ہر قسم کے حالات میں اپنے لئے راہیں پیدا کر لینے اور اپنا امتیاز قائم کر لینے کی اہلیت رکھتے تھے اس کی سب سے مکمل مثال یہ ہے کہ ان جیسے آزاد منش شخص کو جس نے اپنی ابتدائی زندگی بے فکری میں اور انفرادیت پسندانہ مزاج کے ساتھ گذاری تھی جب اچانک دارالعلوم کے مسلکی ترجمان "ماہنامہ دارالعلوم" کی ادارت سونپی گئی تو مرحوم بڑی خود اعتمادی کے ساتھ اس منصب پر آکر بیٹھ گئے اور پھر پینتیس ۳۵ برس تک جماعت دارالعلوم کے مسلک کی اس طرح پاسبانی و اشاعت کرتے رہے کہ جماعت کے سربراہوں کو رسالہ دارالعلوم کے مواد پر کبھی انگلی رکھنے کی گنجائش نہ ہوئی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ ایک نوآموز اور جماعتی مزاج کی نزاکتوں سے ناآشنا شخص پوری جماعت کے دینی معتقدات کا ترجمان بن کر روز اول سے ہی اس کامیابی کے ساتھ اپنے فرض سے عہدہ برآ ہوتا رہے شاہ صاحب کی سلامتی طبع اور فکری اعتدال پسندی پر ان کی یہ مسلکی ترجمانی سب سے بہتر دلیل بھی ہے اور ان کے فطری جوہر کا واضح ثبوت بھی۔

شاہ صاحب میں شعر فہمی کا ذوق فطری تھا۔ مرحوم اکثر خود بیان کیا کرتے تھے کہ انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز ایک ادیب اور افسانہ نگار کی حیثیت سے کیا تھا۔ ممکن ہے ان کے وہ ادب پارے ان کے کتابی ذخیرے میں موجود ہوں، لیکن مجھے ان کو دیکھنے پڑھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ اسی دور میں شاہ صاحب کے سیاسی مضامین کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا جو اس وقت کے جرائد میں شائع ہوتے رہے اسی ادبی ذوق نے انھیں تقسیم ملک سے پہلے کے شعراء اور ان کے کلام کی طرف متوجہ کیا۔ اپنے لاہور کے زمانۂ

قیام میں شاہ صاحب اس وقت کے مشہور شعراء کی مجلسوں میں پہنچ گئے اور اپنی خداداد ذکاوت اور سخن فہمی کے طفیل ہمیشہ ان نامور شعراء کے بے تکلف احباب میں شامل رہے احسان دانش اور آغا شورش کاشمیری سے شاہ صاحب کی اکثر مراسلت رہی۔ جگر صاحب شاہ صاحب کے محبوب شاعر تھے جن سے ان کے ذاتی مراسم بھی تھے ایک دو مرتبہ جگر صاحب کسی مشاعرہ میں دیوبند آئے تو شاہ صاحب نے اپنے مکان پر انھیں چائے پارٹی دی اور اپنے احباب کو ان سے متعارف کرایا۔ شاہ صاحب کی سخن فہمی بے مثال تھی۔ اچھے شعر کی پرکھ ان کا امتیازی وصف تھا۔ کوئی اچھا شعر کتنے ہی سرسری انداز میں ان کے سامنے پڑھا جاتا تو شاہ صاحب ایک لمحے میں اس شعر کی نزاکتِ بیان، خیال آفرینی، بندش کی چستی اور طرز ادا غرض ساری خوبیوں کو تاڑ لیتے تھے اور جھوم جھوم کر اس کی شعری خصوصیات بیان کیا کرتے۔ یہاں تک کہ احباب کے مجمع میں مجھ جیسے سخن ناآشنا لوگوں کے لئے کسی شعر کی خوبی کا معیار ہی یہ مقرر ہوگیا تھا کہ اگر شاہ صاحب نے داد دیدی تو وہ یقیناً اعلیٰ درجے کا شعر ہوگا۔ شاہ صاحب خود بہت کم شعر کہتے تھے لیکن اپنی بہترین قوت حافظہ کی بناء پر بجائے خود ایک ایسا شعری دیوان تھے جس کے سینے میں تمام قدیم وجدید شعراء کا بہترین کلام محفوظ تھا۔ مناسب حال اور برموقعہ شعر پڑھ دینا شاہ صاحب کی زبردست خصوصیت تھی۔ شعری مناسبت اور حافظہ کا یہ عالم تھا کہ اپنے پسندیدہ شعراء میں سے احسان دانش یا شورش کاشمیری کی تازہ نظمیں جو ان کے آخری دور میں آتی تھیں وہ ایک دفعہ پڑھ کر تقریباً پوری نظم مجمع احباب میں سنایا کرتے تھے۔

ازہر شاہ قیصر آج کوئی شخصیت نہیں صرف ایک نام ہے مگر اس نام کے پیچھے کتنی خصوصیات، کتنی خدمات کتنے کارنامے اور کتنی یادیں پنہاں ہیں اسے کچھ وہی لوگ محسوس کرسکتے ہیں جنھیں اس مخلص اور دردمند انسان کے ساتھ وقت گذارنے کا موقعہ ملا ہے۔ شاہ صاحب سے میرا تعلق تقریباً تینتیس برس سے تھا اس طویل مدت میں انھیں دوستانہ مجلسوں میں بھی برتا، سنجیدہ اجتماعات میں بھی دیکھا، گھریلو زندگی میں بھی انھیں پرکھنے کا موقعہ ملا، دارالعلوم کے ایک ذمہ دار عہدیدار کی حیثیت میں بھی دیکھا اور ایک لاپروا اور پُرمذاق شخص کے روپ میں بھی دیکھا مگر ان تمام رنگارنگ حیثیتوں میں ایک چیز شاہ صاحب کی شخصیت میں قدر مشترک پائی اور وہ تھی ان کی مخلصانہ وضعداری، ہر محفل میں اپنے قریبی احباب کی دلداری اور ہر مجمع میں اپنے دوستوں کے ساتھ یکساں طرز عمل مرحوم کی امتیازی خصوصیت تھی۔

اپنے چھوٹوں کو نمایاں کرنے اور ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں شاہ صاحب نے ہمیشہ انتہائی فراخدلی کا مظاہرہ کیا۔ جوہر شناسی اور مردم سازی کے معاملے میں مرحوم کو اپنے والد بزرگوار کا مزاجی ورثہ قدرت نے دل کھول کر دیا تھا۔ شاہ صاحب کے والد ماجد محدثِ کبیر حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے گوناگوں علمی فیوض کے ساتھ جو چلتا پھرتا علمی ترکہ چھوڑا وہ حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگردان رشید کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ اس حلقے میں حضرت شاہ صاحب بے مثال علماء اور بے نظیر محققین کا ایک زبردست مجمع چھوڑ کر گئے جو ان کے علمی وروحانی فیض تربیت کا مرقع تھا۔ حضرت کا ہر شاگرد اپنے جلیل القدر استاد ومربی کی شان تربیت کی منھ بولتی تصویر تھا۔ اس مجمع میں ہم حضرت حکیم الاسلامؒ، حضرت مولانا یوسف بنوریؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ، حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلوی، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی، حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور حضرت مولانا حامد الانصاری

غازی وغیرہم کو دیکھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ حق تعالٰی نے حضرت شاہ صاحبؒ کو ایک خصوصی شان علم و تربیت دیکر اور ایک زبردست فیض رساں شخصیت بناکر بھیجا تھا۔ آسمانِ علم کے یہ سب چاند ستارے حضرت رح کے فیض تربیت کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ پھر جب ہم مرحوم شاہ صاحب کو دیکھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مردم شناسی اور جذبۂ تربیت ان میں بھی اپنے والد بزرگوار سے منتقل ہوا تھا۔ فرق یہی ہے کہ شاہ صاحب مرحوم کی شخصیت میں جو ایک مربی پنہاں تھا اس نے اپنی تربیت سے دنیوی وجاہت کے نمونے تیار کئے چنانچہ جن لوگوں کو شاہ صاحب کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ تھوڑے عرصہ بھی مل گیا وہ اس کے بعد اپنی زندگی کی تعمیر میں اتنے تیز رو ثابت ہوئے کہ بڑے بڑے ذی استعداد نوجوانوں کو بھی پیچھے چھوڑ گئے۔ اسی لئے رسالہ دار العلوم کا دفتر نوجوانوں کی ایک بہترین تربیت گاہ تھا۔ ایسی کتنی ہی مثالیں موجود ہیں کہ جن نوجوانوں کو قدرت نے شاہ صاحب مرحوم کی زیر تربیت و نگرانی پہنچا دیا تو شاہ صاحب کی جوہر شناس نظر نے ان کے مخصوص طبعی رجحانات اور استعدادوں کو پہچان کر ان کی صلاحیت کے مطابق ان سے کام لینا شروع کیا۔ ان کی خفتہ اہلیتوں کو بیدار کیا اور ان کی افتادِ مزاج کے مطابق ان کی تربیت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت تھوڑی مدت میں ان کے اندر خود اعتمادی و خود شناسی پیدا ہوگئی۔ یہ جوہر قابل تیار کرنے کے بعد پھر شاہ صاحب ان نوجوانوں کے سامنے زندگی کی وسیع تر جولانگاہ میں اپنی صلاحیتوں سے کام لینے اور آگے بڑھنے کی تحریک کرتے تھے۔ اس طرح ان نوجوانوں کو آگے بڑھا کر اگرچہ خود شاہ صاحب کے لئے نت نئی پریشانیاں اور دفتری الجھنیں پیدا ہو جایا کرتی تھیں کیونکہ اپنے تربیت کردہ نوجوانوں کو زندگی کی وسیع تر شاہراہوں کا راستہ دکھا دینے کے بعد خود دفتر کے لئے شاہ صاحب کو پھر کسی نو آموز کو لانا پڑتا تھا مگر وہ کبھی اپنی ان دشواریوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے بلکہ ایک نوجوان کو بہترین صلاحیتوں سے آراستہ کرنے اور زندگی کی صحیح قدر و قیمت سمجھا دینے سے مرحوم کو جو روحانی سکون ملتا تھا ان کے لئے وہی سب سے بڑی طمانینت تھی۔

مجھے یاد ہے کہ سب سے پہلے میں نے دفتر رسالہ میں مرحوم ناصر انصاری صاحب رامپوری کو بحیثیت شاہ صاحب کے ماتحت دفتر رسالہ میں بیٹھے دیکھا یہ ۱۹۵۰ء کے دہائی کے ابتدائی دور کی بات ہے ناصر انصاری جبھی دار العلوم سے فارغ ہوئے تھے اور ایک لا اُبالی مگر ذہین و ذکی نوجوان تھے۔ دورانِ تعلیم شاہ صاحب مرحوم کے ساتھ ان کی نشست و برخاست تھی شاہ صاحب ان کے اندر جوہر قابل کو تلاش کر چکے تھے۔ دار العلوم سے فراغت کے بعد ان کو دفتر رسالہ میں لے لیا گیا اور شاہ صاحب کی تربیت نے ان کو دن بدن نکھارنا شروع کیا سب سے پہلے شاہ صاحب نے ان کو انگریزی امتحانات کیطرف متوجہ کیا اور اس کے ساتھ ہی عربی زبان میں مہارت حاصل کرنے کا شوق پیدا کیا۔ چند سال کے عرصے میں ناصر انصاری مرحوم نے انگریزی زبان میں بی اے کر لیا اور عربی بول چال پر قابل قدر دسترس حاصل کر لی۔ اس کے ساتھ ہی شاہ صاحب کا دیا ہوا یہ سبق ان کے ذہن میں انقلاب برپا کر چکا تھا کہ ؎

"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"

بہت جلد ناصر صاحب دفتر رسالہ سے نکل کر آل انڈیا ریڈیو دہلی میں عربک یونٹ کے اسسٹنٹ سپروائزر کی حیثیت سے پہنچ چکے تھے اس کے بعد وہ پریس ایشیا انٹرنیشنل سے شاہ صاحب کی ہمہ جہت تربیت کا خراج وصول کر رہے تھے!

ان کے بعد شاہ صاحب نے ایک دوسرے نوجوان مشہود اقبال صاحب کو اپنے دفتر میں لے لیا۔ مشہود

صاحب کا یہ ابتدائی زمانہ تھا اور بقول خود ان کے انھیں قلم تک پکڑنا نہیں آتا تھا مگر شاہ صاحب کی دور رس نگاہیں ان میں ایک کامیاب تاجر اور کامیاب مضمون نگار کی پنہاں صلاحیتوں کو تاڑ چکی تھیں۔ مشہود صاحب کو شاہ صاحب نے چند ہی سال کی تربیت کے ذریعہ جو خود آگاہی اور آگے بڑھنے کی تڑپ دی یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ جلد ہی انھوں نے اپنا ذاتی مکتبہ قائم کر کے جہاں اس کے ذریعہ دینی کتابوں کی اشاعت کا بیڑہ اٹھایا وہیں "مشرب" کے نام سے اپنا ذاتی رسالہ جاری کر کے اس کی ادارت سنبھالی ۔۔۔

پھر اسی طرح مولانا ڈاکٹر زبیر فاروقی دارالعلوم سے فراغت کے بعد شاہ صاحب کے دفتر میں ان کے فیض تربیت کے خوشہ چین بنے۔ شاہ صاحب نے ان کی ہمت پرواز کو تاڑا اور انھیں اپنے قریب لے آئے۔ چند ہی سال بعد راحت ہاشمی صاحب نے رسالہ دارالعلوم کے مختصر ماحول سے نکل کر آل انڈیا ریڈیو کے عربک یونٹ میں اپنی صلاحیتوں کے لئے خراج تحسین وصول کیا اور آج وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں پروفیسر ہیں۔ ان کے بعد آنے والوں میں جناب زبیر جونپوری، جناب انوار الحق صاحب بیدل اور مرحوم سید فرحت ہاشمی وہ نوجوان ہیں جو دارالعلوم سے فراغت کے فوراً بعد بالترتیب شاہ صاحب مرحوم کی جوہر بیں نگاہوں میں آئے اور ہر ایک کو چند سال شاہ صاحب کی ماتحتی اور تربیت میں رہنے کا موقعہ ملا اور ہر ایک نے دفتر رسالہ دارالعلوم میں مختصر مختصر مدت گذار کر زندگی کا وہ ولولہ اور آگے بڑھنے کی وہ امنگ حاصل کی کہ ان میں سے ہر ایک نے اس دفتر سے نکل کر آسمانوں پر کمندیں ڈالیں اور زندگی سے اپنی قیمت وصول کی۔ شاہ صاحب کے زیر تربیت رہتے ہوئے ان میں سے ہر ایک نے انگریزی کے امتحانات دئے، عربیت پر قدرت حاصل کی اور قناعتِ حیات سے ہٹ کر اپنے لئے نئی نئی منزلیں تلاش کیں

- -

..... انوار الحق صاحب بیدل اور سید فرحت ہاشمی مرحوم کے پرِ پرواز نے انھیں ہندوستان کی سرحدوں کے پار سعودی عرب کی سرزمین مقدس میں پہنچایا اور ان دونوں نے ریاض میں اپنی صلاحیت مندی کا اعتراف کرایا۔ یہ سب ان نوجوانوں کی تاریخ ہے جو ہمارے دیکھتے دیکھتے شاہ صاحب کی بے مثال تربیت اور مردم سازی کے روشن ثبوت ہیں اور ہمیشہ اپنی ترقی حیات کو شاہ صاحب کے فیض تربیت کی مرہون منت قرار دیتے رہے۔ یہ شاہ صاحب کا وہ خداداد ملکہ اور مردم شناسی اور مردم سازی کا جوہر تھا جس میں وہ منفرد شخصیت کے مالک تھے۔

میں نے شاہ صاحب کو ہمیشہ حلم و مروت میں ایک ممتاز مقام پر پایا۔ شاہ صاحب کے بے تکلف احباب میں ہم لوگ بلحاظ عمر کافی چھوٹے تھے اور بالعموم اس فرق عمر کا لحاظ بھی رکھتے تھے مگر کبھی کبھی بے تکلف گفتگو میں ہم میں سے بعض لوگ حدود سے متجاوز ہو جاتے تھے کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہنسی مذاق میں اپنے مقام اور ان کی عمر کی پاسداری نہ رہتی۔ کبھی ایسے چبھتے ہوئے جملے منھ سے نکل جاتے جو خوردی کے منافی ہوتے مگر یہ شاہ صاحب کی بڑائی اور عالی ظرفی نیز انتہا سے زیادہ بردباری تھی کہ ان کی پیشانی پر کبھی شکن نہ آئی اور انھوں نے اپنے چھوٹوں کی شوخی و گستاخی اور بیجا جسارتوں کو انتہائی خندہ پیشانی سے انگیز کیا۔

شاہ صاحب ایک فرض شناس کارکن تھے جو اپنے متعلقہ کاموں کو مقررہ وقت میں مکمل کر دینے کے عادی تھے۔ اس معاملے میں ان کی عمر یا صحت کی کمزوری ان کی چستی و مستعدی کے لئے کبھی رکاوٹ نہیں بنی۔ اجلاس صد سالہ کی تیاریوں کے دوران تو شاہ صاحب کا

ساتھ تقریباً ہر وقت اور سفر اور حضر دونوں میں رہتا تھا شاہ صاحب سفر کے معاملے میں انتہائی کم ہمت تھے مظفر نگر اور سہارنپور تک کا سفر ان کے لئے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا مگر دارالعلوم کے اجلاس صد سالہ کی ذمہ داریوں کے تحت وہ رات اور دن کے ہر حصہ میں آمادۂ سفر رہتے تھے۔ لکھنؤ دہلی، میرٹھ، رڑکی وغیرہ کے سفروں میں وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔ بعض اوقات ہم لوگ دو تین روز کے سفر کے بعد تھکے ماندے واپس آئے لیکن دیوبند پہنچنے کے ایک گھنٹے بعد ہی دہلی سے فون آگیا کہ فوراً پہنچئے۔ میں اسی وقت شاہ صاحب کو ساتھ لینے کے لئے ان کے گھر پہنچا۔ عشاء کے بعد کا وقت اور شاہ صاحب تھکن سے نڈھال مگر میرے کہتے ہی شیروانی اٹھا کر باہر نکل آئے۔ بعض اوقات دہلی یا لکھنؤ میں کاموں کے ہجوم اور حکام سے ملاقاتوں کے تسلسل میں ہم تھک کر چور ہو جاتے، کبھی کبھی تو پورا دن بغیر کھائے پیئے بسر ہو جاتا۔ کھانا تو درکنار چائے تک کی ایک پیالی تک میسر نہ آتی مگر شاہ صاحب پر جو مقصد کی لگن تھی وہ انھیں ہر چیز سے بے نیاز رکھتی تھی۔ ایک مرتبہ جبکہ ہم اجلاس صد سالہ کے سلسلے میں دہلی میں تھے اور دن بھر مختلف وزارتوں کے دفاتر میں چکر لگاتے گزرتا تھا تو اسی دوران ایک روز سارا دن گذر گیا نہ ہمیں کھانے کا وقت ملا اور نہ چائے میسر آئی۔ شاہ صاحب کے علاوہ مولانا عبداللہ جاوید اور لکھنؤ کے چودہری علی مبارک صاحب ساتھ تھے بھوک اور تھکن سے سبھی جھنجھلائے ہوئے تھے آخر شام کو راہ میں ایک جگہ چنے بیچنے والا نظر آیا تو اس سے پچیس پچاس پیسے کے چنے خرید لئے شاہ صاحب کی بھی تواضع کی باوجود دانت نہ ہونے کے انھوں نے بلا تامل تواضع قبول کر لی اور انتہائی بشاشت و شگفتگی کے ساتھ چنوں سے شغل کرتے رہے اور قہقہے لگاتے رہے یہ شاہ صاحب کی فرض شناسی ہی تھی کہ دفتر میں ان کی وقت کی پابندی بھی بے مثل تھی۔ صحت کمزور تھی اکثر و بیشتر بخار ہو جایا کرتا تھا مگر اسی حالت میں سب سے پہلے دفتر پہنچتے تھے نہ خود چھٹی لیتے تھے نہ دوسروں کو لینے دیتے تھے۔ ذاتی زندگی میں جتنے غیر مرتب تھے دفتری زندگی میں اتنے ہی منظم اور منضبط، ہمیشہ رسالہ دارالعلوم وقت کی پابندی سے خریداروں تک پہنچتا رہا کیونکہ شاہ صاحب تازہ شمارے کی تاریخ روانگی سے ایک ماہ قبل رسالہ تیار کر لیتے تھے اور یہ تیاری بھی اس شان کی ہوتی تھی کہ رسالہ کے پیکٹ بنے ہوتے ان پر پتوں کے سلپ چپکے ہوئے اور ٹکٹ لگے ہوئے رہتے تھے۔

مضمون نگار تو بہت سے لوگ ہوتے ہیں مگر شاہ صاحب کی زبردست خصوصیت ان کی زود نویسی تھی۔ کئی بار ایسا ہو کہ میری موجودگی میں کسی نے آکر مضمون لکھدینے کی فرمائش کی اور شاہ صاحب ان کو وعدہ دینے کے بجائے مضمون ہی دینے پر آمادہ ہو گئے فوراً ہی کاغذ اٹھا کر قلم برداشتہ مکمل مضمون پندرہ بیس منٹ میں تیار کیا اور فرمائش کرنے والے کے حوالے کر دیا۔ زود نویسی کا یہ عالم تھا کہ قلم کی نوک کاغذ پر رکھ دینے کے بعد گویا مضمون پورا کئے بغیر اٹھاتے ہی نہ تھے۔ مضمون کی مرتب شکل میں آمد ایسی مسلسل ہوتی تھی کہ درمیان میں قلم اٹھانے اور سوچنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی تھی۔

اسی طرح شاہ صاحب کی گفتگو جہاں بیحد دلچسپ اور قہقہہ بار ہوتی تھی وہیں سنجیدگی کے موقعہ پر نہایت مرتب اور پر مغز ہوا کرتی تھی وہ بڑی جلدی بات کی تہہ تک پہنچ کر اصل مقصود پر تبصرہ اور رائے زنی کر دیا کرتے تھے مگر اس کے ساتھ بات اس قدر مخلصانہ اور مشفقانہ انداز میں کہتے تھے کہ مخاطب ان کے لب و لہجے کی مٹھاس میں گم ہو کر یہ بھول جاتا تھا کہ شاہ صاحب کے ہاتھوں اس کی رائے کا کیا حشر ہو چکا ہے اور اس کے نقطۂ نظر کی کیا درگت بنی ہے۔

شاہ صاحب کا حلقۂ احباب خاصا وسیع تھا اور ہر مجمع میں وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھتے تھے۔ ہر ماحول کے مطابق اسی سطح کی گفتگو کرنا اور اسی قماش کے قہقہے لگوانے میں شاہ صاحب ید طولیٰ رکھتے تھے، وہ "دوستوں" کے دوست، چھوٹوں کے مشفق سرپرست اور پریشان خیال نوجوانوں کے مربی و مشیر تھے۔ خود میرا معمول ہمیشہ یہی تھا کہ اگر کسی الجھن اور پریشانی میں مبتلا ہوں تو قدم خود بخود شاہ صاحب کی محفل کی طرف اٹھتے تھے۔ مرحوم کے پاس ایک گھنٹہ بیٹھنے کے بعد ہی یہ بھول جایا کرتا تھا کہ کچھ دیر پہلے میں پراگندہ ذہنی کا شکار تھا۔ معاملات میں شاہ صاحب فوری رائے دینے کے عادی تھے مگر اپنی رائے پر اصرار نہیں کرتے تھے البتہ اپنی حد تک وہ اپنے نقطۂ نظر پر پختہ رہتے تھے۔ زندگی کے حوادث اور گردشیں کے حالات کا وہ بغور مطالعہ کرتے اور ان سے زندگانی کے اصول مستنبط کرنا مرحوم کی خاص ادا تھی۔

سنہ ۱۹۶۰ء کی دہائی سے تقریباً سنہ ۱۹۷۵ء تک ہمارا معمول تھا کہ روزانہ راقم الحروف، مولانا عبداللہ جاوید، مولانا عبداللہ سلیم اور مختار علی صاحب (امدادیہ بکڈپو) بعد نماز عصر شاہ صاحب کے مکان پر جاتے اور وہاں سے ان کو ساتھ لیکر چہل قدمی کیلئے جنگل جایا کرتے تھے جہاں ایک مخصوص کھیت میں ہرٹ پر جاکر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ برسہا برس تک یہ معمول رہا۔ اس چہل قدمی کے دوران شاہ صاحب سے ہر ہر موضوع پر باتیں ہوا کرتیں جس میں سیاسیات، معاشیات، شخصیات اور مذہبیات سے لے کر معاشرتی انقلابات تک کوئی موضوع ہماری زد سے محفوظ نہیں رہتا تھا۔ ان بحثوں میں شاہ صاحب کے مطالعے، ناقدانہ نظر اور قوت استنباط کا اندازہ ہوتا تھا وہ ہر مسئلے کا اچھی خاصی گہرائی کے ساتھ تجزیہ کر کے اس کے نتائج کو ذہن میں مجتمع کرتے اور پھر اس سے اپنا ایک اصولی نقطۂ نظر بنا لیتے تھے۔ ہر مسئلے کی تفصیلات کا ان کے ذہن میں کافی مواد رہتا تھا اور اپنی غیر معمولی قوت حافظہ کے بل پر وہ اس معاملے میں اپنی معلومات کے لئے مقابل سے خوب خوب داد تحسین وصول کرتے تھے۔

مگر شاہ صاحب کے وہ سب اصول و نظریات صرف تقریر و بیان کے لئے ہوتے تھے خود اپنی زندگی کو انھوں نے اصول و قواعد کے گورکھ دھندوں سے ہمیشہ آزاد رکھا۔ نہ کھانے پینے میں اصول، نہ پہننے اوڑھنے میں نفاست کا اہتمام نہ سونے جاگنے میں انضباط اور نہ لکھنے پڑھنے کے لئے اوقات کا تعین۔ لباس کے معاملے میں اپنے سراپا سے بے نیاز رہتے، پھٹا ہوا یا بے جوڑ پیوند لگا ہوا جیسا کپڑا ہاتھ لگا پہن لیا۔ دیکھنے والوں کے تبصروں سے ہمیشہ بے پرواہ رہے ایک دفعہ شاہ صاحب نے سردی کے موسم میں ایک بہت موٹے، کھردرے اور بیڈھب سے اونی کپڑے کی شیروانی بنوائی جس کا رنگ خوب سبز تھا اور بنائی ٹاٹ جیسی۔ میں، عبداللہ جاوید صاحب اور قاری عبداللہ سلیم صاحب وغیرہ دفتر رسالہ میں پہنچے تو اس شیروانی کو دیکھ کر بے ساختہ قہقہے لگائے اور شیروانی کا خوب مذاق بنایا کہ شاہ صاحب نے مطبخ کی خالی بوری خرید کر سبز رنگ میں رنگوالی ہے اور اس میں آستینیں لگا کر پہن لی ہے۔ ہم لوگ چڑھا رہے تھے اور شاہ صاحب دل کھول کر چڑھ رہے تھے، کبھی جھنجھلاتے اور کبھی قہقہے لگاتے۔ یہ تو شاہ صاحب کے ملنے والے سبھی جانتے ہیں کہ شاہ صاحب کے قہقہے بجائے خود قہقہہ آور ہوا کرتے تھے۔ کھانے پینے میں بھی شاہ صاحب کا کوئی نفیس مذاق نہ تھا نہ وقت کی قید تھی۔ کبھی رات کا کھانا عصر کے وقت کھا لیتے اور کبھی دوپہر کا کھانا صبح ناشتے کے ساتھ ہی ادا ہو جایا کرتا تھا۔ جو کچھ اور جس وقت سامنے ہوتا نہایت رغبت سے کھایا کرتے تھے۔ ہمیشہ کی عادت تھی کہ رات کو ۲، ۳ بجے سوتے سے اٹھ کر باورچی خانے میں پہنچتے اور

نعمت خانے سے کچھ نکال کر کھاتے۔ دفتر میں اپنی عادتیں سنا کر ان پر تبصرے کراتے اور قہقہے لگاتے تھے۔

لاپروائی اور لاابالی پن وہ اپنے طرز و ادا سے ظاہر کرتے مگر حقیقتاً وہ اپنے سینے میں ایک حساس اور درد مند دل رکھتے تھے۔ اپنے حلقۂ احباب میں سے کسی کی تکلیف و پریشانی سے بے چین ہو اٹھتے تھے اور ممکن حد تک اس کی چارہ گری کیا کرتے تھے۔ بڑے سے بڑے حادثہ پر ان کی سطح پُرسکون نظر آتی اور ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ کھیلتی ہوتی۔ لیکن جب کبھی اطمینان سے بات کرنے کا موقع ملتا تو ان کے دل کا درد لفظوں میں ڈھل کر ان کے ہونٹوں پر آجاتا اور وہ ایک بالکل بدلی ہوئی شخصیت کے روپ میں نظر آتے۔

والد محترم حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ شاہ صاحب کے سابق ہمزلف ہی نہیں ان کے مربی، ان کے بزرگ اور سرپرست بھی تھے مگر حضرت کی حیات تک کبھی کسی کو یہ احساس نہیں ہوا کہ حضرت سے شاہ صاحب کو اس قدر والہانہ محبت و عقیدت ہے۔ شاہ صاحب نے ہمیشہ اپنے حقیقی... جذبات پر حسب عادت لاابالی پن کے پردے ڈالے رکھے مگر حضرت کی وفات کے ساتھ ہی وہ سب حجابات اٹھتے چلے گئے اور حضرت کی جدائی کا صدمہ شاہ صاحب جیسے قلندر صفت انسان کی قلندری کو اپنے دھارے میں بہالے گیا۔ ہم نے مدت العمر شاہ صاحب کو روتے نہیں دیکھا تھا ہمارے نزدیک ان کی آنکھیں صرف مسکرانے اور ہنسنے کے لئے تھیں ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کا تصور بھی مضحکہ خیز تھا لیکن ان ہی آنکھوں کو ہم نے حضرت کے بعد زار زار روتے دیکھا۔ حضرت کے بعد شاہ صاحب نے سوا دو سال سے اوپر زندگی کی مہلت پائی مگر اس عرصے میں ان کا موضوع گفتگو اکثر حضرت کی شخصیت ہوتی بات بات پر ان کی آنکھیں بھر آتیں اور کئی بار وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتے۔ ہمارے لئے شاہ صاحب کا یہ ایک بالکل انوکھا اور نرالا روپ تھا۔

شاہ صاحب ایک ایسی مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک تھے کہ ہر محفل اور ہر انجمن میں اپنی مخصوص شوخ مزاجی کی بدولت ممتاز رہتے تھے۔ فقرے کسنا اور فقرے سننا ان کی ایک ایسی ادا تھی کہ ایک نووارد تک ان کی محفل کا بے تکلف ہمنشین نظر آنے لگتا تھا مگر ان فقرے بازیوں میں بھی مقابل کی مزاج داری و دلداری کا پہلو پیش نظر رکھتے تھے کسی کو شرمندہ یا بے حجاب کرنا کبھی ان کا مقصد نہیں ہوا۔ خیالِ خاطرِ احباب اس قدر تھا کہ کسی کی ادنیٰ سی گرانی سے پریشان سے ہو جاتے تھے اور جلد ہی اپنے پرمحبت برتاؤ سے اس کے دل کا میل دور کر دیتے تھے۔ دارالعلوم سے وابستگی کے اخیر دور میں شاہ صاحب کی محفلوں کا جو مجمع تھا اس میں راقم الحروف کے علاوہ مولانا عبدالحق صاحب مرحوم پیشکار دارالعلوم، مولانا عثمان صاحب مرحوم چیرمین، مولانا محمود احمد صاحب گل مرحوم ناظم تنظیم مولانا محمد سالم صاحب قاسمی۔ مولانا عبداللہ جاوید صاحب مولانا قاری عبداللہ سلیم صاحب، مولانا بدرالحسن صاحب ایڈیٹر الداعی، مولانا ظفیرالدین صاحب، مختار علی صاحب (امدادیہ) حکیم عزیزالرحمٰن صاحب اور کبھی کبھی مولانا محمد حسین صاحب بہاری ہوا کرتے تھے۔ اب اس مجمع میں سے کچھ حضرات تو دنیا ہی سے اٹھ گئے۔ کچھ ہندوستان سے باہر جا کے آباد ہو گئے اور باقی دیوبند ہی میں رہتے ہوئے بکھر گئے۔ کیونکہ وہ میر مجلس ہی چلا گیا جس کے دم سے کبھی وہ مجلسیں آباد تھیں۔ وہ قہقہہ بار شخصیت اور اس کی وہ زعفران زار محفلیں اب صرف ایک داستان پارینہ اور ایک بیتے دنوں کی یاد ہے اور اس یاد کو جمع کرنے بیٹھتے ہیں تو وہ ایک خلش بن کر دل و جگر کو برما جاتی ہے۔

ایک نامور ادیب و صحافی

میرے تاثرات و تعلقات

از:۔ مولانا محمد ارشد اعظمی (مقیم وارانسی) فاضل مدرسہ وصیۃ العلوم الٰہ آباد

دینی رُخ پر مضمون نگاری کا شوق و جذبہ مجھے ابتدائی اور طالب علمی ہی کے دور سے رہا، اس کے لئے کاوش بھی کرتا رہا، ملک کے دو نامور صاحب قلم و محقق و انشاپرداز عالم دین مردانِ حق آگاہ کی تحریروں سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا ایک تو حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رح کی کتاب "خطباتِ مدراس" سنکر اور پڑھ کر، دوسرے حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رح کی کتاب "النبی الخاتم" کی سماعت و مطالعہ دونوں سے فیضیاب ہوکر، اور ماشاء اللہ دونوں بزرگ بارگاہ اشرفی تھانہ بھون سے سندِ اعزاز پائے ہوئے۔ علامہ ندوی رح تو حکیم الامت رح کے عاشق زار و جاں نثار، اور مولانا گیلانی رح کے بارے میں حضرت مجدد الملت رح نے ان کی کتاب "النبی الخاتم" کے مطالعہ کے بعد فرمایا تھا کہ "مناظر احسن کے سارے ہی مناظر، احسن ہیں (او کما قال رح)

اسی طرح مضمون نگاری کے سلسلے میں دورانِ تعلیم دو تین ہلکے پھلکے مضامین معروف ماہنامہ "رضوان" لکھنؤ میں شائع ہوئے، مگر روشنی دکھانے والا اور قلم کی نوک پلک درست کرانے والا ترقی کی راہ دکھانے والا اس وقت کوئی میسّر نہیں ہوسکا جب تدریسی دور میں قدم رکھا تو اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے مخصوص گنی چنی شخصیتوں مگر اس میدان کے شہ سواروں کے زیر سایہ کام کرنے اور صلاحیت کو جلا بخشنے کا زرین موقع نصیب فرمایا۔ جناب سلام اللہ صدیقی بنارسی، مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر صاحب رح، جناب مولانا سید احمد صاحب اکبرآبادی رح، جناب قاضی محمد اطہر صاحب مبارکپوری، جناب مولانا محمد نعیم صاحب ندوی ـــ رسالہ "دارالعلوم" دیوبند میں جولائی ۱۹۷۱ء میں پہلا مضمون "سنت قرآن کریم ہی کی طرح ایک دلیلِ شرعی ہے" کے عنوان سے شائع ہوا اور اصل یہ ایک عربی مقالہ تھا ایک عربی عالم استاذ عبدالرحیم عبداللہ صالح کا۔ جو عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی" میں اس وقت شائع ہوا تھا اور مجھے بہت پسند آیا اس کا رواں و شگفتہ ترجمہ کرنے کے بعد مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی سابق استاذ دارالعلوم دیوبند کے پاس روانہ کیا۔ موصوف نے ازہر شاہ رح کو دیا شاہ صاحب نے سراہا اور دارالعلوم میں شائع کیا، بعد ازاں اس رسالہ کی ایک کاپی بھی مجھے بھیجی، اسی وقت سے شاہ صاحب رح سے تعلقات وسیع

ہوتے چلے گئے اور ان کی فرمائش پر رسالہ دارالعلوم کا
خریدار بنا و بنایا، اور الحمدللہ علیٰ احسانہ مختلف موضوعات
پر بہت سارے مضامین شائع ہوئے اس حقیقت کا اعتراف
خود حضرت مولانا محمد سالم صاحب مدظلہ اور مولانا محمد ظفیر الدین
صاحب نے میری معروف کتاب "تذکرہ شاہ طیب بنارسی رح"
کے مقدمہ میں فرمایا اور یوں رقم طراز ہوئے کہ:۔

" مولانا محمد ارشد اعظمی زید مجدہ اپنے علمی
مقالات و مضامین کی وجہ سے کافی مشہور
و مقبول ہیں۔ الخ"

اسی طرح بنارس کے صحافی و شاعر تاج الدین اشعر نے
لکھا کہ:۔

" آپ کے مضامین و مقالات بعض معیاری
رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں الخ"

مولانا ازہر شاہ صاحب رح سے غائبانہ تعلقات
اتنے گہرے ہو گئے تھے کہ میری طرف سے ذرا بھی کوتاہی
ہوتی فوراً طلب مضامین کے لئے گرامی نامہ صادر ہوتا
چنانچہ ان کے مکاتیب کا ایک سلسلہ ہے اس میں خواہش
کا اظہار بھی ہے اور توجہ مبذول کرانے کا کردار بھی۔
شکایتوں کا انبار بھی ہے اور ہمدردی کا جذبۂ بیقرار بھی
اصلاح کا تحفۂ عطر بار بھی ہے اور دل سے منوانے کا پیار
بھی اس میں تواضع و انکسار بھی ہے اور شفقت گہربار بھی؛
مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند مکاتیب کے اقتباسات
نذر ناظرین کر دیئے جائیں تاکہ جوہر عیاں ہو جائے۔

" ۲۶/اپریل ۸۲ء

محترم سلام مسنون۔

کافی دنوں سے آپ کا کوئی مضمون رسالہ
دارالعلوم کے لئے نہیں ملا۔ ازراہِ کرم
تازہ کوئی مضمون رجسٹرڈ لفافہ میں جلد روانہ
فرما کر ممنون فرمائیں۔ امید ہے کہ آپ بخیریت
ہوں گے اور دعائے خیر میں یاد فرمائیں گے۔

سید ازہر شاہ قیصر۔"

دوسرا مکتوب ملاحظہ ہو جس میں اصلاحی پیغام بھی ہے
اور شدت تعلق کا کیف آور جام بھی:۔

" ۲۱ر رمضان سنہ ۱۴۰۲ھ

مکرمی سلام مسنون

مضمون کی طلب میں یہ خط تحریر ہے، مگر اتنی عنایت
کیجئے کہ ایک تو ہر مضمون کے شروع میں جو آپ
نوٹ (ذیلی تعارف) لکھتے ہیں وہ نہ لکھیں،
دوسرے حواشی لکھنے سے پرہیز کیجئے۔ جو مضامین
حواشی میں لکھتے ہیں وہ اندر مضمون میں ہی لکھیئے
زائد حواشی پڑھنے والوں کو تکلیف دیتے ہیں۔

تیسرے دور موجود کے جن مصنفین وغیرہ
کا نام درمیان میں آئے وہ بہت زیادہ تعریفی
القاب کے ساتھ نہ ہوں، بس مختصر سی بات "مولانا
قاضی ..... الخ

امید ہے کہ آپ بخیریت ہونگے، رمضان
کی دعاؤں میں احقر کو یاد فرمائیں۔ عرصہ سے
صحت خراب ہے ایک لڑکے اور لڑکی کے
رشتہ کے لئے بھی فکر مند ہوں حق تعالیٰ
ان فرائض سے مجھے جلد فارغ فرمادیں والسلام

سید محمد ازہر شاہ قیصر۔"

بتائیے کہ اس مفاد پرستی اور خود غرضی کے دور و ماحول
میں کون رہنمائی کرتا ہے؟ یا قیمتی باتیں بتاتے اور تحریر کرنے
کے لئے وقت لگاتا ہے؟ یا توجہ کرتا ہے مگر جن نفوس
کو اللہ تعالیٰ نے خلوص و محبت و ہمدردی کی دولت ارزانی
فرمائی ہے وہ متلاشی اور جویائے حقیقت کو مل ہی جاتے
ہیں۔

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود
ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

ہر کجا دردے دوا آنجا رود
ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

شاہ صاحب کس قدر مخلص و ہمدرد معلوم ہوتے ہیں اور کس طرح صفات محمودہ سے متصف و معروف تھے کہ اس کا اظہار ہو کر رہا چنانچہ ان کی رہبری کی بدولت اور خصوصی توجہ کی جاوپر بیشمار مضامین نوع بہ نوع کے ماہنامہ دارالعلوم کے زریں صفحات پر عیاں ہوئے جو دارالعلوم کی فائل میں ریکارڈ ہیں۔ اور شاہ صاحب کے دکھائے ہوئے نقوش ہی پر میں کام کرتا تھا لیکن اگر کبھی میں ہوش نہ رہا تو ہدایت نامہ صادر ہو کے رہتا۔ لیجئے ملاحظہ فرمائیے

"۹ر شوال سنہ ۱۴۰۰ھ

مکرمی سلام مسنون

میں نے پہلے لکھا تھا کہ رسالہ کیلئے رجسٹرڈ لفافہ پر کوئی مضمون روانہ کیجئے مگر اس میں حواشی نہ ہوں حواشی اندر کھپا دیجئے الخ

سید ازہر شاہ قیصر"

الحمدللہ شاہ صاحب رح کی مہربانیوں سے اور مسلسل طلب پر قلمی کاوشوں کا موقع میسر آیا۔ جس وقت حضرت شیخ تاج علیی جونپوری رح پر مضمون لکھا جو الفرقان جنوری سنہ ۱۹۷۶ء لکھنؤ میں شائع ہوا تو موصوف رح کا توصیفی اور ہمت افزائی کا مکتوب گرامی صادر ہوا جس میں بڑی پسندیدگی کا اظہار تھا۔

لیکن ساتھ ہی ازہر شاہ رح مصروفیات اور کاموں کے انبار میں بھی دبے رہتے تھے جس کا اظہار اپنے مکتوب میں اس طرح فرمایا کہ:۔

۱۵ر رمضان سنہ ۹۹ھ

مکرمی سلام مسنون

جھوسی الہ آباد کے متعلق آپ کا مضمون جلد شائع ہو رہا ہے ... ... رمضان کی دعاؤں میں مجھے بھی یاد رکھیے، عرصہ سے میری صحت بہت خراب ہے لیکن زندگی کی ذمہ داریاں ہیں جنھیں کھینچ رہا ہوں۔

سید ازہر شاہ قیصر"

یہ ایک حقیقت ہے کہ صلاحیت واستعداد پیدا کرانے اور صاحب صلاحیت سے کام لینے کا ملکہ اور سلیقہ انھیں خوب حاصل تھا اور جس میدان کے شہسوار تھے اس کے جوہر شناس بھی تھے ان کے دور ادارت میں ماہنامہ "دارالعلوم" بیش بہا علمی مضامین وانمول جواہرات ونوادرات کا حامل ہوتا تھا اور شاہ صاحب کا حسنِ ذوق ترتیب و انتخاب میں چار چاند لگا دیتا تھا اور معنوی و باطنی اعتبار سے دلچسپ اور "بباطن می کشد ارباب معنیٰ را" کا مصداق تھا۔

اس سلسلہ میں مجھ سے بڑا تعلق رکھتے تھے اور ایک مضمون پہنچا کہ دوسرے کے لئے مکتوب قیصر صادر ہوجاتا چنانچہ میری توجہ دیار پورب کے علمائے حقانی کے تذکروں کی طرف ہوئی تو لکھنا شروع کیا اور "دارالعلوم" میں اشاعت شروع ہوئی تو معروف مؤرخ جناب قاضی محمد اطہر مبارکپوری نے لکھا کہ:۔

"خوشی کی بات ہے کہ ادھر پچھلے چند سالوں سے تلافیٔ مافات کے طور پر دیار پورب کے علماء و مشائخ کی سوانح نگاری کا ذوق پیدا ہو رہا ہے الخ....

مولانا محمد ارشد اعظمی وغیرہ کے متعدد مقالات و مضامین یہاں کے علماء و مشائخ کے بارے میں شائع ہو چکے ہیں الخ

۱۹ر جون سنہ ۱۹۷۸ء

یاد پڑتا ہے کہ موصوف نے جب اپنا پریس قائم کیا تو اس سے مطلع فرمایا تھا اور دعا ہی کی گذارش تھی

جس طرح مولانا سعید احمد اکبر آبادی رح کی زیارت و ملاقات نہیں ہوئی مگر تعلق غائبانہ اور شفقت و محبت کا معاملہ تھا بالکل اسی طرح مولانا ازہر شاہ صاحب قیصر رح سے بھی ملاقات نہیں ہوئی۔ اجلاس صد سالہ کے موقع پر دارالعلوم حاضری ہوئی اور قیام بھی رہا مگر اس ہجوم انددحام میں تلاش کرنا اور پھر ان تک پہنچ جانا "کارِ عظیم" سے کم نہیں تھا بہرحال حقیقۃً وہ ایک تاریخ، بلند پایہ نقاد ادیب و شاعر تھے۔ موصوف کی کتاب "یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ" عظیم شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے قلمی کارنامے جگمگاتے لعل و جواہر ہیں جس کی تابناکی اور درخشندگی سے ماضی قریب اور اردو کا سرمایہ ضیا بار ہے۔ اللہ تعالیٰ درجاتِ عالیہ سے کامراں فرمائے اور رحمتوں کے پھول برسائے

دارالعلوم سے علیحدگی کا کچھ کیا بلکہ بہت کچھ اثر ان کے اوپر تھا اور وہ ایک قسم کی ضیق میں مبتلا ہو گئے تھے لیکن مرور ایام نے یہ بھی دکھایا تھا۔ موصوف کے صاحبزادہ گرامی قدر جناب مولوی نسیم اختر شاہ نے جب رسالہ "طیب" جاری کیا تو برادر عزیز مولوی احمد نصر سلمہ نے بتلایا کہ مولانا ازہر شاہ صاحب کا مکتوبِ گرامی آیا ہے انھوں نے لکھا ہے کہ رسالہ طیب جاری ہوا ہے اس کی خریداری قبول کریں اور مضامین بھی ارسال کریں تو میں نے تعمیل حکم میں (بتاخیر ہی سہی) رسالہ بھی اپنے نام جاری کرایا اور مضامین بھی ارسال کئے۔ ماشاء اللہ حقیقت یہ ہے کہ "طیب" ہم کو بہت پسند آیا ظاہری حسن سے آراستہ اور باطنی خوبیوں سے پیراستہ "افادیت میں لاثانی اور حقائق کے اعتبار سے بحر المعانی۔ اللہ کرے اور تابندہ درخشندہ ہو

اب آخر میں شاہ صاحب رح کی ایک نعت جو کسی زمانہ میں دارالعلوم میں شائع ہوئی تھی اور پسند آئی نذرِ ناظرین ہے۔

غنچۂ دل گھلا کھلا، صلِّ علیٰ محمدؐ
باغ جہاں مہک اٹھا، صلِّ علیٰ محمدؐ

صبحِ ازل کی آبرو، شامِ ابد کی آرزو
تشنہ لبوں کا آسرا، صلِّ علیٰ محمدؐ

حُسن کی اک ادا ہے وہ عشق کی اک صدا ہے وہ
فضلِ خدا کی انتہا، صلِّ علیٰ محمدؐ

کفر کی ظلمتوں کو وہ بقعۂ نور کر گیا
سارا زمانہ کہہ اٹھا، صلِّ علیٰ محمدؐ

ان کی ہدایتیں درست ان کی روایتیں بجا
مرکزِ خیر اور ہدیٰ، صلِّ علیٰ محمدؐ

تیرے وجودِ پاک سے کفر کا زور گھٹ گیا
شرک کا نام مٹ گیا، صلِّ علیٰ محمدؐ

سارے جہاں میں غلغلہ تیرے ظہور کا ہوا
سرد ہوا صنم کدہ، صلِّ علیٰ محمدؐ

قیصرِ غم نواز کو رحمتِ خاص سے ملے
آپ کا لطفِ بے بہا، صلِّ علیٰ محمدؐ

اس میں شک نہیں کہ اس نعت میں عقیدت و محبت کے ساتھ ذوق و شوق کے جذبات رخشندہ و بیدار ہیں اور انداز بڑا والہانہ ہے۔

قیصر شاہ رح نے جو قرطاس کے صفحات پر گہرے نقوش و تاثرات چھوڑے ہیں وہ کاروانِ گم گشتہ کے لئے مینار ہیں۔ اللہ تعالیٰ رخشندگی و تابندگی عطا فرمائے اور اپنی عنایتوں سے مالا مال فرمائے

(دہلی)

حیات و موت کی کشمکش ابتدائے آفرینش سے جاری ہے اور جب تک دنیا باقی ہے یہ سلسلہ بھی قائم رہیگا. اس لافانی دنیا میں جو بھی آیا وہ جانے کے لئے ہی آیا ہر شخص کو ایک نہ ایک دن موت سے ہم کنار ہونا ہے۔ یہی وہ سچائی ہے جس کے سبب اس جہان گذراں میں بھی کبھی کبھی۔ زیست کی بے ثباتی کا احساس اس قدر شدت سے ہوتا ہے کہ بادِ نسیم کی مہک، کلیوں کی خوشبو، غنچوں کی مسکراہٹ، پھولوں کی دل آویزی، شبنم کی رعنائی اور آفتاب تازہ کی روپہلی کرنوں کی دلربائی سے بھی ڈر محسوس ہونے لگتا ہے۔ زندگی کے فنا کے تصور سے گمان ہوتا ہے جیسے ذہن اور روح دونوں تاریکیوں کے سمندر میں ڈوبتے چلے جارہے ہیں۔ مرگِ ناگہانی، داغِ مفارقت، دائمی جدائی۔ کئی بار ذہن کی خلش کہہ اٹھتی ہے کہ کتنے بے رحم، کتنے بھیانک ہیں قدرت کے یہ ضابطے جن میں دنیا جکڑی ہوئی ہے۔ انسان ارمانوں کی دنیا سجاتا ہے، تمناؤں کے محل تعمیر کرتا ہے، آرزوؤں کے چراغ جلاتا ہے امیدوں کی شمعیں روشن کرتا ہے لیکن موت کا تصور ایک سنگِ گراں بن کر شعور کے آئینوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی آئینے کے انہی ٹکڑوں سے منعکس ہوتی ہے۔

بعض انسانوں کی موت سے نہ صرف ان کے دوست واحباب اور عزیز واقارب ہی سوگوار ہوتے ہیں بلکہ ایک وسیع حلقہ ان سے متاثر ہوتا ہے ایسی شخصیتوں کے اوجھل ہوجانے سے ایک ایسا خلا پیدا ہوجاتا ہے جس کے پُر ہونے کی دور دور تک کوئی صورت نظر نہیں آتی.

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر بھی ایسی ہی ایک قدآور شخصیت تھے انھوں نے دیوبند مکتب فکر، اردو صحافت اور انشا پردازی کے میدان میں اپنے قلم گہربار سے جو گہرے نقوش چھوڑے ہیں وہ ان کے دوستوں اور رفقاء کو زندہ نقش معلوم ہوتے ہیں. یہ درست ہے کہ عظیم اور جلیل ہستیوں کے اٹھ جانے کے بعد بھی نظام کائنات چلتا رہتا ہے، چاند اپنے وقت پر نکلتا ہے، ستارے حسب معمول چمکتے ہیں، سمندروں میں طغیانیاں آتی ہیں، دریاؤں میں تلاطم برپا ہوتے ہیں، ندیوں میں سیلاب آتے ہیں لیکن قحط الرجال کے اس دور میں اردو دنیا سے جو ہستی بھی رخصت ہوتی ہے اس کا نعم البدل نظر نہیں آتا۔ ویسے بھی دیوبند مکتب فکر پر کچھ برسوں سے پت جھڑ کا موسم محیط ہے حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رح، مولانا سعید احمد اکبرآبادی رح، مولانا محمد عثمان رح، مولانا سید محمد ازہر قیصر رح، مولانا فاضل حبیب اللہ رشیدی رح سبھی مرحوم

ہو گئے ان سے کتنی محفلیں اجڑ گئیں۔ یہ لوگ کتنے دلوں کی دھڑکن تھے، کتنے گوشوں کی بہار تھے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

مولانا قیصر کی وفات سے دیوبند مکتب فکر ہی سونا نہیں ہوا اردو حلقوں کو بھی بڑی شدت سے محرومی اور لاچاری کا احساس ہوا ہے۔ کسی عظیم انسان کی شناخت اس کی موت کے بعد ہوتی ہے اور اس کے اوصاف کا علم اس کے چلے جانے کے بعد ہوتا ہے۔ مولانا مرحوم کو زمانے کی بہت ہی کروٹوں سے واسطہ پڑا انھیں گردش حالات کی وجہ سے شاہراہِ حیات کے ایسے ایسے دشوار موڑوں سے گزرنا پڑا جہاں سے کسی معمولی شخص کو گذرنے کا حوصلہ نہیں ہو سکتا مگر مولانا ان تمام راستوں سے ہنستے مسکراتے اور چہچہاتے ہوئے گزر گئے۔ ان کے عزم راسخ کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے پرآشوب دور میں وہ وطن چھوڑکر سرحد کے اس پار نہیں گئے وہ پاکستان جا سکتے تھے اور وہاں کسی اچھے منصب پر فائز ہو سکتے تھے مگر انھوں نے سرزمین دیوبند سے ناطہ توڑنا گوارا نہیں کیا جہاں انکے اسلاف کی ہڈیاں دفن ہیں انھیں ہندوستان میں رہ کر وطن، اسلام اور اردو کی خدمت کرنی تھی انھیں اپنے ہندوستانی مسلمان بھائیوں کے مستقبل کا غم ستا رہا تھا لہٰذا انھوں نے اپنی فراستِ ایمانی سے کام لیتے ہوئے اپنے کنبے کے ساتھ ہندوستان میں رہنے کا دلیرانہ فیصلہ کیا تاکہ وقت کا مؤرخ خاندانِ انوریہ پر وطن سے بے وفائی کا الزام نہ لگا سکے آج مولانا مرحوم کی زندگی میری نگاہوں کے سامنے فلم کی تصویروں کی طرح متحرک ہے ان کی یادوں کے زخم ہرے ہو رہے ہیں کانپتے ہاتھوں کی لرزتی انگلیوں سے ان یادوں کو سمیٹنے کی سعی کر رہا ہوں۔

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر سے میری پہلی ملاقات دارالعلوم کے جشن صد سالہ کے موقعہ پر ہوئی جس میں انھوں نے مجھے مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا تھا اور میرے لئے VIP کا پاس جاری کیا تھا تقریبات کے آغاز سے ایک روز قبل ہی میں دیوبند پہنچ گیا تھا جشن کے انتظامات کی کئی ذمہ داریاں مولانا کے سپرد تھیں اور وہ بیحد مصروف تھے انھوں نے بتایا کہ مہمانوں کی تعداد توقع سے کہیں بڑھ گئی ہے اور ان کے قیام کا جو بھی اہتمام کیا گیا تھا اس میں دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں شب و روز کی کوشش کے باوجود ان کی رہائش کا مناسب انتظام ہوتا نظر نہیں آتا۔ سوچ رہا ہوں آپ جیسے مہمانوں کو کس جگہ ٹھہراؤں۔ میں نے کہا مولانا آپ میری فکر نہ کریں میں بھیڑ بھاڑ کو دیکھتے ہوئے مظفر نگر کے ایک ہوٹل میں اپنے رہنے کا بندوبست کرا آیا ہوں دیوبند پہنچنے کے لئے روزانہ صبح و شام بس کا سفر کرنا پڑیگا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

جشن صد سالہ کے دوران مولانا قیصر سے کئی بار سامنا ہوا لیکن رسمی جملوں سے زیادہ بات چیت کی نوبت نہیں آئی تقریبات کے اختتام پر جب میں شاہ منزل میں حاضر ہوا تو وہ آرام فرما رہے تھے کیونکہ جشن کے انتظامات نے انھیں بہت تھکا دیا تھا۔ اردو کے ساتھ ساتھ مجھے صحافت سے ہمیشہ گہرا لگاؤ رہا ہے اور مولانا تاریخ ساز صحافی تھے لہٰذا اس موضوع پر ان سے بات ہونا قدرتی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں کے لاہور سے شائع ہونے والے روزنامہ اخبار "زمیندار" سے قیصر صاحب نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا تھا اس کا ذکر آتے ہی انھوں نے فرمایا کہ "زمیندار" ایک اخبار کا نہیں ایک ادارے کا نام تھا جس سے مولانا عبدالمجید سالک، علامہ نیاز فتحپوری، مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبداللہ العمادی، مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی قاضی محمد عدیل عباسی، منشی وجاہت حسین جھنجھانوی، مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش، علامہ حسین میر کاشمیری، حاجی لق لق اور جناب مضطر ہاشمی جیسے ممتاز اہل قلم وابستہ رہے۔ "زمیندار"

کے متعلق بعض دلچسپ اور معلومات افروز باتیں بیان کرتے ہوئے کہنے لگے کہ مولانا حسرت موہانی کے بعد مولانا ظفر علی خاں پہلے مسلم گریجویٹ تھے جو اردو صحافت میں شامل ہوئے جس سے اردو اخبار نویسی کا درجہ بلند ہوا اور اس زبان کے جاننے والوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ صحافت ایک معزز پیشہ ہے۔ "زمیندار" نے نہ صرف عوام میں اخبار بینی کا ذوق پیدا کیا بلکہ ان میں حب الوطنی کا جذبہ بیدار کیا، اسکے ساتھ ہی مسلمانوں کو اتحاد بین المسلمین کا بھولا ہوا درس بھی یاد دلایا۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جب یہ اخبار صوبہ سرحد میں پہنچتا تو پٹھان ایک آنہ دے کر "زمیندار" خریدتے اور ایک آنہ پڑھوائی کے لئے دیتے۔ کانپور میں جب مچھلی بازار کی مسجد کے انہدام کا سانحہ پیش آیا تو زمیندار نے برطانوی حکومت کے خلاف سخت موقف اختیار کیا۔ کانپور کے چمڑے کے سوداگروں نے ایک قاصد کے ہاتھ دو ہزار روپے کی رقم مولانا ظفر علی خاں کو بھجوائی اور لکھ بھیجا کہ زمیندار اپنے سٹینڈ پر ڈٹا رہے۔ ان دنوں جب زمیندار کا بنڈل کانپور پہنچتا تو اس کا ایجنٹ دوکان کا دروازہ اندر سے بند کر لیتا تاکہ گاہک بے تابی اور جوش کے عالم میں اخبار چھین کر نہ لے جائیں صبح دس بجے تک تو کانپور میں یہ اخبار ایک آنے میں بکتا مگر اس کے بعد آٹھ آنے میں بھی مشکل سے دستیاب ہوتا۔ اس زمانے میں زمیندار کی روزانہ اشاعت تیس ہزار تھی۔ اس دور میں اور اسکے بعد بھی حصول آزادی تک اردو کے کسی روزنامہ کو اتنی اشاعت حاصل نہ ہوئی۔

گفت گو جاری تھی کہ اتنے میں خاندان انوریہ کے دیرینہ مداح اور میرے دیرینہ مخلص ماہنامہ الرشید کے مدیر اعلیٰ مولانا فاضل حبیب اللہ رشیدی تشریف لے آئے۔ ان کے ساتھ قصور میں مقیم روزنامہ "مشرق" کے نمائندے حافظ عبدالقادر انور بھی تھے۔ بھاولپور کے مشہور زمانہ مقدمہ میں علامہ سید انور شاہ کاشمیری رح کے تاریخی بیان کا ذکر چھڑ گیا تو مولانا قیصر نے اس مقدمہ سے متعلق بعض اہم باتیں بیان کیں۔ میں وہاں سے رخصت ہونے لگا تو قیصر صاحب نے اپنی کتاب "یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ" کی ایک جلد اپنے مبارک دستخط کے ساتھ مجھے عنایت کی اور اشاعت حق کا جشن صد سالہ نمبر بھی بھجوا دیا۔

مولانا قیصر سے میری دوسری ملاقات سید راحت شاہ کی شادی کی تقریب میں ہوئی۔ مولانا نے مجھے خاص طور سے اس میں شامل ہونے کے لئے بلایا تھا۔ دعوت ولیمہ میں ممتاز شخصیتوں کا جو اجتماع تھا اس سے دیوبند اور اس کے گرد و نواح میں مولانا کی مقبولیت و ہر دلعزیزی صاف عیاں تھی خاندان انوریہ اپنی متنوع علمی خصوصیات کی بنا پر پورے علاقے میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس خاندان کے افراد اپنی دینی عظمت کی بنا پر ہندوستان بھر میں امتیازی شہرت رکھتے ہیں۔ دعوت ولیمہ میں مولانا قیصر کے چھوٹے بھائی مولانا سید انظر شاہ مسعودی سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا جو اُن دنوں دارالعلوم کے قائم المقام صدر المدرسین تھے اور دیوبند سے اپنا پندرہ روزہ اخبار "یثرب" بھی نکالتے تھے۔ مولانا سید انظر شاہ صاحب کی شخصیت ان کی بے پناہ علمی و فکری صلاحیتوں کی آئینہ دار تھی اور انھوں نے پہلی ہی ملاقات میں میرے قلب و ذہن کو گرفت میں لے لیا خاندان انوریہ کے بعض دیگر افراد سے بھی بات چیت کی سعادت حاصل ہوئی اور میں نے محسوس کیا کہ اس گھرانے کے ساتھ میرا جنم جنم کا رشتہ ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ اس خاندان میں سکھ اور دکھ کے ہر موقع پر ناچیز کو یاد کیا جاتا ہے

مولانا سے میری تیسری اور آخری ملاقات قریباً چار سال قبل ہوئی جب میں انجمن ترقی اردو یوپی کی

سالانہ کانفرنس میں شامل ہونے کے لئے سہارنپور گیا کانفرنس سے فارغ ہوکر میں چند گھنٹوں کے لئے دیوبند گیا تاکہ مولانا کی قدم بوسی کا شرف حاصل کرسکوں مولانا نے ماہنامہ "دارالعلوم" میں میرے چند مضامین شائع کئے تھے جس کی وجہ سے مجھے علماء دیوبند کے قریب ہونے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ ہندوستان اور پاکستان کے مشہور اخبارات ورسائل میں میری تخلیقات شائع ہوئی ہیں لیکن "دارالعلوم" جیسے مؤقر جریدہ میں چھپنا میرے لئے بڑے فخر کی بات تھی۔ شاہ منزل پہنچا تو مولانا قیصر کا وہی عالمانہ انداز گفتگو تھا لیکن وہ کچھ بجھے بجھے نظر آرہے تھے۔ دارالعلوم سے ان کا عملی تعلق ٹوٹ چکا تھا۔ جن لوگوں کے ساتھ عمر گذاری تھی وہ ان سے بچھڑ چکے تھے بلکہ بہت سے پرانے ساتھی ان کے خلاف ہوگئے تھے۔ یہ ان کی زندگی کا عجیب تجربہ تھا، جن لوگوں نے ان سے ادب اور صحافت کے سبق سیکھے تھے وہی اپنے نوک قلم سے ان کے جسم ناتواں کی چیر پھاڑ کررہے تھے۔ عجیب افسردہ زندگی تھی، میں ان کے زخموں کا کیا مداوا کرسکتا تھا۔ عرض کیا "مجھے دارالعلوم سے عشق ہے آپ اجازت دیں تو دارالعلوم کے تنازعہ کو ختم کرانے کے لئے میں بھوک ہڑتال کرنے کو تیار ہوں، شاید میری تڑپ کو دیکھ کر کسی کا ضمیر جاگ اٹھے۔

میں یہ تو نہیں جانتا کہ حق پر کون ہے اور غلط کون۔ لیکن دارالعلوم سب کی مادر علمی ہے اور ہر ایک کو اپنی ماں کی آغوش میں بیٹھنے کا حق حاصل ہے۔"

مولانا قیصر نے فرمایا "میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں لیکن بھوک ہڑتال از روئے شریعت ممنوع ہے۔ سب اللہ پر چھوڑ دو وہی کارساز ہے۔"

دارالعلوم کے تنازعہ سے قیصر صاحب کی زندگی بکھر کر رہ گئی تھی بلکہ وہ اندر سے ٹوٹ چکے تھے۔ اُس دارالعلوم کے دروازے اُن پر بند ہوچکے تھے جس کے چپے چپے پر اُن کے قدموں کے نشان نقش تھے۔ غالباً یہی غم انھیں موت کی گود میں لے گیا۔

میں دارالعلوم کے ارباب اختیار سے اللہ کے نام پر التجا کرتا ہوں کہ وہ مادر علمی کے دروازے سبھی بیٹوں کے لئے کھول دیں تاکہ ایسا سانحہ پھر نہ ہو۔

یقین کیجئے کہ کرنے والے اس کارساز کا ہر کام اتنا ہی باقاعدہ، اور اس کی حکومت وسلطنت کا ہر قانون اتنا ہی مضبوط اس کا ہر آئین جہانداری اتنا ہی قوی اس کا ہر طریقہ ہر دستور اور ہر عادت اتنی ہی بے پناہ ہے۔

وہ اپنی تخلیق کے مقصد کو بھلا دینے والوں کو اس جرم عظیم کی پاداش میں ضرور سزا دے گا۔

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر
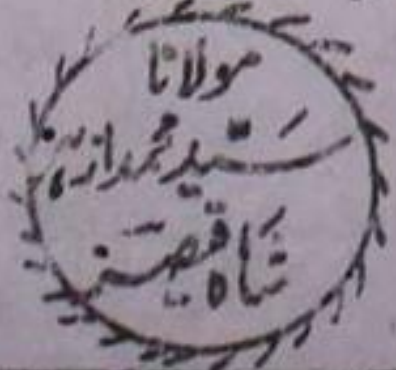
محترم جناب سید ازہر شاہ صاحب قیصر کا حادثہ وفات غیر متوقع اور اچانک نہیں ہوا بلکہ مرحوم کے ایک عرصہ سے علیل ہونے کی وجہ سے ہر وقت اس حادثے کا دھڑکا لگا رہتا تھا مختلف عوارض کا نشانہ بنے رہنے کی وجہ سے نحیف و ناتواں تو بہت پہلے سے چل رہے تھے تاہم شاید سقوط دار العلوم دیوبند کے حادثے نے مرحوم کی صحت کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا وہ اس موضوع پر زبان سے جو کچھ کہتے تھے اس سے ان کے دل کے کرب کا اندازہ ہوتا تھا اور اسی میں بتدریج وہ گھلتے چلے گئے جب بھی بازار میں یا کہیں اور ملاقات ہوتی وہ بات کرتے اپنی مسلسل بیماری اور ضعف کا تذکرہ کرتے لیکن ان کی باتوں کے پس پردہ جسم و روح کو کھائے جانے والا غم صاف جھلکتا نظر آتا تھا۔ بالآخر ایک روز بیماریوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے موت نے ان کو شکست دے دی۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے اس سے کسی کو مفر نہیں تاہم مرنے والے کے کام اور اس کی خوبیاں بعد میں ضرور یاد آتی ہیں۔ مرحوم کی وفات کی خبر میں نے سنی تو دل کو ایک دھکا لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ ایک مخلص، بے لاگ تجربہ کار، ہمدرد، ہمہ رنگ سے ہم محروم ہوگئے۔ ان سطور کے لکھتے ہوئے نہ جانے کتنی باتیں کتنی یادیں مجھ کو یاد آرہی ہیں جن کے سہارے میں مرحوم کا مختصر سا ذکر خیر یہاں کر رہا ہوں۔

تقریباً بیس پچیس برس پہلے کی بات ہے جب مجھے مرحوم سے پہلی بار تعارف کا موقعہ میسر آیا حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب (نور اللہ مرقدہ) کے یہاں بعد مغرب علمی نشست ہوتی تھی میں اکثر اس میں حاضر ہوتا اور حضرت حکیم الاسلام رہ کے ارشادات سے مستفید ہوتا تھا ایک روز گیا تو معلوم ہوا کہ حضرت سفر میں گئے ہیں اس لئے مجلس نہیں ہوئی نشست گاہ میں دو تین حضرات آپس میں گفتگو کر رہے تھے میں بھی ایک طرف بیٹھ گیا جب گفتگو ختم ہوگئی تو ایک صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے بہت سی باتیں کیں بہت سی باتیں مجھ سے پوچھیں اور کہنے لگے کہ میں تمہیں جانتا ہوں بھلے ہی تم مجھے نہ پہچانتے ہو۔ مرحوم کی باتوں میں ہمدردی کی جو ایک لہک تھی میں اس سے اچھا خاصا متاثر ہوا بطور خاص مرحوم نے باصرار جس چیز کا تقاضا کیا وہ یہ تھا کہ تم ماہنامہ دار العلوم کے لئے مضامین لکھا کرو یہ دار العلوم کا تم پر حق بھی ہے اور تمہارے لئے بہت مفید بھی چنانچہ میں نے مرحوم کے حکم کی تعمیل میں مضامین لکھے ماہنامہ دار العلوم پابندی سے میرے نام آنے لگا کبھی کبھی تبصرہ کے لئے میرے پاس کوئی کتاب بھجوا دیتے میں تبصرہ لکھ کر بھجوا دیتا۔ مضمون وغیرہ کی اشاعت کے بعد ملاقات ہوتی تو میری حوصلہ افزائی فرماتے بہت اچھے اچھے مشورے دیتے جن سے میں فائدہ اٹھاتا۔ ایک مرتبہ دار العلوم میں

بہت خطرناک قسم کا ہنگامہ اور اسٹرائک ہوئی ملک
کے اخبارات و رسائل نے اس پر بہت کچھ لکھا میں
نے ایک تنقیدی انداز کا مضمون لکھا اور شاہ جی کو بھجوادیا
خیال یہ تھا کہ تنقیدی ہونے کی وجہ سے اس کو شائع نہیں
کرینگے ۔ مجھے یاد ہے کہ مضمون میں میں نے اس خیال
کا اظہار کیا تھا کہ دارالعلوم کے اس ہنگامے میں ساری
خطا طلبہ کی ہی نہیں ہے بلکہ اس میں بڑوں کے طرزِ
عمل کو بھی دخل ہے اسلئے کہ چھوٹے اپنے بڑوں سے
ہی متاثر ہوتے ہیں اسلئے ان کی اصلاح سے پہلے اپنا
احتساب بھی بہت ضروری ہے ـــــ مضمون کی اس
نوعیت کے پیش نظر یہ خیال کم ہی تھا کہ شائع ہوجائے
گا مگر ان کے حوصلے اور ظرف کی بات تھی کہ مضمون شائع
کیا اور اس پر ایک بہت محتاط اور معتدل انداز کا نوٹ
لکھا جس سے مضمون کی حیثیت بھی مجروح نہیں ہوئی اور
کوئی مصلحت بھی فوت نہ ہونے پائی یہ ان کے تجربہ کار اور
کارآشنا ہونے کی ہونے کی بات تھی ۔

جب کبھی کچھ دیر ہوجاتی مضمون کے لئے تقاضا
کرتے خطوط لکھتے ۔ میں بہت کمی کے ساتھ مگر کبھی کبھی انکے
دفتر میں چلا جاتا بڑے کام کی باتیں اپنے دلچسپ انداز
میں سناتے واقعاتِ ماضی ان کو ازبر تھے اشخاص وادوار
سے متعلق گفتگو کرتے تو بہت ساری معلومات کا اضافہ
ہوجاتا ۔ حضرت علامہ عثمانی رح ، عطاء اللہ شاہ بخاری رح ،
مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رح ، مولانا حفظ الرحمٰن رح ،
مولانا ظفر علی خاں رح ، غلام رسول مہر رح ، جگر مرادآبادی رح ،
وغیرہ تاریخ ساز لوگوں کے بہت سے واقعات بہت سی
باتیں میں نے ان کے دلچسپ انداز بیان میں ان سے
سنی ہیں ۔ بھوکے بھوکے لہجہ میں ان کی باتوں میں
بڑا مزا آتا تھا ۔

بقول کسے ؎

بہت لگتا ہے جی محفل میں ان کی
وہ اپنی ذات میں اک انجمن تھے

حافظہ بہت اچھا تھا اسلئے پرانی باتیں جزئیات
کے ساتھ وہ بیان کرتے تو سننے والے کے سامنے پوری تصویر
آجاتی تھی اور پیش پا افتادہ باتیں بھی ان کی رنگین بیانی
سے تروتازہ اور دلکش محسوس ہوتی تھیں ۔ ایک مرتبہ
اپنی کتاب "یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ" عنایت کی میں نے
اسکو پڑھا اور نہ جانے کتنی بار پڑھا جب بھی پڑھا
ہر مرتبہ نیا لطف آیا سیکڑوں ارباب علم و کمال حضرات
کا تذکرہ انھوں نے اس کتاب میں کیا ہے مگر ہر تصویر کو
ان کے سحر طراز قلم نے پیکرِ متحرک بنادیا ہے یوں محسوس
ہوتا ہے موصوف کے ممدوح ہمارے سامنے ہیں اور
اپنے علمی وفنی کمالات کے ساتھ محو گفتگو ہیں ۔ میں سمجھتا
ہوں پیکر نگاری اور سیرت نگاری کے باب میں یہ کتاب
صف اول کی کتابوں میں شمار ہونے کے لائق ہے ۔ انشا
کا حسن ، بیان کی انفرادیت ، لہجے کی متانت اور اپنے
موضوع پر مکمل گرفت جیسی خصوصیات نے کتاب کو
لازوال اور زندۂ جاوید بنادیا ہے ۔ مصنف کتاب نے
مرحومین کو زندۂ جاوید بنایا اور زندہ جاوید شخصیات
کے تذکرے نے مصنف کو بقائے دوام عطا کی ہے جس
طرح شاہ جی نے ڈوب کر عقیدت و محبت کی فضاؤں میں
رہ کر اخلاق و اخلاص کی سیاہی میں ڈبو کر قلم اٹھایا ہے اس
نے کتاب کو اور صاحب کتاب کو لازوال بنادیا ہے اردو
ادب بجا طور پر ایسی کتابوں پر ناز کرسکتا ہے ۔ مجھے یہ کتاب
اتنی پسند ہے کہ میری رائے میں شاہ جی کچھ بھی نہ لکھتے تب
بھی اردو ادب میں یہ کتاب انھیں زندۂ جاوید بنادینے
کے قابل تھی ۔ اب تو حال یہ ہے کہ ان کے سیکڑوں مضامین
ہیں جو انکی انفرادیت پر کشش انداز تحریر، سحر انگیز اسلوب
بیان کی بنا پر ان کی بہترین یادگار ہیں جو آج ان کے

بعد بھی ہمارے درمیان ان کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

سات آٹھ برس پہلے کی بات ہے میں نے اپنا مجموعۂ کلام "نور و نکہت" کے نام سے شائع کرنے کا پروگرام بنایا شاہ جی سے میں نے اس کا تذکرہ کیا اور یہ بھی کہا کہ اس پر پیش لفظ بھی آپ لکھ دیں بہت خوش ہوئے اور بہت جاندار بہت جامع پیش لفظ لکھ کر میرے پاس بھجوایا بغیر کسی تصنع کے کہوں گا کہ میری حیثیت سے زیادہ بلند پیش لفظ مرحوم نے لکھا جس سے ان کے اندازِ حوصلہ افزائی اور خورد نوازی کا پتہ چلتا ہے۔ ایک مرتبہ بازار میں ملے میں نے شکریہ ادا کیا تو کہنے لگے "ہم تو اب تھک تھکا لئے ہیں اب تو آپ جیسے لوگوں کو ہی میدان سنبھالنا ہے۔"

"نور و نکہت" پر یوپی اردو اکیڈمی نے مجھے انعام سے نوازا تو بہت خوش ہوئے اور بڑے حوصلہ افزا کلمات کہے۔ کہنے لگے اب تمہاری نثر میں کوئی چیز آنی چاہیئے تم ارادہ کرو اور مضامین کو مرتب کردیں اس کی اشاعت کا کوئی راستہ نکالوں گا۔"

یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا مرحوم سخت علیل ہوگئے اور پھر یہ بیماری بالآخر سفر حیات کے اختتام پر ہی ختم ہوئی۔ مرحوم اعلیٰ درجہ کے ادیب اور بلند پایہ صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت نکھرے ہوئے شعری ذوق کے بھی حامل تھے۔ اس کا بھی مجھے بارہا تجربہ ہوا اساتذہ اور صف اول کے شعراء کے سیکڑوں اشعار انھیں یاد تھے اور جب وہ موڈ میں ہوتے اور مزے لے کر انھیں سناتے تو بہت زیادہ لطف آتا تھا ایک مرتبہ بازار میں ملاقات ہوگئی مجھے روک کر کہنے لگے کچھ اشعار ہیں میر کے، سنو مزا آجائیگا انھوں نے تقریباً ڈیڑھ درجن اشعار وہیں کھڑے کھڑے سنائے اور ایسے منتخب، اور بلند پایہ اور معیاری اشعار سنائے کہ طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ میں کئی روز تک طبیعت میں ان کا مزا لیتا رہا۔ اپنے اشعار بھی کبھی کبھی سناتے تھے اور ان میں بھی ان کی ذہانت اور ادبی ذوق کی عمدگی اور بلندی نمایاں محسوس ہوتی تھی۔

اپنے والد بزرگوار علامۃ العصر حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب (قدس سرہ) کا جیسا کہ چاہیئے تھا بڑی عقیدت بڑی محبت سے ذکر فرماتے تھے۔ حضرت مرحوم کے واقعات بڑے والہانہ انداز میں سناتے تھے ایک مرتبہ حضرت پر مضمون لکھنے کو کہا، میں نے فرمائش کی تعمیل کی۔ "دارالعلوم" میں اسے شائع کیا اور پھر کلماتِ تحسین کے ساتھ میری حوصلہ افزائی کی۔ ایک مرتبہ اپنی مرتب کردہ کتاب "حیات انور" مجھے عنایت کی۔ یہ حضرت علامہ مرحوم کے حالات و کمالات پر ان کے بلند پایہ شاگردوں کے مضامین پر مشتمل ہے۔ میں نے اس بلند پایہ اور قیمتی کتاب کو جب بھی پڑھا ہے حضرت علامۃ العصر کے کمالات و محاسن زیادہ سے زیادہ نکھر کر سامنے آئے ہیں۔ اس نادرۂ روزگار شخصیت کا حق تو کون ادا کرسکتا ہے، ہم بعد والوں کے لئے یہ کتاب حضرت کے تعارف کا ایک بہترین اور کامیاب وسیلہ ضرور ہے۔

شاہ جی مرحوم ایک کامیاب صحافی ایک ممتاز ادیب ایک، صاحب طرز اہل قلم ایک منفرد مبصر کی حیثیت سے سینوں اور سفینوں میں تادیر زندہ رہیں گے۔ ماہنامہ "دارالعلوم" تقریباً ایک چوتھائی صدی سے زائد تک ان کی ادارت میں نکلا۔ اپنے معیار اپنے انداز اور بروقت اشاعت کے اعتبار سے آج تک وہ اپنی مثال آپ ہے۔ "دارالعلوم" کے علاوہ نہ جانے کتنے اخبار کتنے رسالے ان کے رشحاتِ قلم سے مزین ہوئے ہونگے اس کا تذکرہ ایک مستقل مضمون کا طالب ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ "شاہ جی" مرحوم کی وفات سے

صحافت و ادب کی صفوں میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ تا دیر شاید پورا نہ ہو اس منزل سے ایک نہ ایک دن گذرنا سب کو ہے لیکن بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی وفات دوسروں کے لئے شدید احساس محرومی پیدا کر دیتا ہے اور یاد کرنے والے مختلف جہتوں سے انھیں یاد کرتے اور انکی اچھائیوں کو دلوں میں جگہ دیتے ہیں شاہ جی اپنی زندگی میں دوستوں کے دوست چھوٹوں کے بھی خواہ ملنسار وضعدار تھے ان کی یہ خوبیاں کیسے بھول سکیں گے؟ انھوں نے اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے مرنے والوں پر تعزیتی نوٹ لکھے ہوں گے آج وہ خود وہاں ہیں جہاں لوگ ان کے لئے اظہار تعزیت کر رہے ہیں۔ دنیا کا یہ سلسلہ یوں ہی چل رہا ہے یوں ہی چلتا رہیگا ہمیشگی سوائے ذات واحد کے کسی کو نہیں الا کل شیء ما خلا اللہ باطل

بڑے سے بڑا صاحب کمال بڑے سے بڑا صاحب عظمت بڑے سے بڑا صاحب جبروت صاحب اقتدار بہر حال ایک نہ ایک دن پیوند خاک ہو جاتا ہے اور دنیا والوں کے لئے اپنی یادیں اور اپنے اچھے کام چھوڑ جاتا ہے جو اس کی یاد کو تازہ رکھتے ہیں۔

بیماری کے دنوں میں ایک روز میں عیادت کے لئے گیا ان کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی تشویشناک خبریں بیماری کی مل رہی تھیں۔ پہنچا تو جس حالت میں شاہ جی کو دیکھا دل دہل گیا بیماریوں کے شدید حملوں کی وجہ سے اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آتے تھے طبیعت کو یقین سا نہیں آتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو اپنی باغ و بہار شخصیت کے ساتھ جب بولتا تھا تو باتوں کی دلچسپی مخاطب کو ہمہ تن ان کی طرف متوجہ کر دیتی تھی واقعات ماضی جب سناتے تو محسوس ہوتا کہ گذرے ہوئے زمانے کو زبان مل گئی ہے

آج وہ اس حال میں ہے زبان بند آنکھیں بند، ہاتھ پاؤں بے حس و حرکت صرف سانس کی آمد و رفت سے زندگی کے آثار کا پتہ چلتا تھا۔ میں ان کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا وقتاً فوقتاً طبیعت کے سنبھلنے بگڑنے کی اطلاعات ملتی رہیں تا آنکہ نومبر ۸۵ء کی آخری تاریخوں میں یہ سانحہ بھی پیش آ گیا جو سب کو پیش آنا ہے لیکن اپنے اپنے وقت اپنی اپنی باری کی بات ہے۔ کوئی آگے چلا جاتا ہے کوئی پیچھے جاتا ہے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کے سیئات سے درگذر فرمائے اور مغفرت فرمائے آمین

یہ چند سطریں بطور یادگار، بطور تأثر سپرد قلم کی ہیں۔ اب ان کے بعد ان کے ذکر خیر کے علاوہ ہمارے پاس اور ہے بھی کیا؟

رونقِ بزم تھی وابستہ تمہارے دم سے
تم نہ ہو گے تو بہت یاد کرے گی دنیا
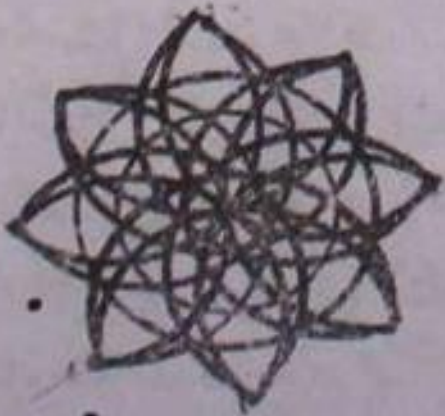
ابن الانور

مولانا سیّد محمد ازہر شاہ قیصر

مولانا احمد نصر صاحب بنارسی

سرزمین ہند میں ایسی نابغۂ روزگار شخصیتیں پیدا ہوئیں کہ اگر مؤرخ ایسے پاکیزہ افراد کی فہرست میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رح کو شامل نہ کرے تو یہ تاریخ پر ظلم بھی ہوگا اور ناقابلِ معافی جرم بھی۔ حضرت شاہ صاحب کو اگر فرید دہر وحید عصر کہا گیا تو ہرگز مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا۔ اگر مولانا مدنی رح نے یہ فرمایا کہ میں نے قوت حفظ وضبط علم میں ان کا مثال نہیں پایا تو بجا فرمایا۔ اگر حضرت تھانوی رح نے یہ فرمایا کہ انور شاہ کا مسلمان ہونا اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے تو سر تسلیم خم ہے بیشک وہ اس سے بھی اعلیٰ و ارفع تھے

مولانا ازہر شاہ صاحب رح حضرت شاہ صاحب کے بڑے صاحبزادے تھے، ناممکن تھا کہ باپ کا اثر لڑکے پر نہ پڑے۔ مولانا مرحوم نے اپنے والد محترم سے لگن، محنت، قوت حافظہ ترکے میں پایا تھا چنانچہ رسالہ دارالعلوم دیوبند کا سارا نظم جس خوش اسلوبی سے وہ چلاتے تھے اور پابندی اوقات کا لحاظ مضامین کا انتخاب وغیرہ انکے پاکیزہ ذوق کا آئینہ دار تھا۔ دیانت کے ساتھ جو شخص بھی آج کے دارالعلوم کو کل کے دارالعلوم سے موازنہ کریگا ہر جگہ ازہر شاہ صاحب رح کی ضرورت محسوس کرے گا

ہزاروں اشعار کا یاد ہونا ان کی قوتِ حافظہ پر دال ہے۔ جنگ آزادی کے مجاہدین سے ان کا گہرا ربط تھا۔ صاحب رائے اور صحیح الفکر و راسخ العقیدہ انسان تھے۔ میرا خیال ہے کہ اپنے والد محترم رح کے بعد وہ حضرت حکیم الاسلام جناب مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس سرہٗ کے سب سے زیادہ وفادار عاشق تھا اسی وجہ سے انھوں نے انقلاب دارالعلوم کے بعد حضرت مہتمم صاحب علیہ الرحمۃ کا ساتھ ترک نہیں فرمایا کیونکہ مسئلہ حضرت حکیم الاسلام رح کی ذات کا نہ تھا بلکہ فکر و نظر کے اتحاد کا تھا جس میں وہ اور حضرت مہتمم صاحب مرحوم جمے رہے سختیاں برداشت کیں گالیاں سنیں اور ہر قسم کی صعوبت کو برداشت کیا مگر معاشی راحت کی خاطر اصول و نظریات کو قربان نہ کیا بیشک وہ اس امتحان میں کامیاب ہوئے اور خدائے لم یزل ولا یزال کی بارگاہ بے نیاز میں عاجزانہ حاضر ہوگئے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور خصوصی رحم وکرم کا معاملہ فرمائے آمین۔

اس احقر سے بھی لگا ہے بگا ہے مراسلت کا سلسلہ تھا

ایک خط میں انھوں نے احقر کو تحریر کیا کہ "میاں نصر جو بات تصور میں نہ تھی وہ آج مشاہدے میں ہے جن لوگوں نے دارالعلوم کے لئے قربانیاں دیں، محنت کی اپنی زندگی کو دارالعلوم پر لٹا دیا بلا کسی غرض کے اس کو پروان چڑھانے میں خود کو وقف کردیا افسوس وہ لوگ آج دارالعلوم سے باہر کسمپرسی کی زندگی گذار رہے ہیں ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے اللہ تعالیٰ کی مرضی میں کس کو لب کشائی کی جرأت ہے"۔

کس قدر درد ہے ان الفاظ میں.

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ہر بندے کے ساتھ حق جل شانہ کا علیحدہ علیحدہ معاملہ ہے جو دوسرے کی فہم ادراک سے باہر ہے۔ حق جل شانہ جو اپنے بندوں پر سب سے زیادہ شفیق و مہربان ہیں وہ بندوں کو آزمائش و امتحان میں مبتلا کر کے تلافی مافات و رفع درجات کا مستحق بناتے ہیں. یہ بھی حق جل شانہ کا احسان و کرم ہے خوش قسمت ہے وہ بندہ جس کو وہ اس غم کے لئے منتخب فرمائیں۔ میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم بھی ان خوش قسمت افراد میں شامل تھے جن کو مصائب میں مبتلا کر کے صبر کی توفیق دی گئی اور صبر پر مومن کو جو اجر ملے گا اس کا تصور بھی اس عالم فانی کی آنکھیں نہیں کرسکتی ہیں یہ بھی ایک مبارک غم ہے جو ہر ایک کا مقدر نہیں ہے۔

تراغم سہنے والے پر زمانہ مسکراتا ہے
مگر ہر شخص کی قسمت میں تراغم نہیں ہوتا

مصائب میں مسکرانا اور درد و غم کی حالت میں اللہ کی جانب رجوع کرنا اس کے خاص بندوں کا ہی کام ہے۔ شاہ صاحب مرحوم اس امتحان میں پورے اترے اور اس آزمائش کے وقت میں ان کے پائے استقامت میں لرزش نہ پیدا ہوئی انھوں نے اقتدار کے ہاتھوں اپنی خودداری اور اپنے اصولوں کو فروخت نہیں کیا جبکہ صبح و شام میں ان کی مجلسوں میں بیٹھنے والے اور ان کی ذات سے ہر مرحلہ پر فائدہ اٹھانے والے ایسے حضرات بھی تھے جنھوں نے اس ظلم و ستم کے ہیولائی ظالموں کی رفاقت اور کاسہ لیسی میں راحت اور اطمینان محسوس کیا۔

شاہ صاحب مرحوم ادب و صحافت کے ایک ایسے شگفتہ پھول تھے جن سے اصنافِ سخن کی ہر وادی اور ہر کوچہ خوشبو پا رہا تھا۔ دیوبند کی تاریخ میں بلاشبہ ایسا صحافی، ایسا ادیب، اور ایسا انشار پرداز اور سب سے بڑھ کر ایسا دردمند دل رکھنے والا انسان اب دور دور تک نظر نہیں آتا انھوں نے درویشی کی حالت میں شہزادوں کی سی زندگی بسر کی اور کسی لمحہ یہ محسوس نہیں کیا کہ یہ کمزور و ناتواں جسم اندر سے کتنا ٹوٹ چکا ہے بکھر چکا ہے۔

اے اللہ مولانا مرحوم کی مغفرت فرما اور ہم سب پر اپنا رحم فرما۔ (آمین)

حضرت مولانا سید ازہر شاہ قیصر

سید ازہر شاہ قیصر نیک نام
آج دنیا میں نہیں جن کا قیام
کارنامے انکے ہیں کتنے حسیں
دل سے انکی روح کو کوثر سلام

تحسین حامد کوثر

مولانا ازہر شاہ مرحوم

از حکیم عبدالقوی دریابادی ایڈیٹر صدق جدید

مولانا ازہر شاہ قیصر، جن کو مرحوم لکھتے ہوئے قلم کا کلیجہ شق ہوتا ہے میرے بڑے مخلص وخصوصی کرم فرماؤں میں تھے ملاقات کی مدت گو بہت محدود رہی اور نصف ملاقات کی نوبت بھی انکی عمر کے آخری چند سال میں آتی رہی اس کے باوجود ان کے یاد کے نقوش دل پر بہت گہرے ہیں اور اس نسبت سے ان کے حادثہ ارتحال پر صدمہ کا شدید احساس اب تک ہے۔

پہلی ملاقات احقر سے زمانۂ طالب علمی میں طبیہ کالج دہلی کے دارالاقامہ میں ہوئی۔ غالباً سنہ ۱۹۳۲ء یا ۱۹۳۳ء میں اپنے رفیق جماعت (طبیہ کالج) حکیم سید اختر حسین گنگوہی (مرحوم کے پھوپھا) کے کمرہ میں ایک دن گیا۔ انھوں نے ایک نو عمر صاحبزادہ سے جو بطور مہمان مقیم تھے یہ کہہ کر تعارف کرایا یہ ملک کے نامور فاضل ومحدث جلیل مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ کے فرزند اکبر ہیں۔ حضرت مولانا کا نام خوب سنا تھا اور دل ان کی عظمت کا معتقد تھا ان کی پہلی اور آخری زیارت کا شرف انکی قیام گاہ شاہ منزل دیوبند میں سنہ ۱۹۳۰ء میں اس وقت حاصل ہوا تھا جبکہ میں عم محترم مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر "سچ" لکھنؤ کی معیت میں پہلی بار دیوبند گیا تھا اور نہ صرف اس دارالعلوم کو دیکھا بلکہ وہاں کے بہت سے اکابر مولانا حبیب الرحمٰنؒ مولانا محمد احمدؒ، مولانا اعزاز علیؒ، قاری محمد طیب (جو اس وقت نو عمر تھے) کی زیارت بھی نصیب ہوئی تھی، مولانا حسین احمد صاحب سے اس سے قبل کئی بار شرف ملاقات حاصل ہو چکا تھا اور اس وقت ہم لوگ انھیں کے مہمان تھے۔ مولانا انور شاہؒ نے اپنی مختصر ملاقات میں بڑی عالمانہ گفتگو فرمائی۔ اپنی کم علمی کے باوجود بہر حال یہ اثر پڑا کہ وہ علم کے بحر ذخار ہیں ان کے نورانی چہرہ کی یاد اب تک فراموش نہیں ہوئی ہے۔

ازہر شاہ طبیہ کالج کے دارالاقامہ میں کئی روز رہے اور کئی بار ملاقات بھی ہوئی لیکن اب یہ بالکل یاد نہیں کہ وہ اس زمانہ میں کیا تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

برسوں بعد ان کا نام اس وقت یاد پڑا جبکہ دارالعلوم دیوبند کے ترجمان ماہنامہ دارالعلومؔ پر پہلی بار نظر پڑی اس پر مدیر کی حیثیت سے ان کا نام درج تھا۔ عرصہ تک اس رسالہ کے مطالعہ کا اتفاق ہوتا رہا ان کی شگفتہ پُر معلومات تحریروں سے یہ اندازہ ہوتا رہا کہ ان کے قلم میں کتنا زور اور روانی ہے اور اس میں ادبی چاشنی بھی پوری طرح موجود ہے۔

سنہ ۱۹۸۰ء یا سنہ ۱۹۸۱ء میں اردو اکاڈمی یوپی کے جلسۂ ممبران منعقدہ لکھنؤ میں زندگی میں دوسری بار مولانا سید ازہر شاہ سے ملاقات کی تجدید ہوئی۔ موصوف کی شکل وصورت میں عمر کے تقاضے سے بہت کچھ تغیر ہو چکا تھا نہ میں انھیں پہچان سکا اور نہ وہ مجھے۔ ڈاکٹر رضوان احمد علوی نے ان تک پہنچایا اور ملایا۔ بڑے تپاک سے ملے۔ سابق ملاقات جو طبیہ کالج دہلی میں ہوئی تھی میرے یاد دلانے پر انھیں یاد آئی۔ اس ملاقات کے بعد میں نے ہفتہ وار صدق جدید ان کو بھیجنا

شروع کیا اور ان سے خط وکتابت کا سلسلہ بھی چل پڑا عم محترم مولانا عبدالماجد صاحب کے حادثۂ وفات پر ان کا موثر تعزیتی مکتوب میرے نام آیا۔

اس کے بعد ملاقات دیوبند کے جشن صد سالہ کے دوران ہوئی۔ موصوف کے اصرار پر انھیں کی قیام گاہ شاہ منزل میں ڈھائی تین دن تک قیام رہا۔ مجی حکیم اختر حسین صاحب بھی پاکستان سے آئے ہوئے تھے اور وہیں مقیم تھے۔ اسی زمانۂ قیام میں ازہر شاہ صاحب نے میزبانی کا حق ادا کر دیا۔ ساتھ ہی ان سے بڑی تفصیلی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ جن سے ان کی وسعت معلومات، علمی شغف و اصابت رائے کا پورا علم اور ان کے جوہر قابل کی صحیح پرکھ حاصل ہوئی۔

پھر ملاقات کی نوبت نہیں آئی لیکن وقتاً فوقتاً مراسلت ہوتی رہی۔ ان کی شدید علالت قلب کا حال معلوم ہوتے ہی عیادتی کارڈ لکھا تھا جس کا جواب علالت و نقاہت کے باوجود انھوں نے اپنے قلم سے دیا تھا۔ اس خط میں انھوں نے اپنی صحت کی طرف سے بالکل مایوسی ظاہر کی تھی اور یہ اندیشہ کچھ ہی عرصہ بعد صحیح ثابت ہوا۔ بہترین علاج کے باوجود دل کی بیماری کام تمام کر کے رہی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کی عمر کے آخری زمانے میں ان کی نگرانی میں دیوبند سے ماہنامہ "طیب" نکلنا شروع ہوا تھا جس پر میں نے اخبار صدق جدید میں تبصرہ کرتے ہوئے ان کے مضامین کی خاص طور سے داد دی تھی۔

عمر کا آخری دور خرابی صحت اور بعض صبر آزما پریشانیوں میں گزرا جو انشاء اللہ یقیناً ان کے رفع درجات کا موجب ہوئے ہوں گے۔

امید ہے کہ ان کے فرزند رشید مولوی نسیم اختر شاہ قیصر جو ماشاء اللہ ہونہار اہل قلم ہیں ان کی یادگار رسالہ طیب کو شایان شان طریقہ پر زندہ و برقرار رکھیں گے۔

بقیہ ص ۱۲۵　"یادِ یارِ مہربان"

بقیہ ص ۱۲۵

گنگنا رہے ہیں۔ ؎

میں جس کے ہاتھ میں اک پھول دیکھ آیا تھا
اسی کے ہاتھ کا پتھر میری تلاش میں ہے

میر تقی میر نے جس بیماری دل کا تذکرہ کیا ہے وہ محض شاعری یا افسانہ ہے لیکن شاہ صاحب کے حساس آبگینۂ دل کو حالات کے جو زخم لگے وہ اتنے گہرے تھے کہ میر کے شعر کا وہ حقیقی مصداق بن گئے ؎

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

افسوس کہ حضرت مولانا محمد عثمان صاحبؒ کے بعد حضرت شاہ صاحب جیسا مخلص دوست بھی رخصت ہو گیا اور میں زندگی کی تپتی ہوئی دھوپ میں حالات کی چنگاریوں کو سمیٹنے کے لئے تنہا رہ گیا ؎

مڑ کے بھی نہیں دیکھا تم نے ہوا پر کیا گذری
اک دیا جلا کر تم آندھیوں میں چھوڑ آئے

مولانا اعجاز احمد
قاسمی صاحب

"مچھلی کے بچہ کو تیرنا کون سکھائے"۔ یہ جملہ بچپن سے کانوں میں پڑا ہوا تھا مگر اس کی صداقت کا تجربہ اسوقت ہوا جب میرے والد صاحب قبلہ مرحوم نے یہ واقعہ گھر میں سنایا کہ لوگ شاہ صاحب (حضرت علامہ انور شاہؒ) کے صاحبزادے کے بارے میں یہ کہہ رہے تھے کہ انھوں نے طفولیت کے زمانہ میں خلافت تحریک کے ایک جلسۂ عام میں معرکۃ الآرا تقریر کی تھی۔

اس بچہ کا نام جو اپنی عمر سے تیسیوں برس آگے آگے چل رہا تھا "سید ازہر شاہ" تھا۔ پیدائشی ذہین و طباع، مقرر، صاحب طرز ادیب و انشا پرداز، بیباک صحافی و دانشور، دوستوں کا دوست اور اپنی ذات میں ایک انجمن۔

ان کا غائبانہ تعارف تو بچپن میں قبلہ والد صاحب نے کرا دیا تھا مگر دار العلوم میں فارسی سے فراغت کے بعد عربی تعلیم کے دوران میں صورت آشنا ہوا۔ پھر رسم و راہ بڑھتی رہی اور ہم ایک دوسرے کے قریب آتے رہے مدتوں راستہ میں کہیں ملاقات ہو جاتی تو علیک سلیک ہو جاتی، مزاج پرسی یا پھر ادھر اُدھر کی بات ہو جاتی۔ لیکن اخبار "دیوبند ٹائمز" کے اجراء کے بعد دیوبند میں شاہ صاحب کی صحافت سے استفادہ نہ کرنا چراغ کے باوجود اندھیرے میں بھٹکنے کے ہم معنیٰ تھا۔ چنانچہ شاہ صاحب سے حضرت مولانا محمد عثمان صاحب رح کی ہمراہ شرف ملاقات نصیب ہوا۔ اخبار کے سلسلے میں مشورے اور مضامین کی اصلاح اور اس کی نوک پلک درست کرنا مستقل معمول بن گیا۔ شاہ صاحب کی عنایات و مہربانیاں اس قدر بڑھیں کہ مرحوم نے "دیوبند ٹائمز" کا ایک مستقل صفحہ "سیاسی حاشیہ" کے عنوان سے برسہا برس تک لکھتے رہے۔ حالات حاضرہ پر اُن کے تبصرے رگِ احساس میں نشتر بن کر چبھ جاتے اور پڑھنے والا عش عش کرکے رہ جاتا وہ لکھتے تو محسوس ہوتا کہ سارے جہاں کا درد اُن کے قلم میں سمٹ آیا ہے۔ مختلف مسائل پر یہ شذرات اخیر شب میں سپرد قلم فرماتے۔ ؎

"میں قوم کے غم میں روتا ہوں جب سارا عالم سوتا ہے"

کی حقیقت جگا دیتے تھے۔

شاہ صاحب کو سوانحی خاکے میں رنگ بھرنے کا جو سلیقہ آتا تھا وہ اس دور میں بڑے بڑے ادیبوں اور صحافیوں کو نصیب نہیں۔ ملی، سیاسی شخصیتوں پر بہت سے مضامین دیوبند ٹائمز میں محفوظ ہیں جو ان کی انفرادیت کے اعتراف کے لئے کافی ہیں۔

شاہ صاحب نے اپنے قلم سے سیکڑوں نہیں ہزاروں ہی کو انشا پردازی سکھائی اور دار العلوم کے طلباء میں جس کو ذرا سا بھی اردو ادب سے شغف ہوتا شاہ صاحب اس کی صلاحیتوں کو جلا دینے کا بیڑہ اٹھا لیتے۔

شاہ صاحب کو خدا نے تقریر اور تحریر کا ملکہ عطا کیا

تھا۔ ان کے والد بزرگوار حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ کے مشہور تلامذہ میں سے ایک عبقری شخصیت کے مالک تھے، چنانچہ شاہ صاحب کو بھی ان کے علم، ذکاوت، حافظہ اور تقریر و تحریر کا فن ورثہ میں ملا تھا۔ آدمی کی تھوڑی سی گفتگو سے اندازہ لگا لیتے تھے کہ یہ کیا کہنا چاہتا ہے اور کس خیال کا آدمی ہے اس کی باتوں کا جواب اور اپنے دلائل نہایت ہلکے پھلکے انداز میں اس طرح پیش فرماتے کہ وہ قائل ہو جاتا۔ وہ نہایت سادہ منکسر المزاج اور وضعدار انسان تھے ان کی زندگی سادگی اور شرافت کی ایک کھلی کتاب تھی ان میں سیدھا پن بہت تھا۔ باوجود ذہانت و سمجھداری، ذکاوت و دانشوری کے اگر انکو کوئی دوست بہکانا چاہتا تو بہت آسانی سے بہکا لیتا مگر دینی یا ملکی اور ملی مسائل میں ان پر کسی کا کوئی بس نہیں چل سکتا تھا۔ وہ اپنی فکر و نظر سے جو موقف متعین کرتے اس پر پتھر کی طرح بن جاتے تھے۔

مدت تک رسالہ دار العلوم کے ایڈیٹر رہے دفتر میں اکثر احباب آجاتے اور فرمائش کرتے کہ شاہ جی چائے پلائیے تو فوراً منگواتے۔ کبھی کبھی حضرت مولانا محمد عثمان صاحب بھی اس محفل میں شریک ہوتے اور حضرت مولانا شاہ صاحب سے دعوت کے لئے کہتے تو وہ فوراً دعوت کے لئے تیار ہو جاتے۔ متعدد بار دعوتیں کیں۔ وہ حضرت مولانا محمد عثمان صاحبؒ کا بہت احترام اور لحاظ کرتے تھے مولانا کبھی کبھی فرماتے تھے کہ بھائی شاہ صاحب سے دعوت کھانے میں مزہ نہیں ہے کیونکہ جب ان سے دعوت کو کہا جائے تو فوراً دعوت کر ڈالتے ہیں اور مجھے دعوت کھانے سے زیادہ دعوت طلب کرنے میں لطف آتا ہے اس شخص کی دعوت بہت مزیدار ہے جو دعوت کے نام کو سنکر بدکتا رہے۔

اتر پردیش وقف بورڈ نے جب اضلاع میں اوقاف کمیٹیاں بنائیں تو حضرت مولانا محمد عثمان صاحبؒ نے جو اُن دنوں وقف بورڈ کے ممبر اور ایم۔ ایل۔ اے تھے مولانا سید ازہر شاہ صاحب کو منتخب کیا اور ان کو ضلع وقف کمیٹی سہارنپور کا صدر نامزد کرایا۔ ضلع کے اوقاف کی اصلاح اور تنظیم کے لئے شاہ صاحب نے بہت کام کئے اور بہت سی تجاویز وقف بورڈ کے سامنے رکھیں اگر وقف بورڈ یو پی ان پر عملدرآمد کرتا اور ادھر کچھ توجہ کرتا تو بہت سدھار ہو سکتا تھا۔

میں شاہ صاحب سے ملاقات کے لئے گاہ بگاہ ان کے دولت خانہ پر حاضر ہوتا اور وہ بڑی محبت و خلوص سے بٹھاتے۔ گھر والوں کو فوراً حکم ہوتا کہ بھائی مولوی اعجاز آئے ہیں چائے بنادو۔ اہل خانہ بھی مجھ پر ایسے مہربان ہیں اور خلوص و محبت سے پیش آتے ہیں کہ ان کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ شاہ صاحب اتنے دلچسپ آدمی تھے کہ ان کے پاس بیٹھ کر اٹھنے کو دل نہ چاہتا۔ کسی ملاقات میں ایک دو گھنٹے لگ جانا معمولی بات تھی۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی اور دنیا کا کوئی موضوع ایسا نہ ہوتا جس پر ان کی نگاہ نہ ہوتی وہ تنہا ایک انجمن اور گل صد بہار تھے۔ میں جب بھی ان کے یہاں جاتا تو حضرت مولانا محمد عثمان صاحبؒ فرماتے کہ بس بھائی اب تم گھنٹوں کے لئے گئے شاہ صاحب اپنے گھریلو کاموں میں بھی مجھ سے مشورہ کرتے اور میں مسائل کے حل میں حتی الامکان سعی کرتا۔ دار العلوم کے قضیۂ نامرضیہ سے بہت غمگین اور نڈھال ہو گئے تھے روحانی اذیت اور اندرونی گھٹن انھیں اندر سے کھوکھلا کرتی رہی اور بالآخر یہ حال ہو گیا کہ وہ مختلف امراض کی آماجگاہ بن گئے۔

اس زمانے میں جب شاہ صاحب سے ملاقات ہوتی تو لگتا تھا جیسے زیر لب (باقی ص ۱۲۳ پر)

شاہ جی کی شاعری

ولیم ہما میرٹھی
ایم. اے، اندور مدھیہ پردیش

کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب اردو شاعری پر ایک نظر میں اردو کی پرانی شاعری کو بڑا مضحکہ خیز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی کتاب کی بسم اللہ اس دعوے سے ہوتی ہے کہ شاعری کی ہندوستان میں قدر و منزلت نہیں۔ شاعری کی قدر ایک دل چسپ مشغلے سے زیادہ نہیں اور ایک مخصوص گروپ کے خیال میں شاعری پروپیگنڈہ کا دوسرا نام ہے شاید کسی زمانے میں شاعری کو منحوس بھی خیال کیا جاتا تھا ــــ مولانا قیصر (شاہ جی) کی شاعری کو دیکھتے ہوئے مجھے کلیم الدین احمد کے اس خیال سے اتفاق نہیں۔

انگریز شاعر اور نقاد میتھو آرنلڈ کا نظریہ اس سے مختلف ہے اس کے خیال میں شاعری کا مستقبل بے پایاں ہے اور آنے والے زمانوں میں ہماری نسلیں شاعری سے زیادہ سے زیادہ سہارا پائیں گی مگر وہ ہر شاعر کو اس میں شامل نہیں کرتا بلکہ اس کی شرط یہ ہے کہ صرف وہی شاعری اس میں شامل ہے جو اپنی بلند تقدیر کی مستحق ہو۔ میتھو آرنلڈ شاعری کے لئے اس قدر خوش فہمی سے کام لیتا تھا کہ اس نے یہ دعویٰ کر دیا کہ آنے والے زمانوں میں شاعری مذہب کی جگہ لے لے گی۔

مغربی نقادوں میں رچرڈز، ایلیٹ، بوئیس، مری نے بھی شاعری کے مستقبل کے بارے میں جو آراء ظاہر کی ہیں وہ شاعری کو برگزیدہ ثابت کرتے ہیں۔

شاعری کی طرح شاعر کی تشریح بھی کی گئی ہے بقول شیلے، شاعر وہ عندلیب ہے جو اپنی تنہائی کے احساس کو مسرت بخشنے کے لئے بے نوری میں گاتا ہے اور اس طرح گاتا ہے کہ سامعین اور قارئین وجد میں آجاتے ہیں مگر ولیم ورڈزورتھ کی نظر میں شاعر بھی عام دنیاوی انسانوں کی طرح کا ہوتا ہے وہ نہ بے نوری میں گاتا ہے اور نہ اپنی تنہائی کو مسرت بخشتا ہے لیکن وہ جو باتیں کرتا ہے وہ انسانوں سے ہوتی ہیں اس میں عام آدمیوں کے مقابلے میں مخصوص خوبیاں ہوتی ہیں جو باتیں وہ انسانوں سے کرتا ہے ان میں باسی پن نہیں ہوتا بلکہ وہ تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو ہوتی ہیں اور یہ شادابی بے مثل ہوتی ہے اور عام آدمی کی باتوں میں یہ تازگی اور نشاط انگیزی نہیں ہوتی۔

ملکہ ایلزبتھ کے دور میں اطالوی اور فرانسیسی شاعری کی تقلید ہوئی اور لیرک شاعری (تغزل) عالم وجود میں آئی لیکن کچھ عرصہ بعد لیرک شاعری نے اطالوی اور فرانسیسی شاعری سے اپنی راہ قطعاً جداگانہ بنالی۔

لیکن اردو شاعری کا معاملہ اس کے برعکس ہے وہ آج بھی فارسی شاعری کی پیروی کرتی نظر آتی ہے۔ اردو شاعری کے ناقد کلیم الدین احمد کی نظر میں انسان ارتقاء کی منازل طے کرنے کے باوجود مکمل مہذب نہیں بن پاتا

اور وہ بربریت سے نجات نہیں پاتا بلکہ ذرا سی تحریک پر انسان کی بربریت تہذیب کے حلقوں کو توڑ کر باہر نکل آتی ہے۔

کلیم الدین احمد اسی رعایت سے ادب میں "وحشی اور نیم وحشی" اصناف کا تعین کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں

"غزل بھی ایک نیم وحشی صنف ہے۔ اس کی صورت ناقص ہے۔"

اس بات کے ثبوت میں ان کا دعویٰ ہے:-

"وحشی اپنے آرٹ میں صورت اور اس کی تکمیل کی مطلق پروا نہیں کرتا۔ وہ نہ تو اپنے جذبات وخیالات کی تربیت کرتا ہے اور نہ انھیں ترکیب دے کر ایک مناسب و موزوں صورت کی تخلیق کرتا ہے۔"

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم کی شاعری نہ تو نیم وحشی صنف ادب ہے اور نہ اس کی صورت ناقص ہے بلکہ انھوں نے اپنے جذبات وخیالات کی تخلیق کی ہے۔ ان کی شاعری کا مستقبل بے پایاں ہے اور آنے والے زمانوں میں ہماری نسلیں ان کی شاعری سے زیادہ سے زیادہ سہارا پائیں گی ان کی شاعری اپنی بلند تقدیر کی مستحق ہے۔ شیلے نے شاعر کو بلبل سے تشبیہ دی ہے اور مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر کی شاعری واقعی بلبل کے ترانوں سے کم نہیں لیکن شیلے کے شاعر کی طرح وہ اندھیروں میں تنہائی کو خوش کرنے کے لئے نغمہ سرائی نہیں کرتے ہیں حالانکہ سامعین اور قارئین ان کی شاعری سے وجد میں ضرور آجاتے ہیں۔

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر کی شاعری کوئی دلچسپ مشغلہ نہیں ہے اور وہ پروپیگنڈہ کا دوسرا نام بھی نہیں ہے ان کے کلام میں شادابی و تازگی موجود ہے۔

اپنے ماہنامہ طیب ماہ اکتوبر ۱۹۸۲ء میں وہ خود اپنی شاعری پر اس طرح اظہار خیال فرماتے ہیں۔

"سچ یہ ہے کہ نہ میں نے کبھی شاعری کی ہے اور نہ شاعری میرے لئے کوئی چیز ہے

سو پشت سے پیشہ آباء سپاہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

جس کے باپ کے علم وفضل اور مجتہدانہ بصیرت سے علوم قرآن و حدیث میں اجتہادات و تحقیقات کے نئے نئے دروازے کھلے ہیں اس کا بیٹا اگر شاعری، صحافت وقلم کاری کو اپنا مشغلہ بناتا ہے تو کیا اچھا کرتا ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ شاعری کار بیکاراں ہے اور اپنی بیکار زندگی میں اگر میں شاعری کرتا ہوں کچھ تو کرتا ہوں بیکار تو نہیں رہتا۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ "بیکار مباش کچھ کیا کر۔"

"شاعری کار بیکاراں ہے" کی قرارداد مولانا کو کلیم الدین کا ایک طرح ہم خیال بنا دیتی ہے۔ لیکن جب ہم مولانا کی شاعری کے اثاثے پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو وہ کار بیکاراں قطعی نظر نہیں آتی۔ بلکہ ان کی شاعری میں بڑے کام کی باتیں نظر آتی ہیں۔

ان کی شاعری پر نظر ڈالنے کے لئے آغاز ان کے تغزل سے کیا جائے تو بہتر ہے۔ ان کی ایک غزل "کمال نظر" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

یہ مانا درد دل بے اثر دیا تو نے
مگر نظر کو کمال نظر دیا تو نے

تری جفائے مسلسل کو سہہ رہا ہوں میں
مری طرح بھی کسی کو جگر دیا تو نے

زباں پہ مہر لگا دی بیان غم کے لئے
دل حزیں کو غم منتشر دیا تو نے

جلا کے خاک جو کر دے مقام ہستی کو
چھپا ہوا وہ شگفتہ شرر دیا تو نے

بناکر آئینہ خود اپنے حسنِ رنگیں کو
دیا تو دیدۂ حیرت نگر دیا تو نے
مرے سکون کی دنیا خراب کردے گا
جواب صاف اگر نامہ بر دیا تو نے
خبر ہے عام، کہ قیصر اجل نصیب ہوا
نہ جی اٹھے کہیں کاندھا اگر دیا تو نے

ان کی اس غزل میں نہ تو فارسی شاعری کی کورانہ تقلید ہے اور نہ بہزاد و مانی کی مریدی۔ اس حیثیت سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی غزل گوئی کا فن عربی تہذیب اور ایرانی اثرات کے مترجم کا نہیں ہے بلکہ اردو کے ایک شاعر کا ہے ان کے اشعار میں احساس کی تازگی، تخیل کی شادابی اور جذبات کی واقعیت موجود ہے۔ اس قسم کا کافی ذخیرہ قیصر صاحب کے یہاں موجود ہے ان کی شاعری شاعری ہے لفظی تصنع کی بھرمار نہیں ہے۔ احساسات کی صورت گری ہے۔ ان کے یہاں اس قسم کے بیشتر اشعار ملیں گے جو بہترین جذبات و تخیلات کی مکمل عکاسی کرتے ہیں اس اعتبار سے وہ ذکی الحس بھی ہیں اور قدرت کا نادر عطیہ فہم و ادراک انھیں بھرپوری سے ملا ہے۔ ان کا کلام زندہ اور مروج زبان اردو کی کسوٹی پر پرکھا جاسکتا ہے۔ الفاظ کی ندرت اور استعاروں کا انوکھا پن ہے ان کی زبان انتہائی سلیس اور مروجہ زبان ہے۔

ان کے ان اشعار کو پڑھیے اور جھوم جائیے ؎

آئینہ کے سامنے مصروفِ آرائش رہے
حسنِ تاباں دیکھ کر خود ہی وہ شرمانے لگے
آسماں تھرّا اٹھا، غم سے زمیں ہلنے لگی
غم کے مارے جب کبھی فریاد فرمانے لگے

نعت شریف لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ رسول اللہؐ کے سچے پرستار جذبۂ پرستش سے سرشار ہوکر نعت شریف لکھتے ہیں۔ مگر دراصل نعت شریف لکھنا پُل صراط عبور کرنے سے کم نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ افضل ہے، رسول اللہؐ اس کے بعد لیکن جذبۂ عشق کی سرشاری کبھی کبھی لکھنے والے کو اس منزلِ شوق سے گذار دیتی ہے جہاں لکھنے والا عشق کی دیوانگی میں ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے اور یہ بھی بھول جاتا ہے کہ رسول کی تعریف کرتے کرتے وہ راہِ مستقیم سے بھٹک گیا ہے اور رسول کو اللہ تعالیٰ سے بھی زیادہ مرتبہ دیدیا ہے۔ نعوذ باللہ، یہ کفر و شرک ہے۔ اللہ، اللہ ہے اور ہم سب رسول اللہ سمیت اس کے ادنیٰ بندے ہیں۔ ہاں رسول اللہ کو اس کا عزیز ترین بندہ ضرور کہہ سکتے ہیں اور یہ بھی کہ وہ اللہ کے کافی قریب ہیں ان سے دور نہیں۔ لیکن انھیں اللہ کی ہمسری نہیں دی جاسکتی یہ تو کفر ہے۔

مولانا قیصر چونکہ اسلامی عقائد سے بخوبی واقف ہیں لہٰذا وہ بڑی احتیاط سے کام لیتے ہوئے نعت شریف لکھتے ہیں۔ اب دیکھئے نعت شریف میں فرماتے ہیں ؎

غنچۂ دل کشا کھلا صلِّ علیٰ محمدؐ
باغ جہاں مہک اٹھا صلِّ علیٰ محمدؐ
صبحِ ازل کی آبرو، شامِ ابد کی آرزو
تشنہ لبوں کا آسرا صلِّ علیٰ محمدؐ
حُسن کی اک ادا ہے وہ عشق کی انتہا ہے وہ
فضل خدا کی انتہا صلِّ علیٰ محمدؐ
کفر کی ظلمتوں کو وہ بقعۂ نور کر گیا
سارا زمانہ کہہ اٹھا صلِّ علیٰ محمدؐ
ان کی ہدایتیں درست انکی روایتیں بجا
مرکزِ خیر اور ھدیٰ صلِّ علیٰ محمدؐ
تیرے وجودِ پاک سے کفر کا زور گھٹ گیا
شرک کا نام مٹ گیا صلِّ علیٰ محمدؐ

سارے جہاں میں غلغلہ تیرے ظہور کا ہوا
سرد ہوا صنم کدہ صلِ علیٰ محمدؐ
قیصرِ غم نواز کو رحمت خاص سے ملے
آپ کا لطف بے بہا صلِ علیٰ محمدؐ

اس میں شک نہیں کہ مصرعہ ہائے ثانی میں ایک مزید حرف کا اضافہ کیا جاسکتا ہے لیکن نعت شریف کس اہتمام و احتیاط سے لکھی گئی ہے حفظ مراتب کا ہر جگہ پاس رکھا گیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کتنے محتاط ڈھنگ سے کی گئی ہے۔

انگریزی ادب میں اسکاٹ اور بائیرن جیسے شعراء نے بیانیہ قسم کی نظمیں لکھی تھیں، اردو میں بھی بیانیہ نظموں کا ایک ہجوم ہے مولانا قیصر کی نظموں میں جوشِ تخیل و جذبات کے علاوہ شادابی بھی ہے نئے نئے استعارے بھی ہیں اور نئے نئے نقوش بھی ہیں مگر سب سے بڑی بات ان کی نظموں کی اثر انگیزی ہے۔ نظموں میں ان کے اشعار کسی مرصع گلدستے سے کم نہیں ان کے اشعار سے دل و دماغ کو سرور حاصل ہوتا ہے اور روح شاداب ہوکر رہ جاتی ہے جہاں ان کی حمد و نعت میں صدق جذبات کی خوشبو رچی بسی ہوئی ہے وہاں ان کی نظموں میں جذبات اور مشاہدات کی عکس انگیزی اپنی بھرپور صلاحیت کے ساتھ موجود نظر آتی ہے۔

سیلاب اشک کے نام سے مولانا قیصر نے علامہ اقبال کی یاد میں ایک شاہکار نظم تصنیف کی ہے ملاحظہ ہو

دیدۂ مشرق بہائے کیوں نہ سیلِ اشکِ خوں
ہوگیا ہندوستاں کا قلب محرومِ سکوں
آشنائے نبضِ فطرت، شاعرِ معجز بیاں
بحرِ وحدت کا شناور، نازشِ اسلامیاں
جس نے بھر کر "روحِ صافی" پیکرِ اشعار میں
رفعتیں کردی تھیں پیدا قوم کے افکار میں
جس نے توڑا جادوئے افرنگ کا رنگ ثبات
جس نے پلٹا اپنے نغموں سے نظامِ کائنات
بلبلِ باغِ محمدؐ، سروِ بستانِ رسولؐ
روح جس کی آج ہے جنت میں مہمانِ رسولؐ
قال بھی جس کا ہم آہنگ نوائے حال تھا
جس کا دل لذت شناسِ سورۂ انفال تھا
جس کو بخشی تھی خدا نے دولتِ علم کہن
گلشنِ اسلام کا کہئے جسے سرو چمن
جس نے نصرانی عزائم کے بکھیرے تار و پود
دہر سے منوا کے چھوڑا، مردِ مومن کا وجود
جس کا دل تھا واقعی دیں کی امانت کا امین
ہوگیا آہ وہ اقبال پیوندِ زمین

مذہب و معرفت پر ان کے بیشتر اشعار موجود ہیں درد کی طرح قیصر صاحب کے یہاں بھی تصوف ہر جگہ جلوہ گر ہے یہ رنگ ان کے کلام میں اتنا غالب تھا کہ تغزل کے اشعار میں بھی وہ تصوف اور فلسفۂ وحدت الوجود پیش کرتے تھے۔ ان کی غزل "کمال نظر" بھی اس کیفیت سے خالی نہیں ہے۔

شاعری ادب کا اہم حصہ ہے اور ادب کی دو حیثیتیں ہیں ایک وہ ادب جسے ہم زندہ ادب کے زمرے میں شامل کرسکتے ہیں اور دوسرا وہ جس کا اس عصری ادب سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ ایسا ادب محض جذباتی لمحے یا ذہنی بحران کی شدت سے وقتی طور پر تخلیق ہوتا ہے اور وقت کے تیز بہاؤ کے ساتھ بہہ کر ایک مدت بعد دریا برد ہوجاتا ہے مولانا قیصر کی شاعری کا تعلق حقیقی عصری ادب سے ہے ان کی شاعری میں سچی جرأت مندی ہے زندگی آفرینی ہے اور اشعار کا وافر ذخیرہ خیال افروز ہے

اور یہ عطیۂ قدرت صرف اسی شاعر کو ودیعت ہوتا ہے جو انتہائی پُرخلوص اور درد مند دل رکھتا ہو۔ مولانا کی شاعری انسان دوستی، وطن دوستی امن اور تطہیر ذہن جیسے اہم اور عالی جذبوں سے شرابور ہے۔ ان کی شاعری پڑھ کر نظریات اور عقائد میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ ان کی شاعری میں اکثر مقامات ایسے ہیں جہاں مسائل کی نشاندہی ملتی ہے۔ وہ ادب میں اقتدار اور ہر طرح کے طمع سے بے نیاز اپنا فرض نباہتے رہے۔

مولانا نے طیب اور اپنے دیگر رسائل کے ذریعہ وہ کام کیا کہ ان کے دور میں "طیب" کسی ماہنامے کا نہیں بلکہ ایک تہذیبی ادارے کا نام معلوم ہونے لگا۔ بحیثیت ایڈیٹر انھوں نے اپنے قلمدان ادارت سے نکلے مختلف جریدوں میں مہتم بالشان خدمات انجام دیں ہر شمارہ جو اُن کی ایڈیٹری میں شائع ہوا علم وفکر کے گہرے شعور سے مملو تھا۔

مولانا کی شاعری ہر صنف سخن میں تھی میرے پاس ان کے قطعات، رباعیات، مثنویاں، سہرے سب ہی موجود ہیں مگر "طیب" کے خصوصی شمارے (شاہ نمبر) کی کتابت شروع ہو چکی ہے اور اب اتنا وقت باقی نہیں رہا کہ اس تحریر میں ان سب پر روشنی ڈال سکوں۔ انشاء اللہ یہ کام کسی آئندہ وقت ہو سکے گا۔

سدا روئیں گے ہم تجھے

بقیہ ص ۱۳۲

جب وہ موڈ میں ہوتے تو ایسی ہنس مکھ باتیں کرتے کہ مجلس زعفران زار ہو جاتی۔ ایک بار میں نے عرض کیا شاہ صاحب ازدواجی زندگیاں بہت ناکام ہو رہی ہیں بالخصوص مردوں کو یہ عام شکایت ہے کہ بیویاں لڑاکی بہت ہیں۔ ہنس کر کہنے لگے۔ سسرے بیوقوف ہیں اگر بیوی شوہر سے بھی نہیں لڑے گی تو پھر کس سے لڑے گی۔ مرد تمام عمر کبھی ماں کو نخرے دکھاتا ہے، کبھی بہنوں کو، عورت بیچاری کو شادی ہی کے بعد نخرے دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ اس کے بعد فرمانے لگے، جو عورت نخرے دکھانا نہیں جانتی وہ سب کچھ ہو سکتی ہے لیکن بیوی نہیں ہو سکتی اب جو لوگ عقل سے کورے ہیں وہ اس نخرے بازی کو لڑائی اور تصادم سمجھ بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ میاں بیوی کا اختلاف بڑا ہی خوبصورت اختلاف ہے اگر جہالت اور حماقت کا شکار نہ ہو۔

بے شمار مجلسوں کی لاتعداد باتیں اوراقِ ذہن میں محفوظ اور موجود ہیں لیکن انشاءاللہ ان کا تذکرہ پھر کسی موقع پر کروں گا۔

برادر عزیز نسیم اختر شاہ قیصر کی فرمائش کی تعمیل میں فی الحال تو یہ چند سطور قلم بند کر دی ہیں۔ ویسے ہزار خوبیوں کی وجہ سے حضرت شاہ صاحب کی روح سے مخاطب ہو کر ہم یہی کہہ سکتے ہیں

؎

کہاں پائیں گے ہم تیرا نقش ثانی

سدا روئیں گے ہم تجھے یاد کر کے

آج شاہ صاحب کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے قلم و کاغذ لیکر بیٹھ گیا ہوں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ بات کہاں سے اور کیسے شروع کروں۔ کسی انسان میں ایک ہی خوبی ہو تو اس پر قلم فرسائی کرنا آسان ہے لیکن جو انسان بے شمار صلاحیتوں اور گوناگوں قسم کی خوبیوں کا مالک رہا ہو اس کی مدح سرائی کا حق ادا کرنا متعذر اور دشوار ہے۔

عام طور پر لوگ انھیں ایک ادیب ایک صحافی اور ایک شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے بلاشبہ وہ ایک اچھے ادیب ایک عمدہ اور بے نظیر صحافی تھے لیکن ان میں لاتعداد خوبیاں کچھ اور بھی تھیں جو ہر صاحب بصیرت انسان پر واضح تھیں۔ میں ایک مختصر سے مضمون میں ان کی تمام خوبیوں اور قابل ذکر صفتوں کا احاطہ نہیں کرسکوں گا۔ اجمال اور اختصار سے کام لیتے ہوئے میں اپنی اور ان کی چند ملاقاتوں کا تذکرہ کرنے پر اکتفا کروں گا یہ ملاقاتیں ماضی کی وہ سنہری یادیں ہیں جو شاید میری فانی زندگی کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہیں ان کا تذکرہ سننے کے بعد قارئین کو خود اس بات کا اندازہ ہوجائے گا کہ شاہ صاحب صرف ایک ادیب اور صرف ایک رسالہ کے ایڈیٹر نہ تھے بلکہ ایک عظیم المرتبت اور رفیع الشان انسان تھے اور ایسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے اور ہر جگہ پیدا نہیں ہوتے کبھی کبھی اور کہیں کہیں پیدا ہوتے ہیں۔

میری یہ عام عادت تھی کہ جب میں زندگی کی کش مکش اور گردو پیش کے ماحول سے گھبرا جاتا تو میرے قدم شاہ صاحب کے مکان کی طرف اٹھ جاتے۔ ان کا دولت کدہ غریب خانہ سے کافی فاصلہ پر واقع ہے لیکن یہ فاصلہ کوئی فاصلہ نہ تھا وہ اگر پہاڑ کی بلندیوں پر بھی جا کر بس جاتے تو وہاں پہنچنے میں بھی طبیعت کو اکتاہٹ نہ ہوتی۔ اس لئے کہ ان سے ملاقات کرنے کے بعد ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں اپنے ذہن کی پریشانیاں اور روح کا بوجھ اللہ کے مکان پر چھوڑ کر واپس آرہا ہوں۔ زندگی میں کئی موڑ ایسے بھی آئے کہ شاہ صاحب کی رہنمائی اگر میری امداد نہ کرتی تو شاید میں مایوسی کے کسی گہرے غار میں اوندھے منھ گر جاتا۔ غرض یہ ہے کہ جب بھی زندگی میں کوئی نازک مرحلہ پیش آیا تو میں نے شاہ صاحب کی دہلیز پر دستک دی۔ ان سے ملاقات ہوئی اور پھر ان کی نرم گفتگو سے مایوسی کے بادل ایسے چھٹ جاتے کہ ذہن کا مطلع بالکل صاف ہوکر رہ جاتا۔ ایک بار نہیں کئی بار ایسا ہوا ہے کہ میں گردش لیل ونہار سے مرتعش اور مضطرب ہوکر ٹوٹے

ہوئے دل کے ساتھ ان کی خدمت میں پہنچا اور جب واپس ہوا تو اس طرح کہ روح کیف ونشاط کی دولت سے مالا مال تھی وہ اپنی دلفریب باتوں اور مسحور کن دلیلوں سے دامن دل پر اس طرح رفو کرتے کہ دل کی دھجیاں، جامۂ ثابتہ میں تبدیل ہو جاتیں۔ واہ کیا خوب انسان تھے جو دوسروں کی ذات میں ڈوب جاتے۔ اب ایسے لوگ کہاں؟

میں ان کی خدمت میں پہنچتا تو ان کے چند لگے بندھے سوال یہ ہوتے تھے "کافی دنوں میں آئے؟ کہاں غائب تھے؟ گھر خیریت ہے، بچے ٹھیک ہیں؟، عامر صاحب کے بچے ٹھیک ہیں؟ کاروبار کیسا چل رہا ہے؟ مزے میں ہو نا؟ ادارۂ خدمت خلق کا کیا حال ہے؟"۔ وہ ایک سانس میں یہ سب سوال اور ان جیسے اور بہت سے سوال کر ڈالتے۔ اور اگر میں ان سے اپنی کسی پریشانی کا ذکر کرتا تو برجستہ ایسے دلائل تصنیف کرتے کہ میں شرمندہ ہو کر رہ جاتا۔ ایک بار میں نے عوام کی طعنہ زنی کی شکایت کی تو ہنس کر میرا مذاق اڑانے لگے اور کہنے لگے کہ مطالعہ کے دوران شاید تم نے یہ کہیں نہیں پڑھا کہ آزمائش کام کرنے والوں ہی کی ہوتی ہے، معذوروں اور اپاہجوں کی نہیں۔ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جاؤ نہ کوئی فقرہ اچھلے گا نہ الزامات کی بارش ہوگی ۔۔۔ فرمایا کرتے تھے کہ ۔۔ مولوی صاحب عزت چاہتے ہو تو ذلیل ہونے کے لئے بھی تیار رہو۔ بڑے بڑے انبیاء جو عزت کی آخری شان تھے الزامات اور طعنہ زنی کے رنج سے تو وہ بھی محفوظ نہ رہے۔ میں اور تم کیا چیز ہیں۔؟

میں ان کی یہ باتیں سنکر شرمسار ہو جاتا اور پھر وہ موضوع بدلنے سے پہلے مجھے انتہائی مشفقانہ انداز میں مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کا درس دینے لگتے۔ جو میرے لئے تریاق ثابت ہوتا۔ اور میرے مفلوج دلوں کو نئی زندگی مل جاتی۔

وہ صرف ذاتی معاملات میں ہی نہیں ملی اور اجتماعی مسائل میں بھی بڑی دل لگتی باتیں کیا کرتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند پر جب غیر لوگوں کا قبضہ ہوا تو حلقۂ حکیم الاسلام میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی اور شرافت ونجابت پر یقین رکھنے والوں کو بڑی خفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن ایسے نازک موقعہ پر بھی شاہ صاحب قیمتی ہی باتیں کرتے نظر آئے۔ انھوں نے ایک بار دوران گفتگو میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایک چال چلتے ہیں اور اس میں کائنات کے ہزار فیصلے ہو جاتے ہیں کچھ لوگوں کو بادشاہت مل جاتی ہے اور کچھ لوگ فقیر ہو جاتے ہیں، کچھ کو انعام ملتا ہے اور کچھ کو سزا۔ اور یہ بھی ہوتا ہے کہ جب دنیا میں انقلاب آتے ہیں تو کچھ لوگوں کی دنیا بنتی ہے اور کچھ لوگوں کی آخرت، کچھ لوگوں کی ذمہ داریاں ختم ہو جاتی ہیں اور کچھ لوگ ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبکر گہری آزمائش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اتنا کہہ کر وہ حسب عادت ٹہلنے لگے اور پھر قریب آکر کہنے لگے اور ابھی دیکھو ہم تو شاید نہ رہیں تم دیکھنا کہ آخری فتح کس کی ہوتی ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں ایک انقلاب اور آئیگا اور اسی وقت ہار جیت کا فیصلہ ہوگا۔ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کون ہارا اور کون جیتا۔

حضرت قاری طیب صاحب کو وہ "بھائی جی" کہا کرتے تھے ان کے انتقال پر میں نے شاہ صاحب کو بے حد ملول پایا۔ اور دوران گفتگو میں کئی بار آنسوؤں سے روئے۔ ایک بار انھوں نے غم میں ڈوبی ہوئی آواز میں یہ بھی فرمایا کہ حسن میاں، یہ ایسا وقت ہے کہ تم بھی دل کھول کر رو لو اور میں بھی دل کھول کر رو لوں، تم مجھ سے اظہار تعزیت کرو اور میں تم سے اظہار تعزیت کروں۔ میں نے انھیں صرف حضرت مہتمم صاحب کی وفات پر روتے اور بلبلاتے دیکھا۔ ورنہ وہ ہر حال میں شگفتہ اور کھل کھلاتے نظر آتے۔

ان کی طبیعت میں مزاح کا عنصر غالب تھا (باقی صفحہ ۱۳ پر)

حضرت مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصرؒ

ایک عظیم صحافی

ایک دردمند انسان

مولانا محمد حماد قاسمی

سرزمین دیوبند اپنی آغوش کی پروردہ ان مایۂ روزگار ہستیوں پر جتنا بھی ناز کرے کم ہے جو نہ خود دنیائے علم وعمل میں آفتاب وماہتاب بن کر چمکے بلکہ پوری کائنات کو اپنی ضیا بار کرنوں سے منور کیا۔ یہی وہ مقدس سرزمین ہے جس نے آج سے تقریباً ۶۵ سال پہلے حضرت مولانا سید ازہر شاہ قیصر جیسے بے باک خوددار اور جری صحافی کو جنم دیا آپ اس عظیم باپ کے بیٹے تھے جسے دنیا آج بھی چلتا پھرتا کتب خانے کے نام سے یاد کرتی ہے۔

خداداد ذہانت وذکاوت اور قوت حافظہ میں بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ آپ اپنے عظیم باپ (علامہ سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ) کی یادگار تھے۔ آسمانِ صحافت کا یہ منور ستارہ جس نے اپنا بچپن زمانہ کی نادرۂ کار ہستیوں کے زیر سایہ بسر کیا تھا کمسنی کے عالم میں ہی "صدیق اکبر" اور "صداقت اسلام" نامی دو کتابوں کا مصنف ہوچکا تھا۔

وقت کا کارواں دبے پاؤں آگے بڑھتا اور دنیائے صحافت کا یہ تابناک ستارہ اپنی روشنی پوری دنیا میں بکھیرتا رہا۔ ہندوستان کے مشہور معیاری مجلات اخبارات وجرائد میں آپ کے علمی وتحقیقی مقالات دینی واصلاحی اور ادبی مضامین خوب چھپتے اور دلچسپی سے پڑھے جاتے۔ لگ بھگ چالیس سال تک ایشیا کی عظیم عربی یونیورسٹی دارالعلوم کے ترجمان رسالہ دارالعلوم کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے اور پوری آب وتاب اور آن بان کے ساتھ رسالہ نکالتے رہے جبکہ اسی رسالہ کی ادارت پر اس سے پہلے بڑے بڑے قلمکار اور اچھے اچھے صحافی ناکام ہوتے رہے تھے۔ آپ کی ادارت میں اخبار اشاعت حق اور رسالہ ماہنامہ طیب بھی بڑی خوبصورتی اور پوری پابندی کے ساتھ نکلتا رہا اور عوام میں خواص میں داد تحسین حاصل کرتا رہا۔ ان پرچوں کے نکالنے میں آپ کے منجھلے لڑکے مولانا نسیم اختر قاسمی جنھیں اللہ تعالیٰ نے لکھنے کا بڑا اچھا ذوق وسلیقہ عطا کیا ہے بلکہ اپنے نامور باپ کی تمام خوبیوں سے نوازا ہے خوب ہاتھ بٹاتے اشاعت حق اور ماہنامہ طیب آج بھی مولانا نسیم اختر شاہ زندگی کے سب سے اندوہناک اور روح فرسا حادثہ کے باوجود نکال رہے ہیں ان کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ پرچے کا معیار برقرار رہے اور پرچہ اپنی پہلی سی رعنائی اور پابندی کے ساتھ نکلتا رہے میری دعا ہے اللہ ان کے حوصلے کو بلند سے بلند تر کرے اور زندگی کے ہر موڑ پر ان کی مدد فرمائے (آمین)

یہ بات کہنے کی نہیں کہ یہ مشہور ادیب اور انشاپرداز جو اپنے وقت کے بڑے بڑے ادیبوں اور انشاپردازوں میں اپنا ایک منفرد اور ممتاز مقام رکھتا تھا عوام و خواص میں ایک محبوب اور مقبول مصنف کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا ہے۔

اس عظیم صحافی کو اللہ تعالےٰ نے جہاں طبعاً نہایت خوش مزاج، ظریف الطبع، خلیق و ملنسار بنایا تھا وہیں پہلو میں ایک نرم و نازک، حساس اور دھڑکتا ہوا دل بھی دیا تھا جو بغیر کسی تفریق کے اپنوں، بیگانوں، شناساؤں، اجنبیوں ہر ایک کے دکھ درد کو اپنا دکھ ہر ایک کے غم کو اپنا غم ہر ایک کی ضرورت کو اپنی ضرورت ہر ایک کی خواہش کو اپنی خواہش محسوس کرتا راقم الحروف کو دیوبند کی دس سالہ زندگی میں خوش قسمتی سے اس عظیم اور دردمند صحافی کی بہت زیادہ قربت میسر رہی ہے۔ اس طویل مدت میں میں نے بارہا دیکھا ہے کہ کوئی پریشانی کا مارا جب کوئی معاملہ لے کر آپ کے پاس آجاتا تو آپ اس طرح بے چین و بے قرار اور مضطرب ہو جاتے جیسے یہ معاملہ خود آپ کا ہی ہو۔ پھر فوراً اس کے ساتھ ہی نکل جاتے۔ تھانہ، کچہری، آفس، مدرسہ جہاں کہیں کا بھی کام ہوتا اس کے ساتھ جاتے اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھتے جب تک اس کا کام نہ ہو جاتا مدرسہ کے بہت سے طالب علم جن کو مدرسہ سے قیام و طعام کی سہولت نہ ملتی آپ اپنے یہاں اس کے رہنے اور کھانے کا انتظام کرتے یا پھر اپنے اثرات سے جہاں کہیں بھی ہوتا انتظام فرما دیتے۔ میری طالب علمی کے زمانہ میں خود میرے بہت سے قریبی دوست اس دردمند صحافی کے زیر تربیت مستقل انہیں کے یہاں مقیم رہتے آپ اپنے یہاں رہنے والے طالب علموں اور اپنے متعلقین کو بالکل اپنا بیٹا سمجھتے۔ باپ جیسی بے لوث محبت و شفقت کے ساتھ ساتھ ان کی بہترین تربیت کرتے اور علمی رہنمائی فرماتے۔

اس عظیم صحافی اور دردمند انسان کا جسد خاکی قانونِ قدرت "کل نفس ذائقۃ الموت" کے مطابق ہمیشہ ہمیش کے لئے ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ لیکن صفحۂ قرطاس پر پھیلے ہوئے شاندار علمی کارنامے اور دلوں کے نہاں خانوں میں ثبت شدہ محبت کے انمٹ نقوش تادمِ حیات اُن کی یاد تازہ کرتے رہیں گے۔

شاہ صاحب کی ادبی اور صحافتی خدمات
(ص ۳۷ کا بقیہ)

مولانا ازہر شاہ کی تصانیف کو سمجھنے کے لئے جہاں روحانی اور اخلاقی باتوں کا علم ضروری ہے وہاں مادی اور مسائل علم النفس سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ مولانا اپنی عہد آفریں تصانیف کی بدولت شہرت دوام حاصل کر چکے ہیں۔ لیکن یہ شاہ صاحب کی بے چین تجربہ پسند اور جدت کی رسیا شخصیت کے اظہار کا صرف ایک پہلو ہے۔ مولانا فلسفیانہ ذہن رکھتے تھے کتنے ہی مسائل کو نئی روشنی میں باندازِ نو تشریح و تفہیم کی کامیاب کوشش کر چکے ہیں جن سے مولانا کی علمی شخصیت کا ایک نیا پہلو ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔

مولانا کی تحریروں میں بصیرت بھی ہے اور ندرت بھی اس اعتبار سے شاہ صاحب اپنے اکثر ہم عصروں سے کہیں زیادہ جدید ہیں۔

شاہ صاحب کامیاب شاعر بھی تھے مگر شاعری کے علاوہ دیگر علوم پر بھی ان کی گرفت اور پکڑ بے انتہا مضبوط تھی۔

شاہ صاحب کی ادبی اور صحافتی خدمات

س۔ م۔ س۔ فنکر میرٹھی ایم اے انگریزی و اردو۔

دیوبند دنیائے علوم کی ایک نادرالوجود بستی ہے اس مردم خیز خطے میں دنیا جہان کی گرانمایہ اور باکمال و ہنرور ہستیاں پیدا ہوئیں اور دیوبند کو اپنے لازوال اور غیر فانی تخلیقات سے بہشت ادب اور فردوس علم بنا گئیں۔ دیوبند کا نام ہندوستان کی تاریخ میں ممتاز و ارفع مقام رکھتا ہے۔ جغرافیائی نسبت سے دیوبند یوپی کا ایک دلکش علاقہ ہے ثقافتی لحاظ سے وہ انفرادی حیثیت کا حامل ہے، سماجی اعتبار سے وہ بیسویں صدی کی ترقی پسندی اور قدیم ترین زمانے کی ثقافت کا دل آویز سنگم ہے۔ سیاسی طور پر جب بھی ہمارے ملک و قوم پر کوئی وقت پڑا یہاں کے جیالے سورماؤں نے تلواروں اور نیزوں کی آنی پر اپنے سینے ٹیک ٹیک دئے۔ ادبی اور علمی زاویے سے یہاں کے علماء اور فضلاء ملک کے بے تاج بادشاہ کی حیثیت رکھتے ہیں: ان سب کا تعارف کرانا سر دست دشوار ہے۔ بہر حال ان میں سے ہر ایک نے بے حد گرانقدر اور آفاقی خدمات انجام دیں ہیں اور ہر ایک اپنی نابغہ روزی کے لئے اپنی مثال آپ ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم رحہ جہاں دارالعلوم دیوبند کے بانی تھے وہاں حضرت مولانا محمود الحسن رحہ ریشمی رومال تحریک کے بانی تھے۔ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحہ، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحہ حکیم للاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب رحہ اور ایسی ہی اور بھی لاتعداد مبارک ہستیاں دیوبند کے آسمان پر درخشندہ ستارے بنکر چمکیں۔ الغرض ہزاروں شخصیات دیوبند کی سرزمین سے اٹھیں اور کرۂ ارض پر ان کی روشنی پھیلتی چلی گئی۔ ان علماء اور فضلاء کی اپنی اپنی انفرادی شان تھی۔ جلالت علم کے مالک حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری رحہ کی خدمات اور کارناموں کو بھلا کون بھلا سکے گا انھوں نے اپنی عمر عزیز کے ایک ایک لمحے کو ملک، قوم اسلام، اخلاق کی خدمت میں صرف کیا اور اپنے پیچھے اپنے ارشد تلامذہ کا وہ مضبوط اور باکمال حلقہ چھوڑا جس کی حکمرانی گذشتہ نصف صدی زائد سے بھارت اور پاکستان ہی میں نہیں بلکہ سات سمندر پار کے ممالک میں بھی علم، کمال، صحافت، ادب اور قلم کے میدان

جاری ہے۔

صرف ایک حضرت شاہ صاحبؒ کو ہی لے لیجئے۔ ایک جامع کمالات آدمی تھے۔ بلا کا ذہن پایا تھا بے نظیر حافظہ تھا اتنی زبردست یادداشت کہ ان شاء اللہ پچاس سال پہلے کی بات یوں بیان کردیتے تھے جیسے ابھی ابھی کا واقعہ ہو لازوال علمی خزانے کے مالک تھے ان کی عظمت ان کی شخصیت میں بھی تھی علمائے دیوبند میں ان کا اپنا مقام ہے بے حد بلند اور حد درجہ ممتاز۔

دیوبند کی علمی خدمات کا ذکر ہو اور خواہ وہ کسی دور کا ہو یہاں کے دانشوروں نے بے پناہ علمی خدمات انجام دی ہیں یہاں کے علماء نے جہاں ایک طرف وقت کے پیچیدہ اور الجھے مسائل پر کتابیں دیں وہاں پوری قوم کی زبوں حالی، خستہ تنی اور نکبت و پریشانی کو سامنے رکھ کر بھی کتابیں تحریر کیں اور اتنی کیں کہ انبار لگا دیا۔ قادیانیت کے مہلک اور خطرناک فتنے کے وقت علامہ سید انور شاہ کشمیری رحؒ کی رد قادیانیت پر گراں قدر علمی تصانیف، مولانا اشرف علی تھانوی رحؒ کی ایک ہزار کے لگ بھگ تصانیف غرضیکہ کوئی دور ایسا نہیں جب یہاں کے افراد نے قلمی میدان میں علمی جہاد اور دانشمندانہ اصلاح کا کام نہ کیا ہو۔

دیوبند کی مٹی میں جب صحافت کا خمیر اٹھا تو یہاں القاسم، الرشید جیسے جرائد، مہاجر، استقلال جیسے ادبی اخبارات، ہادی، خالد، تجلی جیسے شش ماہی رسائل منظر عام پر آئے۔ دیوبند کا موازنہ ملک کے کسی بھی خطے سے کر لیجئے۔ گذشتہ سوا سو سال کی تاریخ میں دیوبند ادبی، صحافتی اور قلمی خدمات میں کہیں پیچھے نظر نہیں آتا اور یہ وہ حقیقت ہے جس سے ملک کا کوئی دوسرا حصہ دیوبند کی ادبی اور علمی خدمات سے منکر نہیں ہو سکتا۔

الغرض ہر دور اور ہر زمانے میں دیوبند میں لکھنے والوں کا ایک بڑا طبقہ رہا ہے۔ مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر کا تو کہنا ہی کیا۔ شاہ صاحب کے معاصرین میں علامہ انور صابری مرحوم، مولانا سید محبوب رضوی مرحوم، مولانا ظفیر الدین صاحب، مولانا عامر عثمانی مرحوم جمیل مہدی، مسعود جاوید وغیرہم جیسے نورتن تھے علامہ انور صابری شاعری کی دنیا میں ایک قدآور شخصیت رہے مگر مرحوم شاہ صاحب کی قلمی خدمات کے وہ بھی مداح و معترف تھے۔ عقیل مخزوں نے بھی شاعری کی دنیا بسائی مگر ان کی زندگی نے وفا نہیں کی۔ مولانا سید محبوب رضوی مرحوم ایک محقق و مؤرخ تھے اور بطور محقق و مورخ علمی دنیا میں متعارف اور مشہور تھے ان کی تصانیف میں تاریخ دارالعلوم، تاریخ دیوبند اور مکتوبات نبوی ؐ مشہور بھی ہیں اور مقبول بھی۔ مولانا ظفیر الدین آج بھی علمی دینی اور مذہبی مقالات اور مضامین کا انبار لگائے چلے جا رہے ہیں۔ مولانا عامر عثمانی مرحوم کی خصوصیات کے کیا کہنے وہ خود میں ایک انجمن تھے، مسعود جاوید جاسوسی ناول نگاری میں اپنی صلاحیتوں کے اتنے چراغ روشن کر چکے ہیں کہ آنے والے مصنفین ان کی روشنی میں ایک نیا راستہ ایک نئی منزل پا سکیں مسعود جاوید بفضلہ بقید حیات ہیں مگر اب کئی سالوں سے لکھنے لکھانے کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔ جمیل مہدی دیوبند کی سرزمین میں پیدا ہوئے مگر اب لکھنؤ کو اپنا مسکن بنا چکے ہیں۔ جب دیوبند کی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو بے تاب کر دیتی ہے تو آکر دیوبند کی سرزمین کو دیکھ جاتے ہیں۔ ان کا طرز تحریر انتہائی منفرد اور دلکش ہے جس کی جھلک ان کے روزنامہ عزائم میں ملتی ہے جسے وہ سالہا سال سے انتہائی پابندی سے نکالتے چلے آ رہے ہیں۔

حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری رح کے فرزندِ ارجمند، مولانا سید ازہر شاہ قیصر کو علم و کمال، وسعتِ نظر، حافظہ، یادداشت، وسیع المطالعگی، شوق کتب بینی۔ ورثہ میں ملا تھا انھوں نے صحافت اور ادب کی دنیا میں قدم رکھا تو اپنی الگ دنیا بنا لی۔ اردو ادب اور صحافت کو نیا لب ولہجہ اور نیا آہنگ بخشا انشا پردازی ان کی فطرت میں رچ بس گئی تھی قدرت نے اس میدان میں انھیں یدطولیٰ سے نواز دیا تھا اپنے معاصرین میں وہ سب سے ممتاز ہیں وہ بیک وقت صحافی بھی تھے اور انشاء پرداز بھی، ادیب بھی تھے اور مزاح نگار بھی۔ محقق بھی تھے اور مؤرخ بھی، عالم باعمل بھی اور سوانح نگار بھی۔ کوئی موضوع خواہ علم وادب کا ہو، تاریخ یا سیاست کا ہو، سماج کا ہو یا تحقیق کا ہو ان کے قلم سے نہیں بچا لکھنے کا کوئی بھی میدان ہو وہ کبھی عاجز نظر نہیں آئے۔ کہا جاتا ہے کہ صحافت کی ڈگر دشوار گذار منازل سے گذرتی ہے شاہ صاحب نہایت بے لاگ نڈر اور جری صحافی تھے انگریزی اقتدار سے لیکر ملک کے موجودہ سیاسی اقتدار تک وہ عمر بھر سچائی، دیانتداری اور اصل حقائق کے دیئے روشن کرتے رہے۔ ان کے خمیر میں غیرت خودداری اور نگوں ساری تھی۔ مزاج بھی ایسا پایا تھا کہ اپنی پریشانیوں اور مجبوریوں کے زمانے میں بھی اپنے موقف سے سر مو ادھر ادھر جنبش نہیں کرتے تھے۔

ان کی وہ تحریریں جو تقسیم وطن سے قبل کے بلند پایہ جرائد و اخبارات میں شائع ہوتی رہیں اس کی شاہد ہیں ایسا لگتا ہے کہ تحریر کے میدان میں وہ کام کرنے ہی کے لئے پیدا ہوئے تھے۔

حاصلِ عمر نثارِ رہ یارے کردم
شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

زندگی بھر انھوں نے بیشمار جرائد کا قلمدانِ ادارت سنبھال کر ان کی قیادت کی ذمہ داریاں نبھائیں شاید کسی اور تنہا شخص کے لئے اتنی ذمہ داریاں نبھانا مشکل ہوتا وہ اگر چاہتے تو ان خدمات کے عیوض بڑے سے بڑا اعزاز یا منصب حاصل کر لیتے مگر یہ ان کی خوددار طبیعت کے منافی تھا۔ اللہ کے اس طرح کے بندے کب کسی مسند یا منصب کے طالب رہتے ہیں انھوں نے بے حد اور بے تحاشہ لکھا۔ حیرت ہے اردو کی موجودہ اکاڈمیاں ان کے گرانمایہ اور گرانقدر ادبی اور صحافتی خدمات کی جانب سے چشم پوشی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی یہ سوچ کر بہت برا بھی لگنے لگتا ہے کہ جب اردو کے ایسے مخلص اور دیرینہ خدمت گذار کی خدمات کو اکاڈمیاں کوئی اہمیت نہیں دے پائیں تو پھر کیا فائدہ ہے کہ انسان زندگی بھر اردو کی ترویج وترقی اور اعلیٰ ادب کی تخلیق میں صرف کرے۔

صحافت کی دنیا میں مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد عثمان فارقلیط، جناب عبدالوحید صدیقی، جناب عشرت علی صدیقی جناب خان غازی کابلی، جناب ناز انصاری، منشی پیارے لال شاکر میرٹھی، جناب وسیم تمنا میرٹھی وغیرہم کی کب قدم افزائی ہوئی ہے۔ ان میں سے کتنوں کو حکومت یا اکاڈمی کا اعزاز نصیب ہوا ہے، کتنوں کو ان کے ضعیفی کے ایام میں حکومت کی دستگیری نصیب ہوئی ہے۔ اگر مولانا ازہر شاہ قیصر کی صحافی خدمات کو نظر انداز کر دیا گیا تو کون سے بڑے تعجب کی بات ہے لیکن ذوق و غالب کے عصر میں ذوق بادشاہ کے استاد بنے اور غالب فلاکت زدہ زندگی گذارتے رہے مگر آج غالب کا مقام کیا ہے اگر حکومت نے اسے اعزاز نہیں بخشا تو کیا تاریخ نے بھی اس کی قدر افزائی نہیں کی۔ غالب کو حکومت وقت نے لاکھ نہ نوازا ہو مگر آج وہ اردو ادب کے بے تاج بادشاہ ہیں اور ان کا کلام درجنوں غیر اردو زبان میں ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ (باقی ص ۱۴۳ پر دیکھئے)

میرے عزیز دوست مولانا نسیم اختر شاہ قیصر اپنے موقر جریدہ ماہنامہ "طیب" دیوبند کے شاہ نمبر میں میرا مضمون شامل کرکے رسوائی کا سامان فراہم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

عزیز موصوف ایک ہونہار فاضل اور ذہین صحافی و اہل قلم ہیں۔ اس سے بڑھ کر وہ بہت اچھے انسان بھی ہیں۔ ان کی اسی صفت نے مجھے ان سے بہت قریب کر دیا ہے۔ اس صورت میں مجال انکار بھی نہیں ہے ــــــــــــــــــ۔

سوچتا ہوں کیا لکھوں؟ اور کہاں سے لکھوں؟ معاملہ کسی ایسے ویسے کا نہیں، بلکہ مولانا سید ازہر شاہ قیصر کا ہے وہ ازہر شاہ قیصر جو بیک وقت عالم دین بھی تھے اور بے باک صحافی بھی۔ ایک کہنہ مشق اہل قلم و انشاء پرداز بھی تھے اور خوش فکر شاعر بھی۔ ایسی یک رنگ و صد رنگ شخصیت کو قلم کا سہارا لیکر کاغذ پر پیش کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ــــ یہ کام قلم کا نہیں موئے قلم کا ہے۔ اور میں اس فن میں بالکل کورا ہوں پھر بھی ہمت کرکے لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ یہ سوچ کر کہ اگر کامیاب ہو گیا تو مضمون نگار ہوں ہی اور اگر کامیاب نہ ہوسکا تو شہیدوں میں تو شمار ہو ہی جائے گا ــــ ــــ سودا کسی صورت میں بھی گھاٹے کا نہ ہوگا۔

دراز قد، فربہ جسم، سرخ و سفید چہرہ، پانوں کی کثرت سے سرخ ہونٹ اور پان زدہ دانت سنہری فریم کی عینک اور ان میں سے جھانکتی ہوئی تیز اور ذہین آنکھیں اور کناروں پر سرمہ کی گہری لکیریں، کشادہ پیشانی اور اس پر غرور علم و تقدس کی مظہر سلوٹیں۔ منڈا ہوا سر اور اس پر دوپلی مگر نوکدار ٹوپی۔ یکمشت و دو انگشت کے معیار پر پوری اترتی ہوئی ادھ پکی داڑھی شخصیت کو مزید باوقار بناتا ہوا۔ شانوں پر تکونا رومال، ایک ہاتھ میں قلم و کاغذ اور پاندان سے بھرا ہوا پرس (منی بیگ) اور دوسرے ہاتھ میں نازک سی چھڑی ــــــــــ" یہ تھا شاہ صاحب کا وہ خیالی پیکر جو میرے صفحۂ ذہن پر اس وقت ابھرا تھا جب میں نے پہلے پہل رسالہ "دارالعلوم" دیوبند کے مدیر کی حیثیت سے ان کا نام اسطرح

دیکھا تھا۔" ابن الانور سید محمد ازہر شاہ قیصر"
غالباً یہ ۱۹۶۶ء کی بات ہے
پھر خدا جانے کیوں دل نے یہ بے ساختہ تقاضا کیا کہ میں ان سے ملاقات کروں لیکن کوئی موقعہ میسر نہ آسکا اللہ کی طرف سے جس کام کے لئے جو وقت مقرر ہو چکا ہو اس سے پہلے ہو جانا ممکن بھی نہیں ہے۔ انسان مجبور بھی ہے وہ صرف کوشش کر سکتا ہے۔ اور بس

۱۹۷۰ء میں شاہ صاحب کے برادر زادے برادرم (مولانا) احمد خضر شاہ مسعودی (ابن مولانا سید انظر شاہ مسعودی) سے رسم و راہ ہوئی پھر اس رسم و راہ نے گہرے تعلقات کی شکل اختیار کر لی۔ میں ان دنوں دارالعلوم امروہہ میں کام کر رہا تھا اور عزیز موصوف مدرسہ شاہی مراد آباد میں زیر تعلیم تھے، ان کے دوستانہ اصرار پر میں نے عید قرباں کی چھٹیاں دیوبند میں گذارنے کا پروگرام بنایا دیوبند کا یہ میرا پہلا سفر تھا۔ تقریباً ایک ہفتہ قیام رہا۔ احمد میاں نے دیوبند اور دارالعلوم کے متعدد علماء و اکابر سے ملاقاتیں کرائیں۔ میرے فکری استاذ اور ایشیاء کے عظیم ترین اہل قلم، صحافی شاعر ناقد اور عالم دین حضرت مولانا عامر عثمانی سے مراسلت و مشورت کا سلسلہ تو ایک عرصہ سے قائم تھا مگر انھیں قریب سے دیکھنے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کچھ سننے سنانے کا پہلا سنہری موقع اسی سفر میں میسر آیا۔ مولانا شریف الحسن صاحب شیخ الحدیث، مولانا فخر الحسن صاحب صدر المدرسین مولانا سید انظر شاہ صاحب استاذ حدیث دارالعلوم سے شرف ملاقات اسی سفر میں حاصل ہوا۔ مشہور مؤرخ مولانا سید محبوب رضوی کو پہلی بار یہیں دیکھا۔

ایک روز احمد میاں کے ہمراہ محلہ خانقاہ میں "آستانۂ انورشاہ کشمیری" پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ وہاں انھوں نے کئی دوستوں سے تعارف کرایا ہم لوگ بیٹھے شعر و ادب کی باتیں کر رہے تھے۔ اسی اثناء میں فائل در بغل، ایک بزرگ نمودار ہوئے، نووارد بزرگ میں بظاہر کوئی کشش نہ محسوس ہوئی لیکن میں نے دیکھا کہ ان کو دیکھتے ہی سب لوگ کھڑے ہو گئے۔ یہ کھڑا ہونا بھی رسماً اور تکلفاً نہ تھا، بلکہ اپنے جلو میں ادب و احترام کی غیر معمولی کیفیت لئے ہوئے تھا۔ ادب و احترام کی وہ کیفیت جو واقعی کسی عظیم و معزز شخصیت کے ساتھ ہونی چاہئے۔ معاً مشہور اسلام پسند شاعر جناب حفیظ میرٹھی کا یہ شعر صفحۂ ذہن پر ابھر کر آگیا ؎

انجمن میں آکے سب سے گرم جوشی سے ملا
ایک نووارد جسے جانے نہ پہچانے کوئی

حالانکہ وہ نووارد صرف میرے ہی لئے تھے دوسرے حاضرین کے لئے نہیں۔

"یہ مولانا سید ازہر شاہ قیصر ہیں" ــــ میرے پاس بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے سرگوشی کے انداز میں بتایا ــــ یہ سنکر میری آنکھیں چوندھیا گئیں۔ کافی دیر تک یقین ہی نہیں آیا کہ یہی ہیں وہ ابن الانور مولانا سید ازہر شاہ قیصر جن کے شگفتہ و پُر بہار قلم نے رسالہ دارالعلوم کے صفحات کے ذریعہ نہ جانے کتنے قلوب کو جیت لیا ہے اور نہ جانے کتنے اذہان کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔

دل نے کہا ہرگز نہیں یہ ازہر شاہ قیصر نہیں ہو سکتے یہ نوجوان مذاق کے موڈ میں ہے اسلئے کہ نووارد بزرگ شکل و صورت اور ظاہری ہیئت کے اعتبار سے نہ تو ابن الانور

ــــــــــــــــ
ع امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رح کے فرزند کبیر۔

معلوم ہورہے تھے اور نہ شاہ اور قیصر — پھر کچھ دیر بعد ہم سب ان کی شستہ وشگفتہ اور پرمغز وباوقار گفتگو میں کھو گئے۔ آنے والا ہر لمحہ ریب وتشویش کی جھاڑیوں کو کاٹتا چھانٹتا اور صاف کرتا گیا اور پھر وہ لمحہ بھی آگیا کہ دل یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ یہی ہیں یگانۂ روزگار علامہ سید انور شاہ کشمیری رح کے فرزند کبیر اور ماہنامہ دارالعلوم کے مدیر باتمکین — البتہ میرا وہ خیالی پیکر ریزہ ریزہ ہوگیا جو میں نے ایک مدت سے شاہ صاحب کے تعلق سے ذہن میں بنا رکھا تھا۔

موصوف مرحوم کا جسم خالص غیر مولویانہ تھا اور قد ایسا تھا کہ شریا حماقت کی کوئی روایت وابستہ نہ کی جاسکے، ان کا چہرہ پندار زہد وتقدس کے بجائے خلوص وعجز کے نور سے دمک رہا تھا کھلی ہوئی پیشانی کبر ونخوت کے بجائے فہم ودانائی کی غماز تھی. جسم پر کبھی کبھی شیروانی بھی ہوتی تھی اور سر پر انور کیپ بھی مگر اظہار علم وشرافت کے لئے نہیں بلکہ تحفظ تہذیب و تمدن کے لئے وہ اسی کو اپنی دولت اور سرمایہ تصور کرتے تھے۔ انکی آنکھیں گہری ضرور تھیں مگر چالاکی اور عیاری سے محفوظ اور متانت وسنجیدگی کی آئینہ دار شانوں پر رومال رکھتے بھی دیکھے گئے ہیں مگر بوقت ضرورت۔

"آستانۂ انور" کی اس مختصر سی ملاقات کے بعد نہ جانے کس جذبے سے مجبور ہوکر میں ان کی طرف کھنچتا ہی چلاگیا۔ دیوبند میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد جب بھی میں ان سے ملا، ان کے پرخلوص اور مشفقانہ رویے میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی۔

شاہ صاحب نے جس عہد میں شعور کی آنکھیں کھولیں وہ علمی وادبی لحاظ سے نہایت روشن اور تابناک تھا۔ خود ان کا دیوبند بھی موجودہ دیوبند سے بہت مختلف تھا۔ شاہ صاحب نے ہوش سنبھالا تو انہیں ہر طرف علم وحکمت اور شعر وادب کے چرچے سنائی دئے اور

ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد

کے مصداق وہ بھی اسی رنگ میں رنگ گئے شعر وادب ان کا اوڑھنا بچھونا بن گیا، رسائل میں ان کی نگارشیں شائع ہونے لگیں، ارباب علم وفن سے شناسائی اور اس عہد کے اکثر نقادوں ادباء، شعراء اور ارباب قلم سے مراسلت کا سلسلہ جاری رہا۔ ان میں سے حضرت جگر مرادآبادی علامہ شفیق جونپوری، مولانا ماہر القادری، عبدالمجید سالک مولانا غلام رسول مہر، مولانا ظفر علی خاں، سیماب اکبرآبادی نازش پرتابگڈھی، علامہ تاجور نجیب آبادی، روش صدیقی، مظہر علی اظہر اور احسان دانش وغیرہ کے خطوط ان کے فائل میں اب بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان ارباب فکر ودانش سے نہ صرف یہ کہ مرحوم کا گہرا تعلق ہی رہا ہے بلکہ ان کے نزدیک مقبول وہر دل عزیز بھی رہے ہیں۔ اور ان سب کا انھیں اعتماد حاصل رہا ہے۔

مشہور شاعر سیماب اکبرآبادی نے جب منظوم ترجمہ قرآن (وحی منظوم) کی تکمیل کرلی تو اس پر مقدمہ لکھنے لکھانے کی ذمہ داری مرحوم کے سپرد کی اور خط لکھا کہ:۔

محب مکرم　　　السلام علیکم

کارڈ پہنچا۔ رمضان المبارک کی یکسوئی طلب ساعتوں میں میری متواتر زحمت دہی دخل در معقولات تو ضرور ہے مگر کیا کروں جو سلسلہ ایک مدت سے چھڑا ہوا ہے اسے ختم کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا امید کہ آپ

معاف فرمائیں گے۔

ترجمہ منظوم کے جو اقتباسات میں نے مولانا گیلانی صاحب کو حیدر آباد بھیجے تھے وہی آج حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی خدمت میں براہ راست بھیج رہا ہوں۔ جانتا ہوں کہ وہ مصروف ہیں اور ۹؍ اگست ۱۹۴۷ء کی شام تک انھیں کراچی بھی پہنچنا ہے مگر آپ نے اگر پوری توجہ سے کام لیا تو ان کی رائے لے لینا مشکل نہیں ہے۔ صرف چند منٹ ترجمہ کے دیکھنے اور چند منٹ چند سطریں لکھنے میں صرف ہوں گے مجھے ان کی رائے لینے کی بڑی تمنا ہے اور اسی غرض سے میں دیوبند بھی گیا تھا مگر وہ اسوقت میری بدقسمتی سے علیل تھے پھر بھی میں ان کے اخلاق عظیم سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

جن حضرات گرامی کے اسماء عالی آپ نے مقدمہ کے لئے لکھے ہیں اپنی نارسائی کی وجہ سے میں انمیں سے کسی کو نہیں جانتا۔ وہ یقیناً صاحب علم وفضل ہونگے مگر خیر... اگر مولانا عثمانی کسی طرح مقدمہ نگاری پر رضامند ہو جائیں تو یہ سب سے بڑی کامیابی ہوگی۔ ورنہ اس تمام جدوجہد کے بعد یہی بہتر ہے کہ میں آپ ہی کو اس کار خیر کے لئے زحمت دوں اور مجھے در در کی بھیک نہ مانگنی پڑے۔ ایک کامیاب کوشش مولانا عثمانی کے لئے اور کر دیکھئے۔ اور اس کے بعد ان سے اقتباسات لے کر خود ہی بسم اللہ کیجئے۔ میں مقدمہ میں جو باتیں بطور خاص رکھنا چاہتا ہوں وہ پھر کسی خط میں لکھ دونگا۔

امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے

دعاگو

"سیماب"

رئیس المتغزلین جگر مرادآبادی مرحوم کی غزل پہلی بار شاہ صاحب کے ذخیرۂ خطوط میں اور جگر صاحب کی اپنی ہی تحریر میں پڑھنے کو ملی۔ ؎

کس کا خیال ہے دل مضطر لئے ہوئے
آنسو ہیں رنگ و بوئے گل تر لئے ہوئے

کونین کی ہوس میں ہے انساں ذلیل وخوار
کونین اپنے سینے کے اندر لئے ہوئے

یادش بخیر پھر ہے اسی رہ گذر کی یاد
گذرے تھے ہم جہاں سے کبھی سر لئے ہوئے

اللہ رے بے بسی کہ غم روزگار بھی
بیٹھا ہوں تیرے غم کے برابر لئے ہوئے

شرم گنہ سے بڑھ کے ہے عفو گناہ کی شرم
یارب کہاں میں جاؤں یہ نشتر لئے ہوئے

راقم الحروف کی ادبی تربیت ایک ایسے ماحول (امروہہ) میں ہوئی جہاں الفاظ بولے نہیں، ڈھالے جاتے ہیں الفاظ کی دیکھ بھال اور فن کی پاسداری "مزاج محبوب" سے بھی زیادہ اہتمام کے ساتھ کی جاتی ہے۔ شعر وادب کے قدیم وجدید لوازم، فصاحت وبلاغت، تلفظ اور الفاظ کے محل استعمال کا غیر معمولی التزام کیا جاتا ہے کسی گفتگو میں حصہ لینے کے لئے غیر معمولی تیاری کرنی پڑتی ہے۔ عام مجلسوں میں بھی کافی محتاط اور بیدار رہنا پڑتا ہے۔ اگر کسی نے "کیا" کے بجائے "کرا" ہچکیوں یا ہچکیاں کے بجائے "ہچکی" "رضائی" کے بجائے "رَضائی" (را مفتوح) یا "آپ" کے بجائے "تو" وغیرہ بول دیا تو سمجھئے کہ اس کی شامت آگئی۔ کئی روز اس پر تنقیدیں ہونگی، اس کی اخلاقی وتہذیبی روش پر گفتگو ہوگی ایک ایک لفظ کی تحقیق میں ہفتوں صرف کیا جاتا وہاں کا عام

معمول ہے۔ ایسے شعراء و اُدباء کی قابل ذکر تعداد وہاں آج بھی موجود ہے جن کے کلام سے استناد کیا جا سکے یا ان کی تحریریں حوالے کے طور پر نقل کی جا سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی شاعر یا مضمون نگار خواہ کتنا ہی بڑا اور مقبول کیوں نہ ہو میرے نزدیک زبان و بیان کی بعض معمولی کوتاہیوں کے سبب ناقابل التفات ہوتا ہے۔ یہ میری کمزوری ہے۔ اس خصوص میں میں خود کو مجبور پاتا ہوں۔ مجھے اس بات کے اظہار میں کوئی باک نہیں کہ شاہ صاحب نے ان لوازم کو کماحقہ نہیں برتا۔ متروکات اور ناقابل استعمال الفاظ کو بھی اپنے ہاں بڑی فراخ دلی کے ساتھ جگہ دی ہے لیکن یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ ان کی نثر میں بلا کا رچاؤ، غضب کا مٹھاس اور بے انتہا والہانہ پن پایا جاتا ہے۔ یوں تو شاہ صاحب ادیب بھی تھے اور شاعر بھی صحافی بھی تھے اور سوانح نگار بھی مگر راقم الحروف کی رائے میں ان کی سوانح نگاری ان کی جملہ اصناف پر غالب تھی۔ وہ جب کسی شخصیت کا تعارف کرانے کے لئے قلم اٹھاتے تھے تو پہلے خود اس میں گم ہو جاتے تھے اس کے بعد ان کے قلم کے ذریعہ جو شخصیت برآمد ہوتی تھی وہی اس کا اصل روپ ہوتا تھا وہ اس سلسلے میں افراط و تفریط کے قطعی قائل نہ تھے۔ راقم الحروف نے جب بھی ان کے شخصیاتی مضامین پڑھے خود کو صاحب مضمون کے ہمراہ وہم رکاب محسوس کیا میرے نزدیک یہی ان کا طرۂ امتیاز تھا اس سلسلے میں ان کے مضامین علامہ شبیر احمد عثمانی علامہ کشمیری، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، عطاء اللہ شاہ بخاری، جگر مرادآبادی، احسان دانش بطور ثبوت پیش کئے جا سکتے ہیں۔ علامہ کشمیری پر لکھے گئے مضمون کا یہ اقتباس تو آب زر سے لکھنے کے قابل ہے

"یہ بتانے کی بات نہیں کہ آب و ہوا کی خوشگواری، موسم کا اعتدال، مناظر کی رنگا رنگی، پھولوں اور میووں کے قسم قسم کے ذائقے صرف انسان کے ظاہری حسن و جمال ہی میں اضافہ نہیں کرتے اور صرف وہ انسان کی تندرستی و صحت جسمانی کے لئے ہی کارآمد نہیں بلکہ وہ صحت مند دماغ تندرست ذہن علمی مذاق رکھنے والی طبیعتیں، شاعرانہ مذاق اور صناعی و فنکاری کی صلاحیتوں کو پیدا کرنے، بڑھانے و نشو و نما دینے میں بھی پوری اعانت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کی سرزمین پر حسن فطرت کی آغوش میں علم و کمال نے آنکھ کھولی قدرتی چشموں کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پی کر شاعری اور ادب نے آغوں آغوں کرتے ہوئے صاف بولنا شروع کیا۔ بادصبا کے بار بار آتے ہوئے جھونکوں سے حکمت و دانائی کے لب بستہ غنچے کھل پڑے اور رنگ برنگ کے پھولوں، ننھی ننھی کلیوں، چھوٹے چھوٹے پودوں اور مہوشان سیم تن کی رگ جسم سے بھی زیادہ باریک شاخوں کی ہم نشینی سے ذکاوت و ذہانت نے جلا پائی"

(یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ ص...)

عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات پر لکھتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"صف اول کے لوگوں میں گاندھی جی اور جواہر لال تک میرے قریب سے گرج برس کر گزر گئے

لیکن میں نے ذاتی طور پر ان سے تعلق پیدا کرنے میں اپنا نقصان سمجھا۔ اور ان بزرگوں میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے میرا تعلق بہت قدیم، مستحکم اور نیاز مندانہ رہا ہے

(یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ ص۶۱)

ان سطور میں شاہ صاحب کی قلندرانہ زندگی کی جھلک محسوس کی جا سکتی ہے۔ حضرت جگر مرادآبادی جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کے قلم نے بایں انداز خراج عقیدت پیش کیا۔

"مجھے جگر صاحب سے عقیدت نہیں تھی جگر صاحب عقیدت کے قابل کوئی چیز بھی نہیں تھے یا یوں سمجھئے کہ میری زندگی اور میرے ذہن میں عقیدت کا کوئی خانہ ہی نہیں، مگر ہاں جگر صاحب سے ایک تعلق تھا ان کے مزاج کی آشفتہ سری اور ناہمواری کے باوجود ان سے محبت تھی ان کے وحشتناک چہرے اور بے تکے بالوں کے باوجود ان سے لگاؤ تھا اور کچھ ایسی محبت تھی جیسے محبت کرنے والوں کو اپنے کسی حسین اور خوش وضع اور خوبصورت محبوب سے ہوتی ہے ان کی غزل نظر پڑتی تو اسے دامن دل میں چھپاتا، کبھی ریڈیو پر ان کی آواز سنائی دیتی تو لپک کر اور دوڑ کر سنتا، وہ خود کہیں ملتے تو ان کے پاس سے جانے اور اٹھنے کو دل نہیں چاہتا، ان کا خط آتا تو ہفتوں اسے بار بار پڑھتا رہتا۔"

(یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ ص۸۰)

شاہ صاحب کے اس اقتباس سے جگر صاحب اپنی پوری آن بان اور شاعرانہ عظمت و رفعت کے ساتھ قاری کے سامنے آجاتے ہیں، جیسا کہ میں نے اوپر کہیں عرض کیا ہے کہ یہی ان کی سوانح نگاری کا وصف تھا۔

مجھے اس بات کا بیحد قلق ہے اور تاسف بھی کہ میں دیوبند میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے باوجود ان سے بہت کم مل سکا ہوں جبکہ ان کے برادر خورد ملک کے مشہور خطیب مولانا سید انظر شاہ صاحب (شیخ الحدیث دارالعلوم) سے دیوبند میں موجودگی کی صورت میں روزانہ رات گئے تک استفادہ کا موقع میسر رہا ہے۔ اور یہ سلسلہ اب بھی باقی ہے۔ لیکن جب کبھی بھی ان سے ملا، ایسا محسوس ہوا کہ وہ میرے اپنے ہیں۔ سراپا شفقت و محبت اور مجسم عجز و انکسار۔

ایک بار مرحوم نے ماہنامہ "دارالعلوم" دیوبند میں غالباً نومبر یا دسمبر ۱۹۸۰ء کے شمارے میں میرے تعلق سے ایک مختصر سا مضمون شائع کیا ضمناً جماعت اسلامی کو بھی ہدف بنایا۔ اس مضمون کا دیوبند میں خاصا ذکر رہا کچھ کو مستثنیٰ کر کے بالعموم لوگوں نے اسے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ان میں بعض وہ لوگ بھی تھے جو مجھ سے شدید قسم کا جماعتی اختلاف رکھتے ہیں۔ مجھے اپنی رسوائی کا تو کوئی خیال نہ تھا البتہ جماعت اسلامی کی ہوا خیزی سے دل سخت ملول تھا۔

ایک بار ایک مہمان کو دارالعلوم دیکھنے کا شوق ہوا دارالعلوم کی سیر کرانے کے بعد سوچا کہ شاہ صاحب سے ملاقات کرادوں۔ دولت خانہ پر گیا، دستک دی، اندر ہی سے آواز آئی، کون صاحب ہیں؟۔ عرض کیا تابش۔ فوراً باہر تشریف لائے۔ بڑے تپاک سے ملے، اوپر والی بیٹھک میں لے گئے، نہایت شفقت و محبت کے ساتھ بٹھایا،

خیریت پوچھی، میں نے مہمان موصوف کا تعارف کرایا۔

خود ہی فرمانے لگے میاں! مجھے .... نے خبر دی تھی اسی بنیاد پر میں نے مضمون لکھ دیا تھا، بعد میں تحقیق ہوئی کہ وہ تمہارے سخت بدخواہوں میں سے ہیں اور یہ سب باتیں ان کی خود کی تصنیف کردہ ہیں۔ بیحد افسوس ہوا میں اس سلسلے میں خود تم سے ملنا چاہتا تھا" بھائی معاف کردو"۔ میں نے عرض کیا شاہ صاحب میں نے اسی وقت معاف کر دیا تھا جس وقت شمارہ میرے مطالعہ میں آیا تھا — بہت خوش ہوئے کافی دیر تک تحسین آمیز دعاؤں سے نوازتے رہے پھر سننے سنانے کا دور چل پڑا۔ میرا یہ شعر سنکر پھڑک اُٹھے ؎

شہر والوں نے حقارت سے جسے ٹھکرا دیا
اک وہی مومن تھا سارے کافروں کے شہر میں

اور جب یہ دو شعر پڑھے تو جھوم جھوم اٹھے

داد کے قابل ہے میرا حوصلہ اے دوستو
لے کے مشعل پھر رہا ہوں آندھیوں کے شہر میں

لے کے پتھر آ گیا سارا زمانہ میری سمت
نام جب تیرا لیا میں نے بتوں کے شہر میں

اور جب میں نے یہ شعر پڑھا کہ

اب اچھالی جا رہی ہیں واعظوں کی پگڑیاں
جہل بھی ہے پانی پانی عالموں کے شہر میں

تو میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں!

ان دنوں قضیۂ دارالعلوم شباب پر تھا، علماء و اساتذہ حدیث کی خانگی زندگیوں کو منظر عام پر لایا جا رہا تھا سب تو سب "حکیم الاسلام" اور "فخر الاماثل" کے لقب سے یاد کئے جانے والے اپنے عہد کے معتبر ترین عالم دین، نمونۂ اسلاف اور بے ریا بزرگ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی بھی پگڑی محفوظ نہ رہ سکی نہ پوچھئے کیسے کیسے الزامات ان پر تراشے گئے، شاید حفیظ میرٹھی نے اسی موقع کے لئے کہا تھا کہ ؎

معصوموں پر آئے ہیں
کیسے کیسے الزامات

آپ یقین کیجئے کہ حضرت قاری طیب صاحب کے خلاف جب میں نے کوئی پوسٹر، کتابچہ دیکھا یا تقریر سنی تو میرے دوست طاہر تلہری کا یہ شعر مجھے ضرور یاد آیا کہ

؎ فرشتے کھائیں قسم جس کی پاکبازی کی
وہ تیرے شہر میں رسوا دکھائی دیتا ہے

غالباً میرے اس شعر پر شاہ صاحب کے سامنے بھی یہی سب مناظر آگئے ہوں گے اور ان کا حساس و درد مند دل تڑپ اٹھا ہوگا

پوری غزل سننے کے بعد فرمایا بھئی یہ غزل لکھ کر دیدینا نسیم میاں اشاعت حق میں شائع کر دینگے۔ اسکے بعد ہم لوگوں نے چائے پی اور رخصت ہو گئے۔ اکتوبر ۱۹۸۵ء کی کسی تاریخ کو مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی کی مجلس میں تشریف لائے ایک نوجوان ان کو سہارا دئے ہوئے تھے حکیم عزیز الرحمٰن صاحب اعظمی مولانا محمد حسین صاحب بہاری بھی ہمراہ تھے بیٹھا نہیں گیا تو وہیں مجلس ہی میں لیٹ گئے، ایک ایک کر کے سب سے خیریت پوچھی یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔

میں پاکستان گیا ہوا تھا ایک روز معروف اسلامی ادیب و سیرت نگار جناب نعیم صدیقی نے اطلاع دی کہ انھیں کسی اخبار کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ ماہنامہ دارالعلوم کے سابق ایڈیٹر جناب ازہر شاہ قیصر انتقال فرما گئے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور کچھ دیر تک سوچوں کی وادی میں بھٹکتا رہا۔ ان کی ایک ایک ملاقات اور اس ملاقات کی ایک ایک بات صفحۂ ذہن پر ابھرنے لگی اور پھر زبان پر بیساختہ یہ شعر آگیا کہ ؎

کل تو کہتے تھے کہ ہم بستر سے اٹھ سکتے نہیں
آج دنیا سے چلے جانے کی طاقت آ گئی۔

چند نئی لائق مطالعہ اور مفید کتابیں
حدیث الروح :- تالیف مولانا بدر الحسن قاسمی
مختصر مختصر عربی مضامین کا مجموعہ جو بہار مدارس اسلامیہ بورڈ میں داخل نصاب بھی ہے۔ عربی داں اور عربی سیکھنے والوں کے لئے یکساں طور پر مفید اور مشکل الفاظ کا اردو ترجمہ بھی شامل کر کے کتاب کو سہل بنادیا گیا ہے فوٹو آفسیٹ کی عمدہ طباعت
قیمت ../6
الخطب العربیہ :-
تالیف مولانا محمد اسلام قاسمی
ہندو پاک میں پہلی کتاب جس کی مدد سے آپ عربی میں تقریر کرنیکی صلاحیت حاصل کرسکتے ہیں۔ مختلف دینی، اصلاحی، اخلاقی، اور معاشرتی تقریروں پر مشتمل۔ یہ کتاب خاص خاص طور پر عربی مدارس اور عربی کے طلبہ کے لئے لکھی گئی ہے۔ اعلیٰ ترین کتابت و طباعت اور خوبصورت ٹائیٹل سے آراستہ۔ قیمت ../15
اسالیب الانشاء :-
معلم الانشاء
آپ عربی میں مضمون نگاری کیسے کریں؟ اس کتاب میں تمام اصول و ضوابط اور مختلف عنوانات پر لکھے گئے مضامین شامل ہیں۔ مصر کے چند نامور علماء کی تالیف "معلم الانشاء" معمولی تلخیص کے ساتھ۔ جو دار العلوم دیوبند کے علاوہ دوسرے مدارس میں بھی داخل نصاب ہے۔ یہ کتاب نایاب تھی طویل عرصہ کے بعد اس کی طباعت ہوئی ہے۔ قیمت ../۱۵
مختصر تاریخ اسلام
تالیف :- مولانا غلام رسول مہر
مورخ اسلام مولانا غلام رسول مہر کی مشہور تالیف جسمیں قبل از بعثت نبوی تا خلافت عثمانیہ مکمل تاریخ اسلام موجود ہے۔ مختصر انداز میں اس سے زیادہ معتمد اور وقیع تاریخ اسلام مرتب نہیں ہوئی اپنی بہت سی خصوصیات کے ساتھ پہلی بار ہندوستان میں شائع ہوئی ہے قیمت حصہ اول ../۱۰
" " دوم ../۱۰
مقالات حکیم الاسلام رح
حضرت مولانا قاری محمد طیب رح مہتمم دار العلوم دیوبند کے مضامین گرانقدر کا مجموعہ۔ دنیائے اسلام کی مشہور اور محترم شخصیت جنکی دینی خدمات کا اعتراف پوری دنیا نے کیا جنکی تقریر سے لاکھوں افراد مستفید ہوئے اور جنکی تحریر سے برصغیر ہند کا ہر صاحب علم مستفیض ہونا باعث فخر سمجھتا ہے۔
قرآنی علوم و حکمت اور اسلامی تہذیبی اقدار پر مدلل انداز میں تحریر کرنا حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا امتیازی وصف رہا ہے۔ حکمتوں اور نکتہ آفرینیوں سے معمور تحریریں جو قارئین کی نظروں سے نہیں گذریں پہلی بار اسکو مرتب کر کے پیش کیا جارہا ہے صرف ان ہی مضامین جو غیر مطبوعہ ہیں یا جو کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئے
ہر طالب علم کی ضرورت، ہر لائبریری کی زینت، ہر مسلمان کیلئے بیش قیمت دستاویز
ناشر:- دار الثقافۃ دیوبند یوپی ۲۴۷۵۵۴

ستمبر اکتوبر نومبر ۱۹۸۶ء
شاہ نمبر
ماہنامہ طیب دیوبند
مکتبۃ الایمان کی اہم مطبوعات
سنت یا بدعت :- شرک و بدعت اور جہالت و گمراہی کے رد میں مولانا ماہر القادری کے بلند پایہ مضامین
کا حسین مجموعہ۔ ترتیب و تعارف تابش مہدی۔ کتابت و طباعت عمدہ قیمت ۱۰/۰۰
تحریک اسلامی کے مایہ ناز محقق مولانا عبدالباری ایم اے کے قلم سے کعبۃ اللہ
توحید کا پہلا مرکز :- غلاف کعبہ اور بوسۂ حجر اسود کی ایک دستاویزی تاریخ۔ آفسیٹ کی معیاری
طباعت و کتابت۔ قیمت ۳/=
ڈاکٹر سید انور علی کے قلم سے مسلم پرسنل لاء کے موضوع پر ایک فیصلہ کن کتاب "مسلم پرسنل لاء
سپریم کورٹ اور مسلمان" آفسیٹ کی معیاری طباعت، روشن کتابت اور حسین گیٹ اپ
قیمت صرف ۷/۰۰
صوفیاء اور ان کے افکار :- کتاب و سنت کی روشنی میں مروجہ عجمی تصوف کے رد میں
دنیائے عرب کے معروف محقق علامہ عبدالرحمن عبدالخالق یوسف کی بلند پایہ کتاب
مترجم :- شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد صادق خلیل۔
آفسیٹ کی معیاری کتابت و طباعت۔ قیمت ۱۰/ روپیہ
تذکرۃ الصحابہ رضؓ :- پاکستان کے ممتاز اہل قلم علامہ سید طالب ہاشمی کے
قلم کا عظیم شاہکار قیمت فی قسط ۱۰/ روپیہ
قیمت جلد اول (چار قسطیں) ۴۰/۰۰ روپیہ
ملنے کا پتہ
مکتبۃ الایمان دیوبند ۲۴۷۵۵۴
یوپی
۱۴۷

ستمبر اکتوبر نومبر ۱۹۸۱ء
شمارہ نمبر ۱
ماہنامہ طیب دیوبند
مآثرِ حکیم الامّت
ارشادات وافادات حضرت عارف باللہ ڈاکٹر عبدالحئی عارفی نوراللہ مرقدہ
خلیفہ مجاز حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
(۱) ایک ایسا خزانہ جس کی قدر وقیمت کا پتہ مطالعہ کے بعد ہوتا ہے۔
(۲) ایسے وقت پر کام آنے والی کتاب جبکہ بہت سے رہبر بھی کام نہ آسکیں۔
(۳) یہ تذکرہ ہے حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے مزاج، شانِ تربیت اور اندازِ زندگانی کا۔
(۴) اس میں انتخاب ہے حکیم الامت رح کے ان ملفوظات کا جس کی نظیر کتب تصوف میں کم ملے گی۔
(۵) ایک ایسی تصنیف جس کے مطالعہ سے دین کا راستہ آسان اور دلکش نظر آنے لگے۔
(۶) جس کو پڑھ کر نیکی کی امنگ، طاعات کا شوق اور اتباع سنت کا ولولہ بیدار ہوگا۔
اور ایک معرکۃ الآراء رسالہ "افاداتِ عارفیہ" بھی شامل کتاب کرکے اسکی افادیت میں چار چاند لگادئے گئے ہیں
ستمبر کے پہلے ہفتہ میں طبع ہوکر آرہی ہے آج ہی ایک کارڈ لکھ کر اپنا آرڈر بک کرائیے ——!
مآثر حکیم الامت کی پیش کش کے بعد
عارف باللہ ڈاکٹر عبدالحئی عارفی نوراللہ مرقدہ کی تصوف پر ایک اور معرکۃ الآراء کتاب
بصائرِ حکیم الامّت
قسطوار پروگرام
اس کتاب میں موصوف نے اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رح کی تعلیمات پر مبنی حقیقت تصوف وسلوک اور اسکے متعلق ازالۂ اوہام وشکوک کی نہایت تفصیل کے ساتھ قابل قدر وضاحت فرمائی ہے مسائل طریقت کا کوئی گوشہ ایسا نہیں بچا جس پر سیر حاصل بحث نہ کی گئی ہو، تمام روحانی معارف وحقائق اوران کے نازک دقیق نکات کی بڑی دلنشین انداز میں عقدہ کشائی کی گئی ہے، الغرض یہ کتاب تہذیب اخلاق وتزکیہ نفس اور وصول مع اللہ کا ایک بے نظیر خزینہ اور آئینہ ہے، خاص طور پر سالکانِ راہ طریقت کے لئے تو یہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔
ادارہ "دینی کتاب گھر" اس کو قسطوار پروگرام کے تحت شائع کررہا ہے آج ہی اس کے لئے صرف ایک خط لکھ کر ممبر بنیئے اور کارکنان ادارہ کی حوصلہ افزائی فرمایئے۔ ممبری فیس کوئی نہیں۔ ممبران کو ہر دو ماہ بعد مبلغ ۱۵ روپے کی وی پی روانہ کی جائے گی۔ ڈاک خرچ بذمہ ادارہ
دینی کتاب گھر دیوبند (یو۔پی)
۲۴۷۵۵۴
۱۴۹

اگست ۱۹۴۷ء کے انقلاب
کے بعد عام مسلمانوں میں جو احساس کمتری پیدا ہوگیا تھا وہ دن بدن بڑھتا جارہا ہے۔ گو اس میں بہت بڑا
ہاتھ ارباب حکومت کے رویہ اور طرز عمل کا ہے لیکن مسلمان نوجوانوں کو سوچنا چاہئے کہ ملک کے اسی ماحول میں
انہیں زندگی گذارنی اور اپنا مستقبل روشن کرنا ہے ۔ مایوسی موت ہے۔ خوشگوار حالات میں مستقبل
شاندار بنانا کوئی چیز نہیں، بہادری اور جرأت سے کام لیکر مخالف ماحول میں زندہ رہنا اور
اپنا مستقبل شاندار بنانا البتہ ایک تاریخی چیز ہے۔
یہ سوچ کر کہ یہاں ہماری آبادی بہت مختصر، ہمارے وسائل و ذرائع محدود اور ہمیں
کوئی طاقت حاصل نہیں ہمت ہار دینا بزدلی ہے، اور یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ بزدل قوم کبھی ترقی نہیں کرتی۔
کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ مسلمان جب اس وقت سے بھی بہت کم یہاں بستے تھے، پورے ملک پر ان کی
حکومت تھی ان کا جاہ و جلال تھا اور یہ جہاں جاتے تھے کامیابی ان کے قدم چومتی تھی۔

اس ملک میں مسلمان سب سے زیادہ
مفلس، بیکار اور ناکارہ بنتے جارہے ہیں۔ یہ
درست ہے کہ حکومت مسلمانوں کو سہارا نہیں دیتی۔ لیکن کیا
افلاس و بیکاری ہونے کی صورت صرف ایک ہی ہے۔ مسلمان
تعلیم یافتہ اور سمجھدار طبقہ کا فرض ہے کہ وہ مسلمانوں میں محنت
و جفاکشی کی اسپرٹ پیدا کریں۔ صنعت و حرفت میں محنت کے
نتائج بتائیں، تجارت و سوداگری کی برکت ذہن نشین کریں۔
تاکہ مسلمانوں کا نوجوان طبقہ مالی اعتبار سے ترقی کرسکے اور اس
کی بیکاری دور ہو۔

مولانا سید محمد انظر شاہ قیصر

منظوم
خراج عقیدت

سید محمد ازہر شاہ قیصر کا پیغام

جوان سال زادگانِ توحید کے نام

از :- علامہ انور صابری مرحوم

مندرجہ ذیل نظم علامہ انور صابری مرحوم نے اخبار "صداقت" سہارنپور کے خاص نمبر مضامین قیصر کیلئے کہی تھی جو صداقت کے صفحۂ اوّل پر شائع ہوئی ۔ ہم صابری صاحب مرحوم کی یہ نظم اور اس نمبر میں شامل شامل صابری صاحب کا مضمون ایک یادگار کی حیثیت سے شائع کر رہے ہیں. یاد رہے کہ اخبار صداقت سہارنپور اپنے دور کا مشہور اخبار تھا جس نے آج سے ۴۶ سال قبل "مضامین قیصر نمبر" شائع کر کے مولانا سید ازہر شاہ قیصر مرحوم کی ادبی وصحافتی خدمات کا بھرپور اعتراف کیا تھا ! (مدیر)

رموزِ حکمتِ قرآن سے آشنا ہو جا ۔۔۔ حدیثِ سرورِ عالم کا آئینہ ہو جا

ترا شباب نمونہ بنے جہاں کیلئے ۔۔۔ حضورِ خواجۂ کونین پر فدا ہو جا

سنبھال ہاتھ میں ہر غم نصیب کا دامن ۔۔۔ ستم رسیدۂ گردوں کا آسرا ہو جا

رہے گی تیری پریشان خاطری تا کے ۔۔۔ جو ہو سکے تو زمانہ کا رہنما ہو جا

تری خدا کے تخیل میں کب غلامی تھی ۔۔۔ غلامِ غیر نہ بن غیر سے جدا ہو جا

چراغِ ملتِ بیضا جلا کے سینے میں ۔۔۔ نقاب سوزِ رُخِ بزمِ ماسوا ہو جا

جو آرزوئے بقائے دوام ہے انور

محمد عربی کے لئے فنا ہو جا

فغانِ درویش

حضرت غازیؔ سکروڈھوی

ابنِ انور حضرت مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر کاشمیری کے سانحۂ ارتحال سے متاثر ہوکر

جو آشنا تھا. خلوص و وفا کی راہوں سے
وہ ابن انور رح بھی اوجھل ہوا نگاہوں سے

وہ ایک نور کا پیکر، وہ ایک موجِ خرام
خدا نصیب کرے، اس کو اب سکونِ دوام

تمام عمر رہا. رُوبرو، جو باطل سے
وہ ایک مردِ قلندر اٹھا ہے محفل سے

دبا سکی نہ کبھی جس کو گردشِ ایام
دیا ہے مدتوں "دارالعلوم" کا پیغام

نہ پوچھیئے کہ طبیعت پہ اس کے کیا گذرا
عجیب مادرِ علمی پہ حادثا گذرا

نہ جانے کتنے ادیبوں کا یار غار تھا وہ
گذشتہ خاک نشینوں کی یادگار تھا وہ

وہ اک، ادیب وصحافی وخوش بیاں بھی تھا
وہ نکتہ چیں بھی، مدبر بھی، نکتہ داں بھی تھا

ہر ایک رہ کی مسافر تھی اس کی طبع رسا
وہ قاسمی رح بھی، رشیدی رح بھی، انوری رح بھی تھا

تھی یاد کتنے بزرگوں کی داستاں اس کو
بہت عزیز تھی، بس "یادِ رفتگاں" اس کو

وہ لے کے حق وصداقت کی آبرو پہنچا
حضورِ سرورِ کونین سُرخرو پہنچا

ابن الانور سید محمد ازہر شاہ قیصرؒ کی نذر

مولانا کفیل الرحمٰن نشاط

زیورِ حسنِ صحافت سے مزین خوش نگار
کشورِ تحریر کا وہ صاحبِ صد اقتدار
جس کی تحریروں میں رقصاں تھی بہارِ زندگی
جس کے لفظوں میں رواں تھا آبشارِ زندگی
تلخیوں کو قند سمجھا اور ازہر ہی رہا
جو گلستانِ ادب کا بن کے قیصر ہی رہا
وسعتِ فکر و نظر جس کی مسلم ہی رہی
شخصیت جس کی ادیبوں میں مکرم ہی رہی
جس کو سرمایہ ذہانت کا وراثت میں ملا
جس کو اک حصہ سلاست کا صحافت میں ملا
جس کا اندازِ نگارش منفرد مانا گیا
حسن نکھرا اسقدر جتنا اسے چھانا گیا
نازشِ اہلِ صحافت آہ رخصت ہو گیا
پیکرِ وصفِ شرافت آہ رخصت ہو گیا

قطعات تعزیت مولانا سید ازہر شاہ قیصرؒ

سلطان احمد صدیقی ایڈوکیٹ
ایم اے ایل ایل بی میگ

(۱)

آہ ازہر کا انتقال ہوا
رنج بے حد ہوا ملال ہوا
شاہ انور کے آفتاب تھے وہ
اٹھ گئے وہ بڑا زوال ہوا

(۲)

گیارہویں ماہ کی تھی ستائیس
شام کا وقت سن پچاسی تھا
شاہ قیصر کے ساتھ ہی سلطاں
اک صحافت کا دور ختم ہوا

(۳)

دوستو ملک کا وقار گیا
ایک اردو کا جاں نثار گیا
نام قیصر کا مٹ نہیں سکتا
چھوڑ کر ایسے شاہکار گیا

(۴)

اٹھ گئی علم و ادب کی برتری
غمزدہ ہے خاندانِ انوری
حضرت علامہ ازہر اب نہیں
جن کی تھی اردو ادب میں قیصری

بروفات حسرت آیات حضرت مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم

انجم فلک، مبارک اجمیری

کیوں چیخ کے بے ساختہ ارباب سخن روئے
کیوں آج ہمارے مہتاب سخن رو ئے
ڈیکٹس کیوں ابھی رو گئے اصحاب سخن مجھے
قرباں بہت رو لئے احباب سخن روئے

ہم تو نہ کبھی روئے لیکن کیوں ابھی روئے
ازہر شاہ قیصر کی فرقت میں سبھی روئے

عالم تھا قلم والا استادِ سخنور تھا
ایثار کا بندہ تھا خوش کام کا رہبر تھا
لینے کا نہیں عاشق دینے میں تونگر تھا
عرفان کے فلک کا وہ اک ماہ منور تھا

تھا روحِ غزل قیصر، تھا روئے سخن قیصر
گلزارِ ادب کا تھا بس شاہ چمن قیصر

تم غم نہ کرو ہمدم اک روز قیامت ہے
دیدار وہاں ہوگا یہ بات حقیقت ہے
گر اس سے محبت ہے، ایمان سلامت ہے
پڑھنا فاتحہ اس پر یہ غیبی ہدایت ہے

ہے زیر زمیں راحت، ازہر شاہ قیصر کو
اے میگ خدا بخشے تسکین مہ و اختر کو

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصرؒ

(قاری) محمد اسحاق حافظ سہارنپوری

ہر طرف شورِ قیامت ہوگیا — کون اس دنیا سے رخصت ہوگیا
حادثوں کی یورشیں ہیں کسقدر — اُف، مرا جینا قیامت ہوگیا
جس کا دنیا میں مُداوا ہی نہیں — درد وہ مجھ کو ودیعت ہوگیا
آسمانِ علم پر ہے تیرگی — نیّرِ تاباں جو رخصت ہوگیا
جو بڑا بیٹا تھا انور شاہؒ کا — وہ روانہ سوئے جنّت ہوگیا
سید ازہر شاہ قیصر بھی گئے — ختم اک دورِ صحافت ہوگیا

مرثیہ خوانی کو حافظ رہ گئے
قافلہ یاروں کا رخصت ہوگیا

دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہوگیا؟

دل رہینِ گردشِ دوراں ہوا — رنج و غم کا ہر طرف ساماں ہوا
آہ حافظ کیسے گل توڑے گئے — گلشنِ علم و ادب ویراں ہوا

حادثوں کا حشر برپا ہوگیا — دل کی دنیا میں اندھیرا ہوگیا
نازشؔ[1] و انورؔ[2] گئے قیصرؔ[3] گئے — دیکھتے ہی دیکھتے، کیا ہوگیا

(حضرت رفعت نغمۂ وطن انبالوی)

[1] شاعر قوم و وطن نازش پرتابگڈھی [2] شاعر انقلاب علامہ انور صابری دیوبندی [3] رئیس القلم مولانا سید ازہر شاہ قیصر کاشمیریؒ

خراجِ عقیدت

وصی محمد

۱

مرے پیر کا پیرہن صندلی ہے
زباں صندلی ہے سخن صندلی ہے

چلے تو محبت کے نغمے سنائے
رکے تو حلیمی کے نغمے سنائے

کوئی ملنے آیا تو آنکھیں بچھا دیں
ہُوا کوئی دشمن تو نظریں ہٹالیں

زباں صندلی بانکپن صندلی ہے
مرے پیر کا پیرہن صندلی ہے

جہاں تک بھی دیکھوں وصی دیکھتا ہوں
جہاں تک بھی سوچوں وصی سوچتا ہوں

وہ پردہ بھی کرتے ہیں پائندہ ابتک
نظر آرہے ہیں وہ تابندہ ابتک

ردا صندلی تھی کفن صندلی ہے
خدا کی قسم کل بدن صندلی ہے

مرے پیر کا پیرہن صندلی ہے
مرے پیر کا پیرہن صندلی ہے

۲

محسنِ ادب

سعید میرٹھی

دین و ایمان کا وہ شفیق کہاں
اب وہ ایقان کا رفیق کہاں

جس نے سینچا تھا گلشنِ اسلام
آج وہ از ہر لئیق کہاں

ہر طرف باطلوں کا جمگھٹ ہے
ہائے وہ زاہد و عتیق کہاں

وہ کہ عاشق تھا سادہ لفظوں کا
نوجہ بھی اس لئے دقیق کہاں

آج ہم مرثیہ لکھیں گے سعید
شعر پہلے سے اب عمیق کہاں

شہزادۂ انور

وقار مانوی

یہ سوئے عدم کون چلا دارِ فنا سے
یہ سوگ ہے کس کا کہ بچھی ہے صفِ ماتم
اے اہلِ جہاں رنج کرو رنج کہ گذرا
وہ سید ازہر جو تھے معروف بہ قیصر
ہاں جن کو صحافت پہ تھی قدرت وہ صحافی
جو نصف صدی تک رہا مصروف نگارش
صد حیف کہ وہ دے گیا اب داغِ جدائی
دنیا ہے، یہاں کوئی رہا نہ رہے گا
لاریب کہ دنیا کی ہر اک چیز ہے فانی
مشکل ہے مگر صاحبِ تخلیق کا مٹنا
دن کاٹنے دشوار ہیں گرچہ ترے غم کے

یہ کون اٹھا انجمنِ صدق و صفا سے
یہ کس کا ہے غم جس سے ہر اک آنکھ ہے پُرنم
اک عالمِ دیں ایک صحافی زمانہ
وہ لختِ جگر ہاں وہی شہزادۂ انور
نازاں رہی خود جس پہ صحافت وہ صحافی
کرتے رہے اربابِ قلم جس کی ستائش
یہ حکمِ مشیّت تھا تو دیں کس کی دُہائی
پیدا جو ہوا اس کو ہے ناپید بھی ہونا
کہتے ہیں اجل جس کو وہ ہے دشمنِ جانی
تخلیق کے آئینے میں رہتا ہے وہ زندہ
لیکن یہ کہے کون مسافر ہے عدم کے

اب ہم تری بخشش کی دعا کرتے رہیں گے
حق اپنے تعلق کا ادا کرتے رہیں گے

ادیبِ بے مثال

کاوش امیٹھی

عالمِ دین تھے ازہر شاہ آپ کو کچھ ہے خبر
وہ تھے انور شاہ کے دل بند اور نورِ نظر
تھا ادب اور شعر پر ان کو عبور بے مثال
کوئی بھی ان سا نہیں بس بات یہ ہے مختصر
یوں تو عالم اور بھی ہیں دین میں ظاہر مگر
تھے مگر سب سے جدا سب سے الگ رہتے ازہر
غلغلہ ہے نام کا دنیا میں ان کے چار سو
شاعرِ خوش فکر تھے لکھتے تھے وہ اچھی نثر
سارے عالم تھے ستارے لیکن ان کو فخر تھا
عالمانِ دین کے جھرمٹ میں تھے مثلِ قمر

وہ روح پاک پہ قربان میری سو سو جان
زہے نصیب کہ اللہ کے بنے مہمان
حضورِ قدس میں جاتے ہی مرحبا کی پکار
زالی شان سے خوش آمدید کی بھرمار
جہاں بہار ہے فردوس کے نظارے ہیں
ہر ایک عیش کے سامان سب سجائے ہیں
تمام عمر ہی دینِ خدا میں ڈھالی گئی
قلم کی نوک سے کونین کو دکھائی گئی
وہ پاک روح کو جس وقت وہاں بلائی گئی
بڑے ہی ناز سے فردوس کو سجائی گئی
بچھادو مسندِ زریں کو حور و غلماں تم
لباسِ قدسی سے از ہرؔ کو اب سجاؤ تم
کرو تم حسن دوبالا ثیابِ سندس سے
کوئی حسین زیادہ نہ ہو یہاں اس سے
مقام ایسا، ملائک بھی رشک کرتے ہیں
پیمبروں کے قدم بھی جہاں ٹھہرتے ہیں
نبی کے لاڈلے یہ ہمارے مہماں ہیں
یہ نورِ چشم ہیں انورؔ کے پیارے ذی شاں ہیں

صاحبِ لوح و قلم رخصت ہوا

وصف الرحمٰن واصف نظامی طاہر پوری

دے کے اپنا رنج و غم رخصت ہوا
صاحبِ لوح و قلم رخصت ہوا
خوب مہکا کر جریدہ علم کا
خود سوئے باغِ ارم رخصت ہوا

نورِ نگاہِ حضرت علامۂ انورؔ
توقیرِ ادب بحرِ معانی کا شناور
تاریخ میں تحقیق میں یکتا و یگانہ
رخصت ہوا اک مملکتِ علم کا قیصر

خدمتِ علم و ادب جس کا شعار
جس کو دار العلوم سے بیحد تھا پیار
چل بسا ہے آہ اے واصفؔ وہ آج
خاندانِ قاسمی کا جاں نثار

یادِ ازہرؔ

سیف الدین سیف عثمانی

یاد لو، ہر سو لحد پر پھول کی برسات ہو
اور شبنم بھی مہکتی ساری ساری رات ہو
وردِ مرغانِ چمن تم کر لو خوش الحان سے
مغفرت ازہرؔ کی مانگو مالکِ سبحان سے

عظیم سانحہ

خان عبدالغفار خاں صاحب دیوبند

کیا خبر تھی یہ سانحہ ہوگا
ہم سے محسن کوئی جدا ہوگا

تھم سکے نہ ہمارے جب آنسو
اہل خانہ کا حشر کیا ہوگا

وہ تھے ہر دل عزیز زندہ دل
سن کے ہر شخص رو پڑا ہوگا

موت کا وقت تو معین ہے
صدمہ کوئی مگر پڑا ہوگا

وہ مٹانے سے مٹ نہ پائے گا
جو بھی تقدیر میں لکھا ہوگا

دشت و کوچہ ہو یا کہ صحن چمن
ذکر ماتم نہ کس جگہ ہوگا

تشنگانِ علوم تھے سیراب
دریائے علم ہی رہا ہوگا

بات کہتے جو برملا کہتے
کیا جگر کیسا حوصلہ ہوگا

زیر تکمیل ہیں جو تصنیفات
ان پہ کس کا قلم اٹھا ہوگا

زندہ رکھتی ہیں نام تحریریں
یہ کتابوں میں بھی پڑھا ہوگا

انکساری خلوص صبر و رضا
ہر عمل ان کا رہ نما ہوگا

ان کے اوصاف کی حدود کہاں
ان کا ہمسر نہ دوسرا ہوگا

زخم یادوں کے تب ہرے ہوں گے
جب بھی حضرت کا تذکرہ ہوگا

وہ کہ مظلوم یا کہ ظالم تھے
روبرو حق کے فیصلہ ہوگا

ہوگئے درجے بلند جنت میں
پڑھ کے قرآن بخشنا ہوگا

صبر ہم کو، انھیں تو جنت دے
خود تو ہی صبر کی جزا ہوگا

جولیئس نحیف دہلوی

(۱)

تو آج کہاں پر ہے، سید ازہر شاہ قیصر
خاموش ہر اک در ہے، سید ازہر شاہ قیصر
یہ اردو ادب تجھ کو بھولے گا بھلا کیسے
ہر آنکھ یہاں تر ہے، سید ازہر شاہ قیصر

(۲)

تم صاحبِ محفل تھے، سید ازہر شاہ قیصر
تم عالم و فاضل تھے، سید ازہر شاہ قیصر
نازاں تھے بہت تم پر انور شاہ کشمیری
وہ ہستیٔ کامل تھے، سید ازہر شاہ قیصر

(۳)

تم کتنے ہی شاداں تھے، سید ازہر شاہ قیصر
تم سب کیلئے جاں تھے، سید ازہر شاہ قیصر
جتنا بھی ہوا تم سے ہر اک کو نوازا تھا
تم حاتمِ دوراں تھے، سید ازہر شاہ قیصر

مرثیہ

بر وفات مولانا سیّد ازہر شاہ قیصر علیہ الرحمۃ

اٹھے ازہر جو بزمِ عالم سے — اشک بہتے ہیں دیدۂ نم سے
یوں بھی جاتا ہے چھوڑ کر کوئی — ہو گیا کیا ہے کیا یہ اک دم سے
اس طرح اقربا فسردہ ہیں — خوں ٹپکتا ہے چشمِ پُرنم سے
نام لیوائے حالی و غالب — اُف جدا ہو گئے ہیں اب ہم سے
کیا ہوا اک چراغِ محفلِ گُل — پڑ گئے سب چراغ مدّھم سے
لوگ جیتے ہیں بعد مردن بھی — موت ڈرتی ہے ابنِ آدم سے
صبر کر فکر مرگِ ازہر پر — وہ نہ لوٹیں گے تیرے ماتم سے

فِکر میرٹھی

نوحۂ بروفات مولانا سید ازہر شاہ قیصر صاحب مرحوم

اک مفسر، اک محدث، اک مقرر بھی وہ تھا
خوش بیاں شاعر بھی تھا نامی مفکر بھی وہ تھا

وہ بڑا نقاد تھا عالم بھی تھا فاضل بھی تھا
تھا صحافی نامور ہر فن میں وہ کامل بھی تھا

وہ خطیبِ قوم تھا قائد بھی تھا لیڈر بھی تھا
اہلِ دل تھا جانشین حضرتِ انور بھی تھا

اس کے دم سے رونقیں ہر ایک کاشانے میں تھی
معرفت کی مے بھی اس کے جام و پیمانے میں تھی

پہلے جنت کو جناب حضرتِ انور گئے
پیچھے پیچھے آہ ان کے سید ازہر گئے

محفلِ علم و ادب کو آہ سونی کر گئے
نام ان کا زندہ ہے ظاہر میں دونوں مر گئے

خون کے آنسو نہ رو اے خانماں برباد تو
کر دعائے مغفرت اب راحتؔ ناشاد تو

راحت کوثر کیرانوی

جناب محمد عرفان شوق میرٹھی صاحب

اب نظر آتا نہیں ہے آپ کا نعم البدل

خود نکل آتے ہیں آنسو تذکرۂ موت پر
اہلِ دیں روتے ہیں سارے آج انکی موت پر

عصرِ حاضر میں نہیں تھا آپ کا ثانی کوئی
چل دئے ہیں شاہ ازہر دے کے درسِ آگہی

اب نظر آتا نہیں ہے آپ کا نعم البدل
اب نہیں کھلنے کے دنیا میں محبت کے کنول

شاہراہِ زیست پر ڈھونڈیں گی نظریں آپکو
یہ بھلا سکتی نہیں دنیا کی قدریں آپ کو

آج تک نظروں میں وہ ہے شوقؔ شامِ پُر الم
یوں سناتا پھر رہا ہوں سب کو میں قصۂ غم

بیادِ خلد آشیانی مولانا سیّد ازہر شاہ قیصرؒ

عبدالقادر کلیم (اندوری)

حال دل کو عیاں کیسے کرنا — ان کی عظمت بیاں کیسے کرنا

کوئی تدبیر اگر بتائے — یادِ ازہر نہاں کیسے کرنا

ان کے احسان علم وادب پر — ان کی خدمت بیاں کیسے کرنا

جس نے شعرِ سخن کو زباں دی — وہ ہی چپ ہے زباں کیسے کرنا

شمع مذہب کا جس کو لقب تھا — ہوگیا ہے نہاں کیسے کرنا

کی صحافت کی خدمت بھی برسوں — اس کی خوبی بیاں کیسے کرنا

دیوبند ہے کلیم ایسی ہستی
ہوگئی ہے نہاں کیسے کرنا

خراجِ عقیدت

بخدمت گرامی مولانا سیّد ازہر شاہ قیصر صاحب مرحوم

حیف! ازہر شاہ ملّت اب نہیں
قیصرِ ملکِ محبّت اب نہیں
آہ! وہ خضرِ طریقت اب نہیں
رہبرِ راہِ شریعت اب نہیں

★

متّقی و عابد و مصحف نگار
نیک کار و نیک سیرت ذی وقار
نازشِ ملت، وطن کا افتخار
راز اب ان سے کہاں عالی شعار

از راز لائل پوری ...... دہلی

حضرت مولانا سیّد ازہر شاہ قیصر مرحوم کی یاد میں منظوم خراجِ عقیدت

محمد انعام صدیقی کاندھلوی

نہ سکون ہے نہ قرار ہے نہ غم والم کی شمار ہے
یہ نظر جو آتا مزار ہے شاہ صاحب ہمیں سما گئے

تیرے مرنے کی خبر ہے آہ کیسی دل خراش
ہو گیا ہے جس کو سنکر دل ہمارا پاش پاش

تو تھا جادو بیاں اور تھا شیریں مقال
دارالعلوم کو بخشا ہے تو نے واقعی حسن و جمال

تحریر کے فن میں ماہر ہی نہیں کامل تھا تو
دین سے عشق تجھ کو دین پر مائل تھا تو

عمر بھر اردو کی خدمت میں رہا مصروف تو
اس کی خدمت ہی کے باعث تھا بہت معروف تو

تجھ سا جادو بیاں عہد نو میں کہاں سے لائیں گے
لاکھ ڈھونڈیں گے لیکن اب نہ تجھ کو پائیں گے

جانے والے تیری باتیں یاد جب بھی آئیں گی
خون کے آنسو ہمیں آٹھوں پہر رلوائیں گی

تیری رحلت سے ہوا ہے قوم کو بے حد زیاں
ہوگا پیدا ملک میں شاید ہی تجھ سا خوش بیاں

داغ فرقت کا ہمیں تو دے گیا
ساری خوشیاں تو ہماری لے گیا

گھر ترے جانے سے ویران ہو گیا
گھر کا گھر سارا پریشان ہو گیا

ہو گیا تو کس لئے ہم سے خفا
کچھ سبب اس کا ذرا ہم کو بتا

بخش دے ہم سے ہوئی ہے جو خطا
گھر کو آ جا لوٹ کر بہر خدا

آہ تجھ کو کھا گئی کس کی نظر
بیوی بچوں سے ہوا کیوں بے خبر

بیوی بچوں سے بتا روٹھا ہے کیوں
روٹھ کر گھر سے کہیں جاتے ہیں یوں

تیرے آنے کا ہے ان کو انتظار
چین شب کو ہے نہ ہے دن کو قرار

تیرے غم میں رات دن روتے ہیں یہ
اور اپنی جان کو کھوتے ہیں یہ

اور کھڑے آنسو بہاتے ہیں نسیم
غم کا پتلا ہیں اور سب ہیں سہیم

ہر طرف ہم سنتے ہیں آہ و بکا
اک قیامت ہو گئی گھر میں بپا

جب فضائیں گونج اٹھیں یہ میرا مرثیہ
آسماں سے یک بیک یہ آئی صدا

مر کے جو جاتے ہیں پھر آتے نہیں
اور کچھ وہاں کا حال بتلاتے نہیں

رونے والو رونا دھونا ہے فضول
اس سے ہوگا نہ تم کو کچھ حصول

صبر ہے اللہ کو بے حد عزیز
نیک و بد میں کیوں نہیں کرتے تمیز

سن کے یہ آواز غیبی نادم ہوا
دل کی آئی میرے سینے سے صدا

اب تو صبر کرنا ہی لازم ہے تمہیں
تاکہ دانا سب یہاں تم کو کہیں

دل سے کرتے ہیں دعا سب تیرے لئے
دائمی ٹھکانا ہو جنت میں تیرے لئے

کرتا ہے انعام دعائے مغفرت تیرے لئے
ابر رحمت سے گناہ دھل جائیں جو تجھ سے ہوئے

جنت المقام مولانا سید ازہر شاہ قیصر صاحب رح

مکتب دیوبند کے عالم — تو جہاں میں عظیم انساں تھا
تھا ادیب و سخنور بے مثل — واقف ہر حدیث قرآں تھا

شاعر و ناقد و مورخ بھی — تو تھا گویا ہمہ صفت موصوف
ہر صحیفہ و ہر جریدہ کی — تھا ادارت کا تجھ کو پورا وقوف

اے ادیب عزیز خاص و عام — ناظم و شاعر بلند مقام
یاد تیری ستاتی ہے ہر وقت — اک سکوں بخشتا ہے تیرا کلام

سالک جادۂ تصوف تھا — بے گماں مرد دیندار تھا تو
اے فقہ و حدیث کے عالم — باغ قرآں کی اک بہار تھا تو

تجھ کو دنیا سے اب غرض کیا ہے — باغ جنت میں ہے مقام ترا
ہم نے قیصر تری جدائی میں — کر لیا دل پہ کندہ نام ترا

نذرانۂ عقیدت

بسلسلہ مولانا محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم

جناب بیدل سرحدی

تجھ سا بیباک خامہ کار کوئی، نہ ہوا ہے نہ ہوگا آگے بھی
تجھ سا حق گو و حق شعار کوئی، نہ ہوا ہے نہ ہوگا آگے بھی

تجھ سا بے لوث کوئی خدمت گار، بے غرض کوئی بھی صحافت کار
نیک سیرت ہو اور نیکو کار، نہ ہوا ہے نہ ہوگا آگے بھی

بھول سکتی نہیں تری خدمات، بھول سکتے نہیں ترے جذبات
تجھ سا دنیا میں مرد نیک صفات، نہ ہوا ہے نہ ہوگا آگے بھی

سجدہ گاہوں میں تجھ سا ساجد ہو، دہر کے معبدوں میں عابد ہو
پارساؤں میں تجھ سا زاہد ہو، نہ ہوا ہے نہ ہوگا آگے بھی

تجھ سے سرسبز تھا وطن کا چمن، تجھ سے لہرا رہا تھا یہ گلشن
تجھ سا مخلص کوئی محب وطن، نہ ہوا ہے نہ ہوگا آگے بھی

خراجِ عقیدت

مولانا سیّد محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم

از: آر۔ ایل۔ بخشی ساحر امرتسری

۱

اے صحافت کے عالم و فاضل — سر فہرست نام ہے تیرا
تو نے پچاس سال خدمت کی — یاد دنیا کو کام ہے تیرا

۲

ایک دنیا کا غم بدوش تھا تو — اک قلم کار سر فروش تھا تو
صاحب فہم و عقل و ہوش تھا تو — خود صحافت کو ناز تھا تجھ پر

۳

تجھ کو کہتے تھے لوگ ازہر شاہ — ملک شعر و سخن کا شاہ تھا تو
تیری جانب رہی ہر اک کی نظر — بے گماں مرکزِ نگاہ تھا تو

۴

نازش و فخر دیوبند تھا تو — دیوبندی نثار تھے تجھ پر
مثل شہد و نبات و قند تھا تو — کتنی میٹھی زبان تھی تیری

بخدمت مولانا سیّد محمد ازہر شاہ قیصر

حسرتا! وہ عزیز خلق جہاں
ہائے وہ نیک کار عہد رواں
جن کو کہتے تھے سید ازہر شاہ
چشم دنیا سے ہو گئے ہیں نہاں

تھے وہ شاعر ادیب ماہر بھی
رکھتے تھے دل، نگاہ ناظر بھی
پڑھنے والوں کو کرتے تھے مسحور
وہ صحافی تھے اور ساحر بھی

خراجِ عقیدت

از
بخشی ساحر بخشی حسن شوق
دھلی امرتسری

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر

کا

انتقال پُر ملال

انور صابری

دل میں تھی حبِّ وطن جسکے مکیں
رہبرِ اردو ادب تھے بہتریں
"ایڈیٹر طیب" وطن کے ترجماں
اٹھ گئے دنیا سے اف قیصر وہ آج

★

سب کے دل میں بالیقیں قیصر جو تھے
سب کے دل میں جاگزیں قیصر جو تھے
وضع داری کے امیں قیصر جو تھے
اٹھ گئے دنیا سے اف قیصر وہ آج

★

پاکباز و پارسا قیصر جو تھے
خوش بیان و خوش ادا قیصر جو تھے
ایکتا سے آشنا قیصر جو تھے
اٹھ گئے دنیا سے اف قیصر وہ آج

★

غم میں ڈوبی آج ہے یہ سرزمیں
ہر بشر ہے صورت اندوہگیں
جو تھے اے گاندھی یہاں سب کے قریں
اٹھ گئے دنیا سے اف قیصر وہ آج

جناب پنڈت رام لال بسمل امرتسری

اظہارِ تعزیت
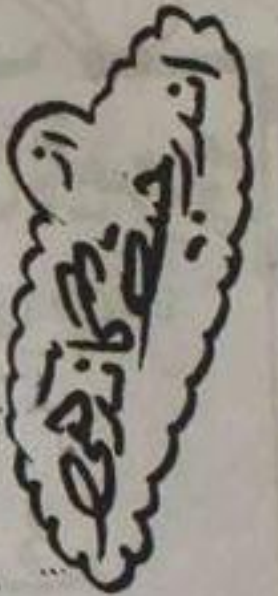
کس عزیز جہاں کا غم ہے آج
ایک عالم کی ہے زباں خاموش
شدتِ غم کہی نہیں جاتی
پیر خاموش ہیں جواں خاموش
افتخارِ صحافت ازہر شاہ
اہل دل کے ہیں ترجماں خاموش
کارواں کس طرح بڑھے آگے
ہوگیا میر کارواں خاموش
غم سے ارض و سما ہیں سکتے میں
یہ جہاں چپ ہے وہ جہاں خاموش
قیصر شعر چپ ہے اے بسمل
غم میں ہے بزم دوستاں خاموش

خراجِ عقیدت بخدمت مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم

ایڈون دوس واقف

خود دار و بے ریا تھے ، سید محمد ازہر
بے خوف راہنما تھے ، سید محمد ازہر

دکھیوں کا آسرا تھے ، سید محمد ازہر
اک مردِ باوفا تھے ، سید محمد ازہر

اردو زباں کے شیدا ، اردو زباں پہ ہردم
سو جان سے فدا تھے ، سید محمد ازہر

پابند دین و مذہب ، حق کی رضا پہ شاکر
اک مردِ پارسا تھے ، سید محمد ازہر

میرا بھی آپ سے تھا ، کچھ اُنس غائبانہ
میرے بھی آشنا تھے ، سید محمد ازہر

کی ساری عمر اردو ، علم و ادب کی خدمت
ہاں فرض آشنا تھے ، سید محمد ازہر

کیوں چل دیئے جہاں سے ، ایسی بھی کیا تھی عجلت
کس بات سے خفا تھے ، سید محمد ازہر

محشر میں ہونگے شافع ، ان کے رسولِ عربی
درِ پاک کے گدا تھے ، سید محمد ازہر

آئیں گے اب کہاں سے ، اُن ایسے لوگ واقف
بے مثل برملا تھے ، سید محمد ازہر

خراجِ عقیدت

بنام مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم

از پروفیسر بخشی اخترامر قسری ، دہلی ،

(۱)

قیصر مالکِ سخن خاموش شُد
حیف میرِ انجمن خاموش شُد
گلشن شعری بے از نغمات ہست
بلبل شیریں سخن خاموش شُد

(۲)

ازہر قیصر صحافت کار بود
در ادائے فرض خود ہشیار بود
فرض را بنجاہ سال انجام داد
مرد استقلال و خوش اطوار بود

(۳)

خوش کلام و خوش خیال و خوش شعار
در ریاضِ شعر ، اُو جانِ بہار
نازشِ اردو ادب ، فخرِ وطن
ملک و ملت را ازو حاصل وقار
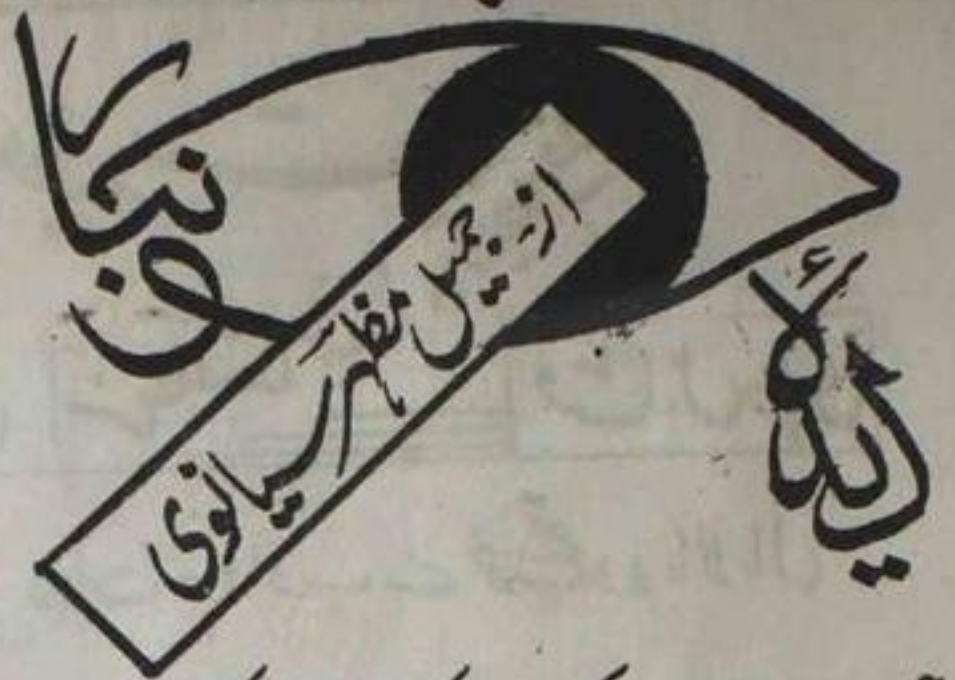
جس روز سے دیکھا ہے اک انوار فلک اور
ہونے لگی بات اور گذرنے لگا شک اور

شاعر ہو مجاہد ہو، مورخ ہو سخی ہو
یہ آئینے دھندلائیں تو آتی ہے چمک اور

ہو بات میں سچائی تو ہوتا ہے اثر بھی
گفتار میں شیریں ہو تو ہوتی ہے چٹک اور

آواز تری شاہ کی آواز لگے ہے
اب دل اسی انداز سے دھڑکے تو دھڑک اور

گذرے ہے نگاہوں سے جو قیصر کا صحیفہ
ہوتی ہے مرے زخم جدائی میں کسک اور

تھم جائیں گے آنسو تو بڑھے گا غم فرقت
اب دیدۂ خونبار چھلک اور چھلک اور

ہیں اور بھی دنیا میں صحافی بہت اچھے
ہے غالب و قیصر کی صحافت میں لچک اور

اب اوڑھ کے مایوسیاں سو جایئے مظہر
نکلے گی نہ رنگوں بھری اس جیسی دھنک اور

اٹھ گیا بزم جہاں سے اک فہیم
لے گیا دستِ اجل ظلِّ ندیم

شاہ قیصر دیوبندی کی وفات
قوم کا ہے ایک نقصان عظیم

رو رہا ہے گلستاں میں پھول پھول
چل رہی ہے غم زدہ بادِ نسیم

آہ ہم بھٹکے ہوئے، لوگوں کو اب
کون دکھلائے گا راہِ مستقیم

کون سمجھائے گا رمزِ زندگی
ہے کوئی اب شاہ قیصر سا حکیم

شاعر خوش فکر استادِ سخن
کوئی ہے قیصر کا ہم پلّہ علیم

ہو منصور شاہ کو جنت نصیب
صبر دے ہم کو خداوندِ کریم

خراجِ عقیدت

بحضور مولانا سید آزہر شاہ قیصر مرحوم

سلیکھ چند جین　　　　قابل دہلوی

بانیِ "طیب" تھے ازہر شاہ قیصر خوش خصال　　　　دولتِ علم و ادب سے خوب تھے وہ مالا مال

کاوشوں سے اپنی طیب کو بنایا باکمال　　　　علمی و دینی مضامیں کا صحیفہ بے مثال

قدرداں اس کے ہوئے اہلِ نسب اں اہلِ نظر

بات کچھ تو اس میں تھی مقبول تھا جو اس قدر

سینے میں ازہر کے تھا دریائے الفت موجزن　　　　صاحبِ انس و وفا تھے پاک تھا ان کا چلن

شاعرِ شیریں زباں تھے ماہرِ ہر علم و فن　　　　خدمتِ علم و ادب کی اُن کے دل میں تھی لگن

نامِ "طیب" ہے جو روشن ان کا ہی ایثار ہے

یہ حقیقت ہے حقیقت سے کسے اِنکار ہے

وہ پلاتے تھے مئے علم و ہنر کے سب کو جام　　　　ہوتا تھا سرشار پی کر جس کو ہر اک خاص عام

تھے وہ قابلؔ در حقیقت قابلِ صد احترام　　　　ان کی راہوں پر چلیں ہم با ادب لیں ان کا نام

ہیں نسیم اختر جو اُن کے بعد اسکے پاسباں

گلشنِ طیب کے یہ بھی ہیں اک اعلیٰ باغباں

نذرانۂ عقیدت

بجناب سید ازہر شاہ قیصر مرحوم

تحسین حامد کوثر

شریف وہ کہ شرافت کو ناز تھا جس پر
لئیق وہ کہ لیاقت کو ناز تھا جس پر

وہ صاف گو، کہ حقیقت کو ناز تھا جس پر
وہ صدق گو، کہ صداقت کو ناز تھا جس پر

بہارِ باغِ محبت خطاب اُس کا بجا
وہ شخصیت، کہ محبت کو ناز تھا جس پر

نوازشات میں عالم نواز جس کا لقب
نوازشات و عنایت کو ناز تھا جس پر

ادیب وہ، کہ ادب میں تھی انشاء پردازی
صحافی وہ، کہ صحافت کو ناز تھا جس پر

وہ ایک شاعرِ رنگیں خیال و خوش افکار
سخن میں جس کے لطافت کو ناز تھا جس پر

گرامی مرتبہ کوثر وہ سید ازہر شاہ
بشر سے مہر و مروّت کو ناز تھا جس پر

رئیس القلم

نواز دیوبندی
ایم اے ریسرچ اسکالر
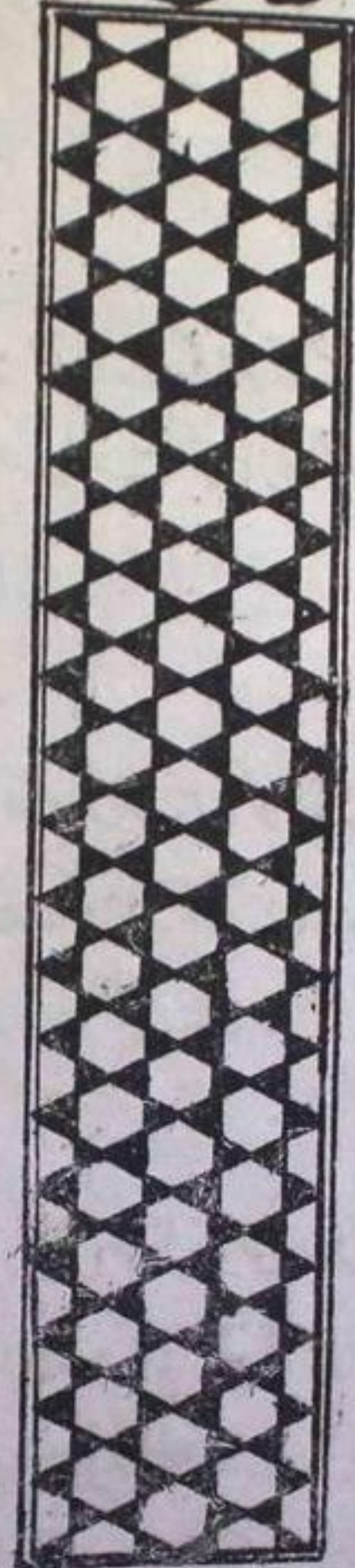
وہ قافلے کو راہ دکھا کر چلا گیا
تاریکیوں میں شمع جلا کر چلا گیا

آیا وہ اس طرح سے کہ آ کر چلا گیا
محفل میں اپنا رنگ جما کر چلا گیا

وہ شعر گو، ادیب، صحافی، نثر نگار
ہر رنگ و بو کے پھول کھلا کر چلا گیا

تعمیر کر گیا وہ محبت کا اک محل
دیوار نفرتوں کی گرا کر چلا گیا

اوروں کے غم سمیٹ کے دامن میں بھر لئے
خوشیاں وہ دوسروں کو لٹا کر چلا گیا

کہتے ہیں جس کو لوگ "رئیس القلم" نواز
اپنے قلم کی جوت جگا کر چلا گیا

سید محمد ازہر شاہ قیصر کی بے وقت موت کا

فتح چند بدر میرٹھی

یاد ازہر کی کھو گئی

ممتاز منور کر

دل میں جب بھی تری کھوئی ہوئی یاد آتی ہے
نام پھر ذہن میں آتا ہے محمد ازہر
وہ ہی مولانا جو سید بھی تھے قیصرؔ بھی تھے
تھے جو طیب کے مدیر اعلیٰ
یاد کے ساتھ ہی آنسو بھی نکل آتے ہیں
ہونے لگتا ہے خیالوں میں خزاں کا احساس
سخت ویرانوں میں انفاس الجھ جاتے ہیں
دل رہین غم مولانا ہوا جاتا ہے
سارا عالم نظر آنے لگا ویران خانہ
ڈوبنے لگتا ہے پھر محفل ہستی سے دماغ
دل بیمار کا لٹنے لگا سب صبر و قرار
زندگی زہر بھرا جام نظر آتی ہے
سوگواری دل محزوں کو ڈبا دیتی ہے
نیند پلکوں سے بہت دور چلی جاتی ہے
دل بیتاب میں یادوں کا ہجوم ہوتا ہے
خون روتی ہیں تمنائیں بڑی حسرت سے
بزم ہستی میں نہیں ہوتا بہاروں کو ثبات
موت کا خوف مسلط ہے بنی آدم پر
اب مسافر تو نہیں لوٹ کے آنے والا
دل کی تسکیں کو مگر بات یہی کافی ہے
حشر کے دن نظر آجائیں گے سید ازہر
ساری دنیا کا اندھیرا ہی سہی آنکھوں میں
دل ناشاد کو شاداب رکھیں گے یوں ہی۔

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر کی موت پر

سین۔ میم فلک میرٹھی
ایم اے

اک پرانا درخت برگد کا
ریگزاروں میں جیسے نخلستاں
جیسے گرمی میں چشمۂ شیریں
آسرا سب کے سر چھپانے کا

جس کی شاخوں پہ کچھ پرندے بھی
تھک کے اڑنے سے نیم پژمردہ
تشنہ کامی سے وا کئے منقار
آکے سائے میں جس کے دم لیتے

دور افتادہ راہ کے رہرو
جس کے سائے میں بیٹھ جاتے تھے

جس کی ٹھنڈی ہوا میں دم لے کر
آگے بڑھتے تھے طائر و رہرو

یک بیک موت کی چلی آندھی
زد میں آکر اکھڑ گیا دم میں
وہ تن آور درخت برگد کا
ریگزاروں میں تھا جو نخلستاں
جس کا سایہ تھا چشمۂ شیریں
سر چھپانے کا وہ خنک سایہ

راہ چلتے ہوئے مسافر اب
اڑنے والے طیور تشنہ کام
سب کی آنکھوں میں صرف حسرت ہے
سب مرقع ہیں نامرادی کا
غم کے مارے بدیدۂ پرنم
دور اب آسماں کو تکتے ہیں
وہ پرانا درخت برگد کا
اب کہیں بھی نظر نہیں آتا۔

منظوم

قطعاتِ تاریخ
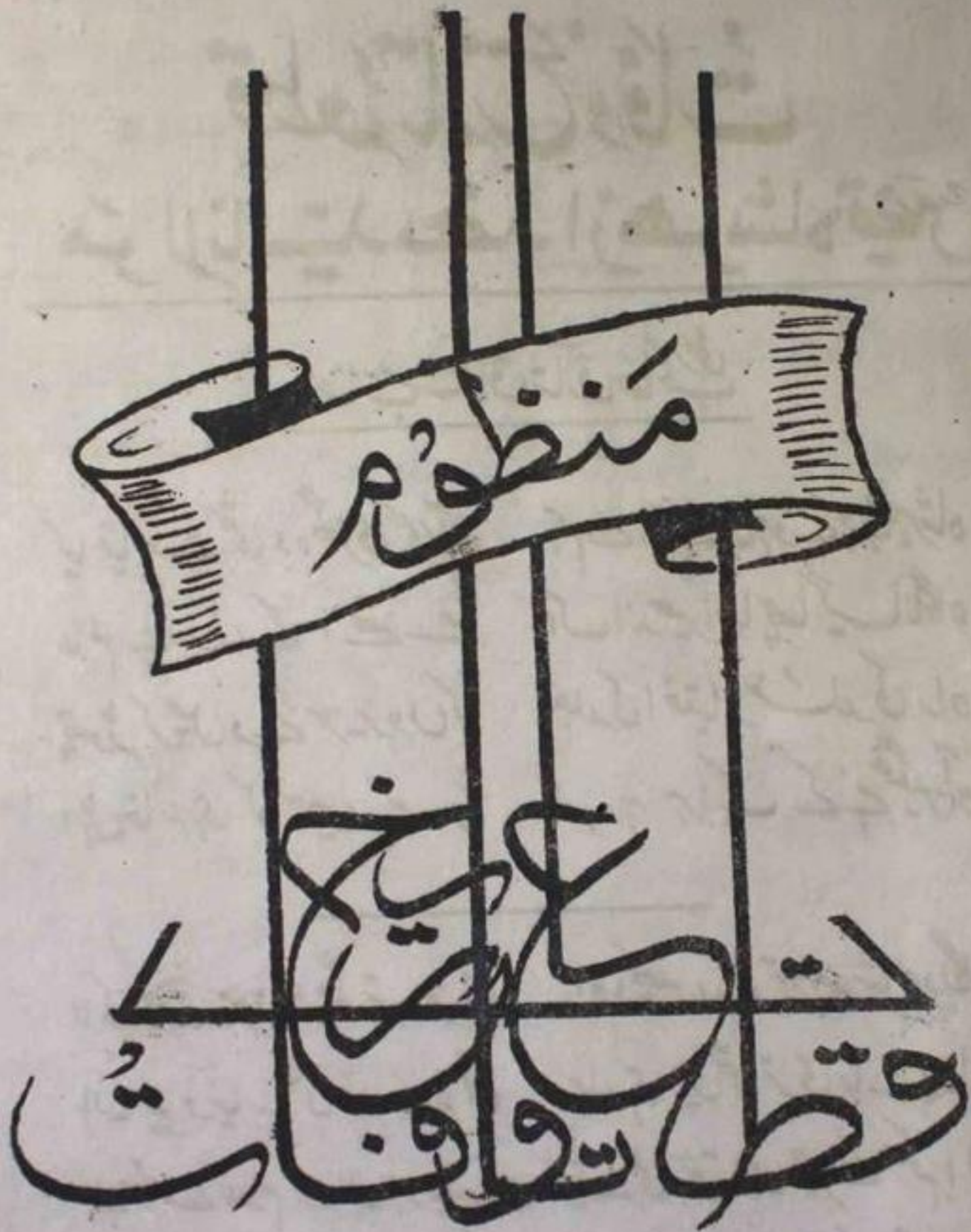
قطعۂ تاریخ وفات
مولانا سیّد محمد ازہر شاہ قیصرؒ

جناب مشتاق شارق صاحب میرٹھی

کیا قیامت تھی وہ گھڑی بھی آہ — ہم سے رخصت ہوئے جب ازہر شاہ
عالم بے بدل کے اٹھنے سے — اک اندھیرا سا چھا گیا ناگاہ
چھوڑ کر چل دیئے عزیزوں کو — جلد کی اختیار خلد کی راہ
اہل خانہ ہی کو نہیں ہے رنج — لب پہ ہر ایک کے ہے غمگین آہ

لاکھ خوش ہوں، مگر ترے بچّے — راہ دیکھیں گے تیری شام و پگاہ
ہاں یہ دنیا نہ تھی ترے لائق — خلد ہی میں تھی تری جائے پناہ
جلد سوئے عدم رواں ہو جائے — تھا یہی حق میں تیرے حکم الٰہ
یوں تو برحق ہے موت کا آنا — وہ ہو نادار یا ہو کوئی شاہ
تیری رخصت کا اور ہی غم ہے — کیا کہیں ہم زباں سے اپنی آہ
اُف یہ اُنّیسویں[۱۹] صدی کا سال — کر گیا گلستانِ علم تباہ
سنہ پچاسی[۸۵] وہ ہے گا یاد ہمیں — جس میں رخصت ہوئے ہیں قیصر آہ

انوکھا پھول

از
حمید قریشی
سہارنپوری

حاجی امداد اللہ مکیؒ و رشیدؒ
عبدالرحمٰنؒ، اشرفؒ و حاجی شریفؒ
اب نہ انور شاہؒ محمود الحسنؒ
اور نہ شبیرؒ و حسین احمدؒ لطیفؒ
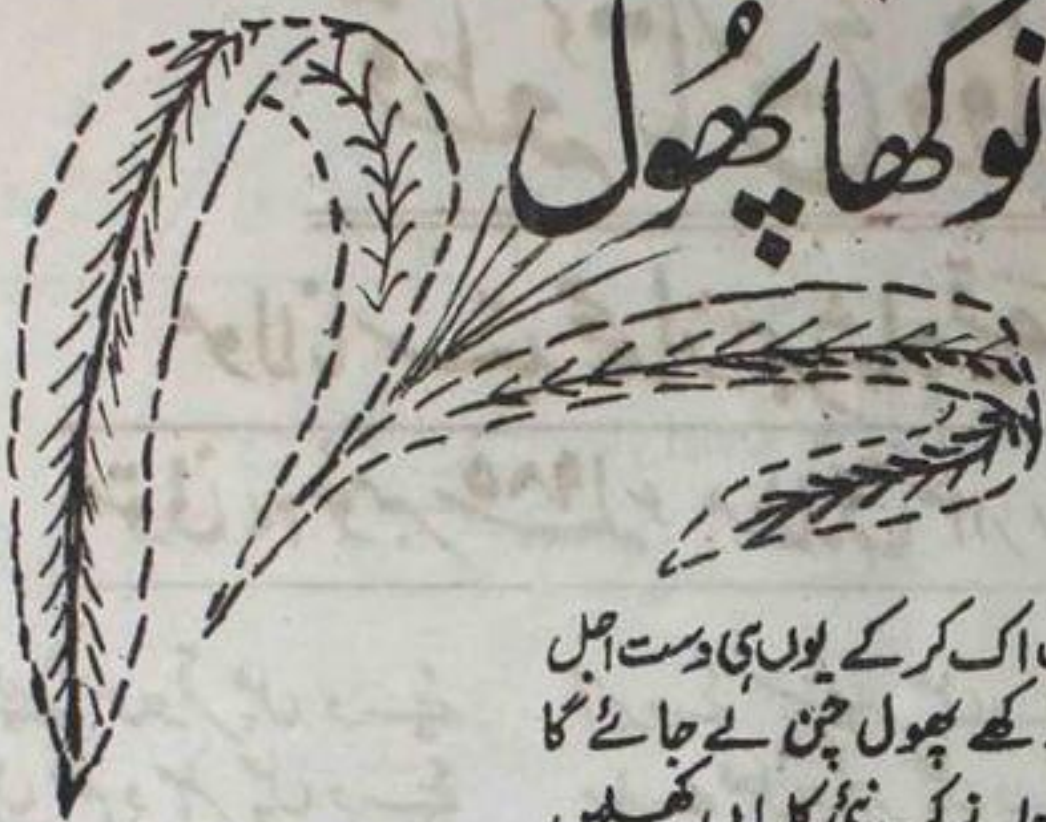
ایک اک کر کے یوں ہی دستِ اجل
یہ انوکھے پھول چن لے جائے گا
کون جانے کب نئی کلیاں کھلیں
کیا خبر یہ رنگ پھر کب آئے گا

آج پھر اک پیکرِ علم و ادب
اس جہانِ رنگ و بو سے چل دیا
پھر چمن زارِ شعور و آگہی
اک نرالا پھول کھو کر رہ گیا

حضرت قاسمؒ کے گلشن کا وہ پھول
جس کی خوشبو انجمن در انجمن
محفلِ مدنیؒ و طیبؒ کی بہار
فخرِ انور شاہؒ محمود الحسنؒ

اک صحافی اک ادیب اک مولوی
اتنی ساری خوبیاں اور ایک ذات
اک مدبر اک مفکر اک خطیب
الغرض وہ حاملِ جملہ صفات

جس کی آنکھوں میں مروت کا خمار
جس کے بشرہ سے متانت آشکار
جس کی پیشانی پہ مہرِ عاجزی
جس کے رخ پر علم و حکمت کا وقار

جس کی خوشبو سے مہکتے تھے دماغ
وہ انوکھا پھول بھی کمہلا گیا
جس کو بھولیں گے بڑی مشکل سے ہم
غم وہ ازہر شاہ قیصر نے دیا

۱۹۸۵ء

قطعۂ تاریخ وفات

مولانا سیّد محمد ازہر شاہ قیصرؒ خلد آشیانی

متوفی ۲۷ نومبر سنہ ۱۹۸۵ء مطابق ۱۳ ربیع الاول سنہ ۱۴۰۶ھ

کیسے شمس و قمر چل دیئے — آبروئے ہنر چل دیئے
اہل علم و ہنر چل دیئے — سارے لعل و گہر چل دیئے
اب قفس میں پرندے کہاں — واملان کو در چل دیئے
اب دھرا ہی ہے کیا باغ میں — بچے کھچے ثمر چل دیئے
ایسی افتاد کیا آپڑی — سب ہی لمبے سفر چل دیئے
جانے والے نہ جانے کہ کیوں — ایک ہی راہ پر چل دیئے
کون پائے وہ شیریں ادا — کوہ کن کوہ پر چل دیئے
جن کا دنیا میں ثانی نہیں — ایسے ایسے بشر چل دیئے
بزم ہستی سے دل بھر گیا — موت کی راہ پر چل دیئے
چھوڑ کر بزم احباب کو — آج ازہر کدھر چل دیئے
صبر کا دل کو یارا نہیں — دے کے زخم جگر چل دیئے
بے قراری کو چین آگیا — موت کی راہ پر چل دیئے
چل بسے پختہ کار ادب — آشنائے ہنر چل دیئے
اب بلانے سے آئینگے کیوں — جانے والے تو گھر چل دیئے
کیا بھلا پائیں ان کو بھلا — جو ہمیں چھوڑ کر چل دیئے
عالمِ دین ازہرؒ نہیں — دیں کے "نور نظر" چل دیئے

۱۴۰۶ھ

مغفرت کی دعا ہو ھُما
دیکھنا ہم اگر چل دیئے

قطعۂ تاریخ وفات

حضرت مولانا سید ازہر شاہ قیصر مرحوم

از
مشکور مشرقِ قائم گنجوی

حضرتِ سید ازہر تھے جو موصوف صفات
صاحب علم و ہنر شاعرِ عالی جذبات
ہوگیا آپ کا تاراجِ خزاں باغِ حیات
باغ فردوس بنا۔ اب سن تاریخ وفات

۱۴۰۶ھ

وائے علامہ جناب سید محمد ازہر شاہ صاحب قیصر کشمیری

سنہ ۱۹۸۵ء

از قلم ہادی کوثر صدیقی امروہوی

سنہ ۱۴۰۶ھ

(۱)

انتقال حضرت قیصرؔ کی جب آئی خبر
اس خبر سے ہو گئی ہر شخص کی حالت تباہ
ہے حروف غیر موصل میں یہ تاریخ وفات
چل بسے باغ فنا سے حضرت قیصر بھی آہ

۱۰۰۰ + ۴۰۰ + ۶ = سنہ ۱۴۰۶ھ

(۲)

انتقال جناب قیصر سے
ٹکڑے ٹکڑے ہوا دل اخترؔ
اک بڑھا کر ملا یہ سالِ اجل
باغِ دنیا سے اٹھ گئے قیصر

۱۹۸۵ء

(۳)

حضرت قیصر بھی مرتے دم تلک
واقعی اردو کی خدمت کر گئے
ان کا یہ سال اجل کوثر لکھو
آہ قیصر صاحب رحلت کر گئے

سنہ ۱۴۰۶ھ

فرزند حضرت علامہ سید محمد ازہر شاہ صاحب قیصر کشمیری رح

مولانا صادق علی قاسمی

مرقد زیادہ غم

۱۴۰۶ھ

طیب قطعۂ تاریخ

۱۴۰۶ھ

بر وفات سید ازہر شاہ قیصر رحمہ اللہ احد

۱۹۸۵ء

اک مبصر، اک صحافی، اک ادیب کامراں
فخر اردوئے معلّٰی، نازش ہندوستاں
مجھ سے ہاتف نے کہا صادق ہے سال وصال
اب کہ ازہر شاہ قیصر ہو گئے خلد آشیاں

۱۹۸۵ء

گھاس کے پودے کریں گے تیرے گھر کی نگہداشت
قبر کو تیری ہری رکھے گا مولیٰ اوس میں
چھوڑ کر یاروں کو پہنچے، خوب، ہاتف نے کہا
ہائے ازہر شاہ قیصر وادی فردوس میں

۱۴۰۶ھ

بہ صنعتِ توشیح

غ ـ ۱۰۰ = غنی دل کا رہا جو گلستاں میں
ظ ـ ۹۰۰ = ظریف و پاک طینت کارواں میں
ف ـ ۸۰۰ = فراست اور دانائی کا انجم
ہ ـ ۵ = ہمالہ عزم و ہمت کا جہاں میں

۱۹۸۵ء

صادق علی القاسمی البستوی بدریا آبادی لہرولی ہٹوا

۱۹۸۵ء

بہ صنعت منقوط

ابن الانور سید ازہر شاہ قیصر اک ادیب
دار فانی سے وہ صد افسوس رخصت ہو گئے
چھوڑ کر اہل و اقارب کو یہاں باچشم نم
جیسے دلہن، گود میں جا کر لحد کی سو گئے

ش، ش، ق، ق، ر، ت، و
۳۰۰ـ۳۰۰ـ۱۰۰ـ۱۰۰ـ۲۰۰ـ۴۰۰ـ۶

۱۴۰۶ھ

نوٹ: حرف مشدد ایک شمار ہوتا ہے (مٓد) ایک شمار ہوتا ہے، یہ (ی) شمار نہیں کیا جاتا۔ یہ (ۓ) ہمزہ ایک شمار ہوتا ہے۔ مشدد کا الف (ﷲ) ایک شمار ہوتا ہے۔ صادق

خبریں
اور
اخبارات و رسائل کا
خراج عقیدت

دیوبند میں مولانا سید ازہر شاہ قیصر کا انتقال

دیوبند ۳۰ رنومبر (نامہ نگار) مشہور عالم محدث علامہ سید انور شاہ کشمیری مرحوم کے بڑے صاحبزادے اور ممتاز صحافی مولانا سید ازہر شاہ قیصر کا کل طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ وہ ۷۰ سال کے تھے۔ مرحوم کئی سالوں سے دل کی بیماری میں مبتلا تھے۔ دو مہینے پہلے ان پر دل کا تیسرا حملہ ہوا تھا اس وقت سے وہ بالکل صاحب فراش ہوگئے تھے سید ازہر شاہ قیصر تقریباً ۲۴ سال تک دارالعلوم دیوبند کے ماہنامہ رسالہ "دارالعلوم" سے وابستہ رہے اور اردو صحافت کی شاندار خدمات انجام دیں۔

پچھلے چند سالوں میں دارالعلوم کے تنازع کے بعد ان کا تعلق دارالعلوم سے منقطع ہوگیا تھا حالاں کہ وہ دارالعلوم میں واپس چلے گئے تھے لیکن انھیں ان کے منصب پر واپس نہیں لیا گیا جس سے دل برداشتہ ہوکر وہ ادارے سے الگ ہوگئے۔

شاہ صاحب کے پسماندگان میں ان کی اہلیہ کے علاوہ چار لڑکیاں اور پانچ لڑکے ہیں

ہفتہ وار قومی آواز سے ان کا گہرا لگاؤ تھا۔ "سفینۂ وطن کے ناخدا" کے عنوان سے سلسلہ وار ان کے تاریخی مضامین شائع ہوتے رہے۔

روزنامہ "قومی آواز" دہلی

سابق مدیر "دارالعلوم" دیوبند دارالبقاء کو سدھار گئے

علامہ انور شاہ کے فرزند ارجمند ایک ادیب اور صحافی

ہم یہ خبر انتہائی رنج و ملال کے ساتھ دے رہے ہیں کہ "دارالعلوم" دیوبند کے سابق مدیر اور امام المحدثین علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے فرزند مولانا سید ازہر شاہ قیصر کا طویل علالت کے بعد دیوبند میں انتقال ہوگیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم ایک ادیب تھے صحافی تھے اور ملک کے سرکردہ اخبارات کی قلمی معاونت کرتے رہتے تھے انھوں نے ایک ایسے گھر میں آنکھ کھولی تھی جہاں انھوں نے علوم دین اور جہاد حریت کا چراغ روشن دیکھا اور فیضان حاصل کیا تھا انھوں نے اپنے عہد کے بہت سے بزرگوں رہنماؤں، علماء اور صحافیوں اور ادیبوں پر قلم اٹھایا تھا بہت سی دینی اور آزادی کی تحریکات کو قلمبند کیا تھا وہ مؤرخ نہیں تھے لیکن انھوں نے مؤرخوں کے لئے بہت سے عنوانات اور مواد فراہم کیا ہے اُن کی جگہ لینے والا اب کوئی نہیں نظر آتا۔ حال ہی میں انکے صاحبزادے نے دیوبند اکیڈمی کی جانب سے ماہنامہ طیب جاری کیا تھا جو برابر شائع ہو رہا ہے۔ ادارہ "مشرقی آواز" سوگوار خاندان کے غم میں پوری طرح شریک ہے اور دعاگو ہے کہ رب جلیل شاہ مرحوم کو آخرت میں بلند درجہ عطا کرے اور تمام پسماندگان خصوصاً انظر شاہ صاحب کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین

روزنامہ "مشرقی آواز" دہلی
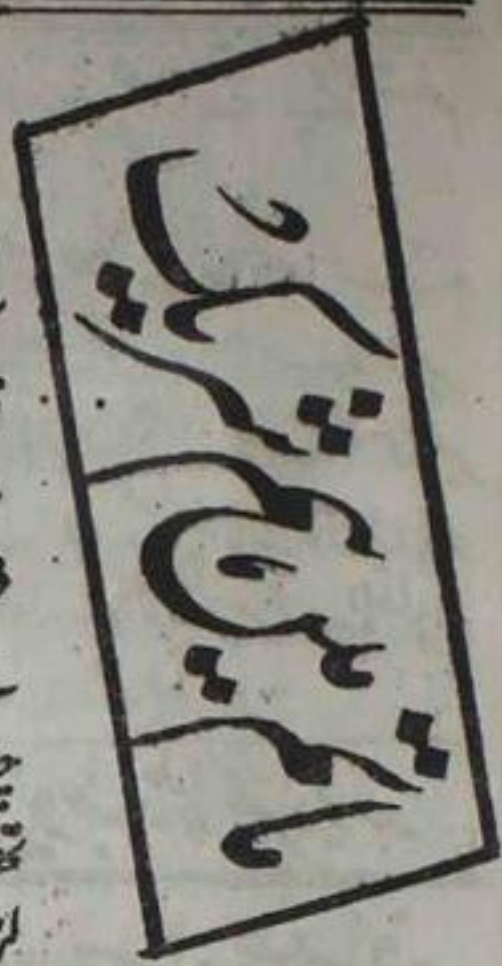
مشہور عالم اور محدث علامہ سید انور شاہ کشمیری مرحوم کے بڑے صاحبزادے اور ممتاز صحافی مولانا سید ازہر شاہ قیصر کا طویل علالت کے بعد ۳۰ نومبر کو دیوبند میں انتقال ہوگیا۔ وہ ستر سال کے تھے۔ مرحوم کئی برس سے قلب کے عارضے میں مبتلا تھے دو مہینے پہلے ان پر دل کا تیسرا حملہ ہوا تھا اس وقت سے وہ بالکل صاحب فراش ہوگئے تھے۔ سید ازہر شاہ قیصر تقریباً ۴۰ سال تک دارالعلوم دیوبند کے ماہانہ رسالے "دارالعلوم" سے وابستہ رہے اور اردو صحافت کی بہترین خدمات انجام دیں۔ پچھلے چند برسوں میں دارالعلوم کے تنازعے کے بعد ان کا تعلق دارالعلوم سے منقطع ہوگیا تھا۔ شاہ صاحب کے پسماندگان میں ان کی اہلیہ کے علاوہ تین لڑکیاں اور چار لڑکے ہیں

ہفت روزہ ہماری زبان نئی دہلی

آسمان صحافت کا درخشاں آفتاب غروب ہوگیا

انشاء و ادب کے ایک دور کا اختتام

دیوبند کی ادبی و صحافتی مانگ سونی

یادگار انور شاہ صاحبزادہ حضرت مولانا سید ازہر شاہ قیصر کا حادثۂ وفات

۲۷ نومبر ۱۹۸۵ء بروز بدھ دیوبند کی تاریخ کا ایک ایسا دن شمار کیا جائیگا جس میں ادب و صحافت اور تحریر و انشاء کے بے تاج بادشاہ ذہانت و ذکاوت کے کوہ گراں، بزرگوں اور اسلاف کی انمول یادگار، امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے فرزند اکبر ــــ رئیس التحریر، ادیب لبیب مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر مدیر اعلیٰ ماہنامہ "طیب" دیوبند نے اپنی دنیاوی زندگی کا سفر مکمل کیا اور گذشتہ ۶۷ سال سے چلی آرہی بزرگوں کی یہ نشانی / ۵۰ برس سے ادب و صحافت کے میدان کی ممتاز اور نمایاں شخصیت اپنی آٹھ ماہ کی طویل علالت کا ایک دور گزار کر ہمارے درمیان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اٹھ گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

صحافت کے بام و در میں زلزلہ آگیا انشاء و ادب کی راہیں سونی ہوگئیں، اسلاف اور اکابر کے تذکروں اور واقعات سے دلوں کو نور اور روشنی بخشنے والا نہ رہا۔ غرضیکہ ایک ایسا انسان

ایک ایسا کامل مرد، ایک ایسا باہمت اور بالغ نظر آدمی ہمارے درمیان ندرہا۔ جس نے اپنے قلم اپنی تحریر اور اپنے اعلیٰ اور بلند افکار کے ذریعہ پورے پچاس برس روشنی پہنچائی۔

یہ حادثہ صرف اہل دیوبند کے لئے ہی نہیں بلکہ ہندوپاک میں پھیلے ہوئے حضرت شاہ صاحب رح کے ہزاروں شاگردوں اور عقیدتمندوں کے لئے ایک روح فرسا حادثہ ہے۔ خود مولانا سید ازہر شاہ قیصر رح اپنی ادبی اور صحافتی خدمات کی وجہ سے دیوبند ٹائمز کے صفحات پر اپنے افکار کی روشنی بکھیر رہے تھے — ادارہ حضرت شاہ جی رح کی مغفرت کی بصمیم قلب دعا کرتا ہے اور ان کے پسماندگان اہلیہ صاحبہ، صاحبزادگان اور صاحبزادیوں کی خدمت میں تعزیت مسنونہ پیش کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ رب العلمین شاہ جی کو بلند مراتب سے نوازے آمین۔ اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

پندرہ روزہ دیوبند ٹائمز دیوبند

ممتاز عالم دین ادیب اور صحافی مولانا سید ازہر شاہ قیصر کا انتقال

اس خبر کو شدید افسوس کے ساتھ شریک اشاعت کیا جا رہا ہے کہ نامور دینی خانوادے حضرت علامہ جناب سید انور شاہ کاشمیری رہ کے بڑے صاحبزادے جناب ازہر شاہ طویل علالت کے بعد ۲۷ نومبر ۱۹۸۵ء کی شام اپنے مالک حقیقی سے جا ملے انا للہ وانا الیہ راجعون

مرحوم جناب ازہر شاہ ایک ممتاز عالم دین ادیب اور صحافی تھے۔ وہ منفرد طرز کے اہل قلم اور انشاء پرداز تھے تقریباً آٹھ اخبارات و رسائل کے مدیر رہے۔ ہزار ہا مضامین سپرد قلم کئے چار کتابیں تصنیف فرمائیں مختصر یہ کہ تمام عمر قلم سے اردو کی خدمت انجام دیتے رہے۔ دیوبند جو اس ملک میں علماء دین کا مرکز دین کا ستون ہے ایک مخلص عالم دین سے بلاشبہ محروم ہو گیا ہے دعا ہے کہ حق تعالیٰ ان کی مغفرت اور جملہ پسماندگان کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

ہفت روزہ انکشاف جھانسی

اردو صحافت کا آفتاب غروب

مولانا سید ازہر شاہ قیصر کا انتقال پُرملال

افسوس! اردو صحافت کا آفتاب حضرت محدث عصر علامہ انور شاہ کشمیری رح کے فرزند اکبر مولانا سید ازہر شاہ قیصر آج ۲۷ نومبر ۸۵ء کو بعد نماز ظہر تین بج کر دس منٹ پر طویل علالت اور جاں گداز حالات سے مقابلہ کرتے ہوئے جاں بحق ہو گئے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

پندرہ روزہ ندائے دارالعلوم دیوبند

مولانا سید ازہر شاہ صاحب قیصر کی وفات

دیوبند ۲۷ر نومبر سنہ ۱۹۸۵ء - ایک عرصہ علیل رہنے کے بعد مولانا سید ازہر شاہ قیصر ۶۷ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ تین بجے دن میں مولانا کا انتقال ہوا اور اگلے دن صبح کی نماز کے بعد ان کے آبائی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ نماز جنازہ میں حضرت مولانا معراج الحق صاحب صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند اور دیگر اساتذہ نے شرکت فرمائی، اور پھر جنازہ کے ساتھ قبرستان تشریف لے گئے، دس بجے کے قریب دارالعلوم میں کلمۂ طیبہ کا ختم کرایا گیا جس میں حضرات اساتذہ طلبہ اور کارکنان نے شرکت کی اور حضرت مولانا معراج الحق صاحب نے دعائے مغفرت فرمائی۔

مرحوم مولانا سید انور شاہ کشمیری کے بڑے صاحبزادے تھے، نہایت خلیق اور بامروت شخصیت کے مالک تھے، قوت حافظہ ورثہ میں پائی تھی، بہت اچھا لکھتے تھے۔ ایک مدت تک "ماہنامہ دارالعلوم" کی کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ادارت کرتے رہے۔ نہ صرف دارالعلوم کے حلقہ میں بلکہ اہل علم وقلم کے پورے حلقہ میں مرحوم کو قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ ہمیں مولانا کی وفات کا بہت افسوس ہے حق تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں مقام عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر کی توفیق بخشے آمین

پندرہ روزہ "آئینہ دارالعلوم" دیوبند

سید ازہر شاہ قیصر کا انتقال پُر ملال

دیوبند ۳۰ر نومبر مشہور عالم محدث سید انور شاہ کشمیری مرحوم کے بڑے صاحبزادے سید ازہر شاہ قیصر (عمر ۷۰ سال) طویل عرصہ دل کی بیماری کے بعد انتقال کر گئے۔ دو ماہ قبل ان پر دل کا تیسرا جان لیوا حملہ ہوا تھا۔

ازہر شاہ قیصر بہت بلند پایہ صحافی تھے چالیس سال تک آپ ماہنامہ دارالعلوم سے متعلق رہے۔ اس کے بعد اپنے مکتبہ سے اپنا ماہنامہ "طیب" اور ایک اردو ہفت روزہ بھی شائع کرتے رہے۔ "سفینۂ وطن کے ناخدا" نام سے آپ تاریخی مضامین لکھا کرتے تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ، چار لڑکیاں، پانچ لڑکے ہیں۔

ہفت روزہ "میرٹھ میلہ" میرٹھ

چھپتے چھپتے

ادب و صحافت کا ایک تابندہ و درخشاں آفتاب حضرت مولانا ازہر شاہ قیصر اس دار فانی سے دار بقا کی طرف ۲۷ر نومبر بروز بدھ کوچ کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

پندرہ روزہ اجتماع دیوبند

مولانا ازہر شاہ قیصر کا انتقال

یہ خبر انتہائی رنج کے ساتھ شائع کی جارہی ہے کہ ۲۷ نومبر ۱۹۸۵ء کو شام کے وقت آپ داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔　انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر علامہ انور شاہ صاحب کشمیری، (مدرسہ دار العلوم کے ایک زمانہ محدث رہے) کے فرزند ارجمند تھے۔ مرحوم نے مذہبی اور سیاسی امور میں کافی دلچسپی لے رکھی تھی اور مدرسہ دار العلوم سے جو ماہانہ رسالہ "دار العلوم" شائع ہوتا ہے اس کے آپ تقریباً چالیس سال مدیر اعلیٰ رہے۔ جب مدرسہ مذکور میں تقریباً چار پانچ سال پہلے بحران شروع ہوا تو مرحوم بھی بحران کا شکار ہو کر رہ گئے۔

ادارہ آزاد خلوص دل سے دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین

ہفت روزہ آزاد سہارن پور

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر کا سانحۂ ارتحال

فلک دیوبند کا ایک درخشندہ ستارہ ٹوٹ گیا

فاضلکا۔ اردو کے صاحب طرز انشاء پرداز اور صحافی مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر مسلسل نو ماہ تک سانس اور دل کے عارضہ میں مبتلا رہنے کے بعد ۶۵ برس کی عمر میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ اور اس طرح وہ روشن چراغ گل ہو گیا جس نے گذشتہ نصف صدی سے علم و ادب کی دنیا میں اجالا کر رکھا تھا۔

انجمن ترقی اردو ہند کی مرکزی کمیٹی کے رکن وشوا ناتھ طاؤس نے اپنے تعزیتی بیان میں کہا ہے کہ مولانا قیصر ممتاز عالم حدیث، تھے اور اکابرین دیوبند میں ان کا اہم مقام تھا انھوں نے متعدد کتابیں لکھیں جو اردو ادب کا انمول سرمایہ ہیں۔ رسالہ "دار العلوم" برسوں ان کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ اور زندگی کے آخری دور میں وہ پندرہ روزہ "اشاعت حق" اور ماہنامہ طیب کے سرپرست و نگراں رہے۔ انھیں بابائے صحافت مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ بھی روزنامہ "زمیندار" میں کام کرنے کا شرف حاصل ہوا۔

جناب طاؤس نے مزید کہا ہے کہ مولانا محمد ازہر شاہ قیصر کی وفات میرے لئے ایک ذاتی صدمہ بھی ہے کیونکہ وہ میرے دیرینہ محسن اور مربی تھے اور ان کے توسط سے ہی مجھے علماء دیوبند سے شناسائی کی سعادت حاصل ہوئی خدا انھیں بلند درجات سے نوازے، اور ان کی مغفرت کرے۔

ہفت وار انکشاف جھانسی ۔ ہفتہ وار خبر دار، سہارنپور ۔ ہفت روزہ نیا ولولہ سرینگر کشمیر، ہفت روزہ ایک قوم پٹنہ

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم کی یاد میں شعری نشست

مشہور صحافی اور بلند پایہ ادیب مولانا سید ازہر شاہ قیصر مرحوم کی یاد میں سر سید ایجوکیشنل سوسائٹی دیوبند کی جانب سے ایک شعری نشست کا اہتمام کیا گیا۔ حاضرین نے بڑی تعداد میں شرکت فرمائی دیوبند اور بیرون دیوبند کے نوجوان شعراء نے اپنے کلام سے نوازا۔ ممتاز شاعر جناب حفیظ میرٹھی مہمان خصوصی تھے نشست اسلامیہ اسکول کے ہال میں تقریباً ایک بجے تک کامیابی کے ساتھ چلی۔ صدارت کے فرائض جناب قمر کاظمی نے انجام دیئے منصور انور خاں نے سوسائٹی کا تعارف کرایا۔ مظہر صدیقی اور ستیش چند گرگ نے شاہ صاحب رح کو خراج عقیدت پیش کیا۔ مولوی ساجد نے ایک مقالے کے توسط سے شاہ صاحب کی خدمات پر روشنی ڈالی محمد اسعد اور ماجد صدیقی نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ نظامت کے فرائض نواز دیوبندی نے انجام دیئے۔ نشست میں محمد ادریس صدیقی، احمد علی شاد، سلیم احمد سلیم، اور عدنان نعمانی نے بھی کلام پیش کیا۔

روزنامہ "قومی آواز" دہلی

مولانا سید ازہر شاہ قیصر ہمارے اکابر کی قیمتی یادگار تھے

مولانا خورشید عالم صاحب کا اظہار تعزیت

مولانا سید ازہر شاہ قیصر مدیر ماہنامہ دار العلوم و ماہنامہ طیب دیوبند کے سانحۂ ارتحال پر بعد نماز ظہر جامع مسجد میں جلسۂ تعزیت میں تقریر کرتے ہوئے مولانا خورشید عالم صاحب نائب مہتمم مدرسہ وقف دار العلوم نے انتہائی رنج و ملال کا اظہار کیا اور فرمایا کہ یہ ہم سب لوگوں کی ذمہ داری ہے اور ہمارا فرض ہے کہ شاہ صاحب کے لئے زیادہ سے زیادہ ایصال ثواب کریں۔

مولانا موصوف کلمہ طیبہ اور قرآن کریم کے ختم پڑھے جانے کے بعد دعا کرانے سے پہلے تقریر کر رہے تھے۔ آپ نے حضرت مولانا سید ازہر شاہ صاحب کو حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کی یادگار بتایا اور کہا کہ ان کی وفات ہم سب کے لئے نہایت اندوہناک حادثہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین۔

مولانا سید ازہر شاہ قیصر کی وفات پر ہر طرف غم کی گھٹا

دیوبند۔ گذشتہ ہفتہ مولانا سید ازہر شاہ قیصر طویل علالت کے بعد انتقال فرما گئے۔ اس حادثہ پر دیوبند کے تمام ادبی صحافتی، دینی، علمی اور سماجی حلقوں میں رنج وغم کی گھٹا چھا گئی۔

۲۷ر نومبر کو آپ کا انتقال ہوا اگلے روز صبح کے وقت دارالعلوم جامع مسجد میں آپ کی نماز جنازہ ہوئی جس میں علماء کرام، اکابر دیوبند اور ادبی وعلمی صحافتی وسماجی طبقوں، مدارس کے ذمہ دار، اداروں کے سربراہ اور عوام بڑی تعداد میں شریک ہوئے نماز جنازہ مولانا خورشید عالم صاحب نائب مہتمم وقف دارالعلوم جامع مسجد نے پڑھائی۔

بعد نماز ظہر جامع مسجد دیوبند میں جلسۂ تعزیت ہوا اور اس سے قبل قرآن کریم اور کلمہ طیبہ کا ختم پڑھا گیا اور مرحوم کی روح کو ایصال ثواب کیا گیا۔

اگلے روز بعد نماز عشاء ایک جلسۂ تعزیت مولانا محمد اسلم قاسمی صاحبزادہ حکیم الاسلامؒ کی صدارت میں ہوا جس میں مولانا سید عبدالروف عالی مدیر ندائے دارالعلوم، مولانا جمیل احمد صاحب، غلام نبی کشمیری مولانا محمد اسلام قاسمی صاحب، غلام مصطفےٰ کشمیری، مولوی نسیم اختر شاہ قیصر وغیرہ نے شاہ صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔ مولانا محمد اسلم صاحب (صدر جلسہ) نے تفصیل کے ساتھ اور غم انگیز انداز میں شاہ صاحب کے حالات پر روشنی ڈالی۔

آخر میں جناب اظہر صدیقی (رفیق ادارۂ تحریر ندائے دارالعلوم) نے ایک تجویز تعزیت پیش کی۔ مولوی اسامہ عثمانی نے جلسہ کا اہتمام کیا اور نظامت کے فرائض انجام دئے۔ دیوبند کے سبھی تعلیمی اداروں میں حضرت شاہ صاحب کی وفات پر تعزیتی جلسوں اور ختم وایصال ثواب کا اہتمام کیا گیا۔

دہلی میں جامعہ رحیمیہ درگاہ حضرت شاہ ولی اللہؒ میں ایصال ثواب کیا گیا۔ مولانا نعیم صاحب نے حضرت شاہ صاحب کی علمی، دینی اور صحافتی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا۔ انجمن ترقی اردو دیوبند کی ہنگامی میٹنگ میں بھی شاہ صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا گیا شاہ صاحب اس انجمن کے نائب صدر تھے۔

پندرہ روزہ ندائے دارالعلوم دیوبند
دسمبر ۱۹۸۵ء

اتر پردیش کے ایڈیٹروں کا اظہار غم

مسٹر گل محمد آفس سکریٹری اترپردیش اردو ایڈیٹرس آرگنائزیشن ضلع سہارنپور نے اطلاع دی ہے کہ اس آرگنائزیشن کے اراکین وعہدہ داروں کی طرف سے جناب اظہر صدیقی جنرل سکریٹری نے ایک تعزیتی بیان اخبارات کے نام ارسال کر کے شاہ صاحب کی وفات حسرت آیات پر گہرے رنج و الم کا اظہار کیا ہے اور ایڈیٹرس آرگنائزیشن کی ایک ہنگامی تعزیتی میٹنگ میں شاہ صاحب کی وفات کو آرگنائزیشن کے ایک محسن اور سرپرست بزرگ کی وفات قرار دیتے ہوئے ان کو پرزور خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔

پندرہ روزہ
ندائے دارالعلوم دیوبند

سفینۂ انوری کے ناخدا سید محمد ازہر شاہ قیصر کے گذشتہ دنوں رحلت پاجانے کی خبر سے نہ صرف خاندان انوری نے سوگ منایا بلکہ ملک و بیرون ملک میں صف ماتم بچھ گئی۔ جگہ جگہ تعزیتی جلسے کیئے گئے اور تعزیتی پیغامات کا سلسلہ ابل پڑا۔

گذشتہ ۵۵ برس کے عرصہ میں قیصر صاحب نے رئیس القلم، ممتاز ادیب، مشہور صحافی، کامیاب مصنف اور اعلیٰ شاعر کی خدمات انجام دیں اور خلوص و محبت کے پیغام کو جاری و ساری کیا۔

ے
ہزاروں سال اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ہفت روزہ "میرٹھ میلہ" میرٹھ۔ جنوری ۱۹۸۶ء

آہ! ازہر شاہ قیصر

۱۹۴۶ء سے اب تک میری ملاقات سیکڑوں ادیبوں شاعروں اور صحافیوں سے ہوئی مگر میں نے کسی کو بھی شاہ جی، جنھیں میں اظہر شاہ کے نام سے کم اور شاہ جی کے نام سے زیادہ جانتا تھا ان جیسا عاجزی انکساری اور خلوص کا پیکر کسی کو نہیں پایا۔

میرے والد محترم علامہ انور صابری مرحوم سے ان کی ملاقات تقریباً ۵۰ سال سے تھی شاہ جی علامہ سے بے حد محبت فرماتے تھے ایک روز مجھ سے فرمایا، علامہ جانے ہی والے ہیں میرا دل چاہتا ہے کہ ان کی آغاز شاعری سے اب تک کے تمام حالات ایک کتاب کی صورت میں لکھ دوں اس لئے کہ علامہ کے قریبی دوستوں میں انڈوپاک میں چند ہی لوگ باقی رہ گئے ہیں پھر کون لکھے گا۔

یہ کسے خبر تھی کہ علامہ کے ساتھ ہی تین چار مہینے کے بعد شاہ جی بھی اللہ کو پیارے ہو جائیں گے۔ شاہ جی کے بعد دیوبند میں اب ایسا کوئی ادیب یا شاعر نہیں رہا جسے انڈوپاک کے ادبی حلقوں میں وہ مقبولیت حاصل ہو جو شاہ جی کو تھی۔ دیوبند میں بھی عمر بھر یہ عالم رہا کہ ہر شخص اپنے آپ کو شاہ جی سے بہت قریب ترین سمجھتا تھا۔ ان کا انداز گفتگو ان کا پُر خلوص اظہار تعلق ہر شخص کو ان کا گرویدہ بنا دیتا تھا بڑوں میں بڑے، بچوں میں بچے، برسوں "دارالعلوم" کے ایڈیٹر رہے

راقم الحروف شاہ جی کے بچوں اور تمام پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے

پندرہ روزہ "چراغ حرم" دیوبند

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

حضرت مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر کا انتقال

دنیائے علم وادب کا عظیم محسن رخصت ہوگیا

حضرت مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم امام المحدثین حضرت علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہ کے فرزند اکبر تھے ان کی عمر ۷۶ برس تھی وہ پوری نصف صدی سے سرزمین دیوبند کے آسمانِ علم وادب اور صحافت ودانش پر ماہتاب عالمتاب بن کر جگمگار ہے ہیں۔ ایک درجن کے قریب جرائد وصحائف کے وہ رئیس التحریر رہے ان کی محفلیں اسلام کے تذکروں سے معمور رہتی تھیں۔ عصر حاضر میں دیوبند کی علمی عظمت اور ادبی رفعت کی وہ پہچان سمجھے جاتے تھے۔ ایک عالم انھیں اقلیم قرطاس وقلم کا بے تاج بادشاہ تسلیم کرتا تھا۔ برصغیر پاک وہند کے دینی وادبی رسائل وجرائد ان کے مضامین سے اپنی مانگ میں سیندور بھرا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرحوم کے قلم کی جولانیوں نے اردو ادب کے دامن کو وہ انمول ہیرے اور جواہرات عطا کئے جن کا بدلہ نہیں دیا جاسکتا انھوں نے جب بھی دینی موضوعات پر کوثر وتسنیم پر دھلے قلم کے ساتھ طبع آزمائی کی تو اپنے ہر قاری سے داد وتحسین وصول کی۔

ان کے انتقال سے دنیا ایک بلند پایہ ادیب، مصنف، مفکر اور صاحب علم ودانش شخصیت سے محروم ہوگئی ہے۔ اردو صحافت کا عظیم محسن اس دار فانی سے کوچ کرگیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے ان کے پسماندگان اور اہالیان دیوبند ہی نہیں پورے برصغیر میں پھیلے ہوئے ان کے عقیدتمندوں کو صبر جمیل عطا فرمائے، ادارہ خدام الدین سید نسیم شاہ قیصر کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

ہفت روزہ خدام الدین لاہور پاکستان ۶ دسمبر ۱۹۸۵ء

وفیات

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر

علامہ انور شاہ کشمیری کے فرزند اور اکابر علماء دیوبند کی علمی نسبتوں کے امین تھے۔ مدتوں مرکز علم دار العلوم دیوبند کے ماہنامہ رسالے "دار العلوم" کے مدیر اور اب ماہنامہ طیب کے ایڈیٹر تھے وہ ایک وسیع النظر صحافی اور ادیب تھے موصوف کی ساری زندگی علم کی خدمت، دین کی اشاعت حق گوئی، صداقت اور تحریر وتصنیف میں گذری انکی گرانقدر دینی خدمات، تصنیفات بالخصوص ماہنامہ دار العلوم میں ان کی علمی کاوشوں کی پوری تاریخ ایک صدقہ جاریہ اور امت کے لئے راہ راست کا سنگ میل ہوگی۔

ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک پاکستان دسمبر ۱۹۸۵ء

یادِ رفتگاں

بہت تاخیر سے یعنی ۷ر دسمبر ۱۹۸۵ء کو غازی پور میں دہلی کے ایک اخبار کے ذریعہ یہ افسوسناک اطلاع ملی کہ ۲۷ر نومبر ۱۹۸۵ء کو امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری رح کے فرزند اکبر، رسالہ دارالعلوم کے سابق مدیر اور بزرگ صحافی مولانا ازہر شاہ قیصر وفات پاگئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم کی نسبی فضیلت کے لئے تو یہی بات کافی ہے کہ وہ علامہ انور شاہ کشمیری رح کے فرزند تھے۔ لیکن ذاتی حیثیت سے بھی ان کی وفات نے یقیناً ایک خلا پیدا کیا ہے۔ مرحوم کا تعلق اس نسل سے تھا جس کے یہاں وضع داری، اخلاص ومروت اور شفقت واکرام کو اتنا بلند مقام حاصل ہوا کرتا تھا کہ اس کے بغیر آدمیت کی تکمیل نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب کی ذات بھی ان صفات کی حامل تھی وہ نہ صرف صحافی تھے بلکہ صحافی گر بھی تھے۔ لکھنے کے لئے آمادہ کرنا لکھنے کا سلیقہ بتانا اور لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا ان کے محبوب مشاغل تھے۔ میری پہلی کتاب "ہمارے اسلاف" (جو ۳۰ اکابر صحابہ کی مختصر سوانح ہے) جب دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کے زمانے میں شائع ہوکر منظر عام پر آئی تو اس کے ۲ نسخے لیکر میں رسالہ "دارالعلوم" کے دفتر گیا کہ شاہ صاحب اس کتاب پر تبصرہ کردیں۔ شاہ صاحب مرحوم نے کتاب دیکھتے ہی مندرجات کتاب پر ایک نظر بھی ڈالے بغیر محض کتاب کی تالیف واشاعت ہی پر بہت بلند کلمات میں حوصلہ افزائی کی اور خاندانی بزرگوں کا حوالہ دیتے ہوئے بڑی تاکید کے ساتھ یہ فرمایا کہ تصنیف وتالیف کی طرف توجہ کرنا تمہارے لئے ضروری ہے۔ پھر "دارالعلوم" میں اس کتاب پر بہت وقیع اور مفصل تبصرہ شائع کیا۔ اس تبصرہ میں بھی مولف کتاب کی حوصلہ افزائی کا عنصر غالب رہا۔

رسالہ "البدر" کے اجراء پر مبارکباد کا سب سے پہلا خط شاہ صاحب مرحوم ہی کا آیا اس کے علاوہ موقع بموقع متعدد مضامین پر مبارکباد دی اور دعاؤں سے حوصلہ افزائی کی۔

شاہ صاحب مرحوم کم وبیش ۳۰ سال رسالہ دارالعلوم کے مدیر رہے۔ اور اب اس سے علیحدگی کے بعد اپنے بیٹے عزیزم مولانا نسیم اختر شاہ قیصر کی ادارت میں نکلنے والے رسالہ ماہنامہ "طیب" دیوبند کے سرپرست تھے اور برابر اس میں لکھ رہے تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے جن میں حیات انور، اور یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ، خصوصیت کیساتھ لائق ذکر ہیں وہ دینیات، ادبیات اور سیاسیات تینوں پر گرفت رکھتے تھے۔ حق تعالیٰ مرحوم کی حسنات کو قبول فرماکر انکی مغفرت فرمائے، ادارہ "البدر" مرحوم کے جملہ ورثاء خصوصاً ان کے صاحبزادگان سے اظہار تعزیت کرتا ہے۔

ماہنامہ البدر کاکوری، جنوری ۱۹۸۶ء

شذرات

۲۷ نومبر ۸۵ء کو ادب وصحافت اور ذہانت ومتانت کا ایک اور ستارہ آنکھوں سے اوجھل ہوگیا
ادبی اور قلمی دنیا ماتم کناں ہوگئی۔ دیوبند کے ایک ممتاز ادیب، صاحب طرز انشاپرداز اور
ایک بزرگ وسنجیدہ صحافی سے ہم محروم ہوگئے۔
ہماری مراد ہے یادگار اکابر دیوبند ابن الانور جناب **سید ازہر شاہ قیصر** رحمۃ اللہ علیہ
آپ کے سانحۂ ارتحال پر اشاعت حق دیوبند نے جو خصوصی ضمیمہ شائع کیا ہے اس میں لکھا ہے کہ:-
"زندگی اور موت کے درمیان فاصلہ بھی تو کچھ نہیں ہوتا، سانس رُکی، نبضیں ساتھ چھوڑتی چلی
گئیں، دل کی حرکت آہستہ آہستہ ختم ہوتی گئی۔ اور آناً فاناً ۶۵ برس کی زندگی کا اس طرح خاتمہ
ہوگیا کہ ہم کچھ بھی نہ کرسکے۔ نو مہینے جو شخص اس طرح ہمارے درمیان موجود رہا ہو کہ کوئی بھی
لمحہ رات اور دن میں ایسا نہیں آیا کہ جس میں وہ تنہا رہا ہو ۲۸ نومبر کی صبح قبرستان انوری میں
تنہا اور اکیلا چھوڑ کر سپرد خاک کر آئے۔ ہزاروں من مٹی کے نیچے، ویران، سنسان قبرستان میں
جہاں انسان وحشتوں اور سناٹوں کے درمیان آخرت کی ہولناکیاں برپا ہونے تک اپنا وقت گذاریگا۔"
جی ہاں! یہی زندگی ہے اور انسانی فطرت کہ ایک آتا ہے اور ایک جاتا ہے اور آنے جانے
کے اس عمل کے درمیان جو کچھ بھی کرنا ہوتا ہے وہ یہ کمزور اور ناتواں انسان ہی انجام دیتا ہے۔
وفات کی خبر سُن کر میرواعظ کشمیر مولانا محمد فاروق نے صاحبزادۂ محترم مولوی نسیم اختر شاہ
کے نام اپنے تعزیتی برقیہ میں اپنے گہرے دکھ اور رنج کے اظہار کے ساتھ ساتھ مرحوم کے حق میں
دعائے مغفرت اور لواحقین وپسماندگان سے ہمدردی اور تعزیت فرمائی ہے۔

جناب مرحوم سید ازہر شاہ جن کے لئے یہی اعزاز اور سند کافی ہے کہ آپ عالم اسلام کے
جلیل القدر محدث، امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہ کے فرزند ارجمند تھے۔ جن کے بارے میں
کچھ کہنا اور لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

ادارۂ نصرۃ الاسلام بھی مرحوم کے انتقال پر گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے بارگاہ خداوندی میں دعاگو
ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور جملہ پسماندگان خاص طور پر مرحوم
کے برادر اصغر حضرت الاستاذ قبلہ مولانا سید انظر شاہ صاحب مدظلہ کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے آمین

ماہنامہ **نصرۃ الاسلام** سری نگر کشمیر ماہ دسمبر ۱۹۸۵ء

حضرت مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر کا سانحۂ ارتحال پُر ملال

دنیائے علم و ادب کا عظیم محسن، آسمان علم و صحافت کا ماہتاب عالم تاب، بلند پایہ ادیب، عظیم مصنف و مؤلف، مفکر، علم و دانش کے گوہر تابدار، عظیم شخصیت حضرت مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر دیوبند (بھارت) میں اپنی آٹھ ماہ کی طویل بیماری کے بعد اس جہان فانی سے انتقال فرما گئے (انا للّٰہ وانا الیہ راجعون)۔

مرحوم دنیا کے عظیم محدث امام العصر حضرت سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند اکبر تھے۔ "عظیم ولد کے عظیم فرزند" کے صحیح مصداق تھے۔ وہ پوری نصف صدی سے سرزمین دیوبند (بھارت) پر دینی، علمی، تصنیفی اور ادبی خدمات سے چھائے ہوئے تھے اور کم و بیش پچاس برس ادب و صحافت کے میدان میں گزارے۔ مرحوم نے "النصیحۃ" کو اپنی آخری تحریر کی زینت بخشی اور النصیحۃ کے اجراء پر انتہائی خوشی کا اظہار فرمایا۔ مدیر النصیحۃ کے نام پر خوشی و مسرت کا مکتوب گرامی "النصیحۃ" کے تیسرے شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ پاک حضرت مولانا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان، اہلیان دیوبند اور پوری برصغیر میں پھیلے ہوئے ان کے عقیدت مندوں اور بالخصوص حضرت مولانا مرحوم کے جانشین و فرزند ارجمند جناب سید نسیم اختر شاہ قیصر کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مرحوم کے ایصال ثواب کے لئے حسب معمول دار العلوم میں ختم کلام پاک کیا گیا ہے۔

ماہنامہ "النصیحۃ" چارسدہ پاکستان ماہ دسمبر ۱۹۸۵ء

مدیرِ دار العلوم کا انتقال

دیوبند۔ ۳۰ ر نومبر (جن ستا)

دار العلوم کے مدیر سید ازہر شاہ قیصر کا بدھ کی رات کو انتقال ہوگیا انھوں نے لگ بھگ ۴۰ برس دار العلوم کی ادارت کے فرائض انجام دئے ان کی عمر ۷۰ برس تھی

روزنامہ "جن ستا" ہندی

مدیر دار العلوم کا انتقال

دیوبند۔ یکم دسمبر ۸۵ء

یہاں مشہور اسلامی یونیورسٹی دار العلوم دیوبند کے ماہانہ رسالے دار العلوم کے مدیر مولانا سید ازہر شاہ قیصر کا انتقال ہوگیا وہ ۷۰ برس کے تھے انھوں نے تقریباً چالیس سال رسالہ دار العلوم کی ادارت کی۔

روزنامہ نوبھارت ٹائمز ہندی، نئی دہلی

دیوبند۔ ۴ر دسمبر ۱۹۸۵ء

ایک لمبی بیماری کے بعد مولانا سید ازہر شاہ قیصر (مشہور ادیب) کا انتقال ہوگیا۔ انھوں نے رسالہ دارالعلوم کے ذریعہ نمایاں خدمات انجام دے کر اپنے والد علامہ سید انور شاہ کشمیری رح کا نام روشن کیا۔ اخبار نویسوں نے ان کی روح کے سکون کے لئے دعائیں مانگیں۔

روزنامہ "ہندوستان" ہندی۔ نئی دہلی

دیوبند یکم دسمبر ۱۹۸۵ء

یہاں مشہور صحافی اور ادیب مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر کا انتقال ہوگیا انھوں نے ۷۰ برس کی عمر پائی اور اپنی زندگی میں ہزاروں مضامین لکھے۔

پندرہ روزہ دیوبند بلیٹین ہندی۔ دیوبند

دیوبند۔ یکم دسمبر ۱۹۸۵ء

یہاں سے شائع ہونے والے رسالے ماہنامہ "دارالعلوم" دیوبند کے ایڈیٹر مولانا سید ازہر شاہ قیصر کا انتقال ہوگیا۔ انھوں نے ۴۰ سال تک دارالعلوم کی ایڈیٹری کی۔ دارالعلوم جامع مسجد میں ایک تعزیتی جلسہ میں انھیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

روزنامہ "مظفر نگر بلیٹین" ہندی مظفر نگر

دیوبند ۴ر دسمبر ۱۹۸۵ء

شری قیصر کا انتقال ہوگیا وہ اردو کے ایک مشہور لکھنے والے تھے اور ایک لمبی مدت تک "دارالعلوم" دیوبند کے مدیر رہے۔ ان کی یاد میں ایک مشاعرہ کیا جا رہا ہے جس میں دیوبند اور بیرون دیوبند کے ممتاز شعراء حصہ لینگے۔

پندرہ روزہ "پکار تا بھارت" ہندی۔ دیوبند

آسمانِ صحافت کا ایک اور ستارہ ڈوب گیا

دیوبند سے یہ دلخراش خبر موصول ہوئی ہے کہ ہمارے مخلص دوست، ادیب کامل اور متبحر عالم مولانا ازہر شاہ قیصر نو ماہ کی طویل علالت کے بعد اپنا رخت سفر باندھ کر عالم عقبیٰ کو سدھار گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ باقی رہے نام اللہ کا، کیا خوب آدمی تھے وہ موحد خالص اور مومن کامل تھے فقہ وحدیث میں ان کے فرمودات سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے اعجاز بیان پر زمانۂ حاضر کے فصحاء وبلغاء تصدّق، اور طرز تحریر ادیبان سحر طراز انگشت بدنداں تھے۔ صحافت سے ان کی فطرت کو زمانۂ طفولیت سے لگاؤ تھا پہلے لاہور سے شائع ہونے والے "زمیندار" سے وابستہ رہے جہاں اپنے قلم کی گل کاریوں سے قارئین زمیندار سے داد پاتے رہے۔ پھر حالات نے پلٹا کھایا اور قضا وقدرت نے انھیں دیوبند پہنچا دیا۔ جہاں عرصۂ دراز تک ماہنامہ "دارالعلوم" کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے لیکن جب شام پیرانہ سالی جسم وجان پر محیط ہوگئی تو خانہ نشینی اختیار کرلی لیکن عزلت نشینی سے جب اکتاہٹ ہوتی تو اسے دُور کرنے کے لئے صفحۂ قرطاس پر مشق لوح وقلم فرماتے تھے اور غور وفکر کے گہرے ساگر سے ایسے ایسے تابدار موتی ڈھونڈھ کر لاتے تھے کہ دیکھنے والے حیران وششدر ہوکر سبحان اللہ اور جزاک اللہ کہہ کر ان کی قابلیت بے پایاں کا اعتراف کرتے تھے ——— مجھ میں اور مولانا ازہر شاہ قیصر مرحوم میں، جنھیں مرحوم تحریر کرتے کلیجہ منھ کو آتا ہے زبردست سیاسی اختلافات موجود تھے مگر ہم دونوں نے ان اختلافات کو باہمی دوستی کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہونے دیا وہ زاہد خشک اور پابند صوم وصلوٰۃ اور ادھر مجھ سا رند مشرب اور مذہب کے نام تک سے بیزار یہ دیکھ کر دوسروں کو حیرت ہوتی تھی کہ اس قدر بعد المشرقین کی موجودگی میں ہم دونوں میں رشتۂ ارتباط کیسے قائم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی عالی ظرفی اپنے سے اختلاف رائے رکھنے والوں سے بھی مروت کے ساتھ پیش آنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتی تھی۔ میں اس خیال پر ابھی تک سختی کے ساتھ قائم ہوں کہ برطانوی عہد حکومت میں مسلم عوام من حیث الجماعت تحریک آزادی سے بیگانۂ محض رہے۔ لیکن انھیں اس بات پر اصرار تھا کہ مسلمانوں نے بھی تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا ہے ہم دونوں نے بذریعہ اخبارات ایک دوسرے سے علانیہ اختلاف رائے کا اظہار کیا لیکن بایں ہمہ میرے دل میں خاندان انوری کے اس درخشندہ چراغ کا احترام ہمیشہ بدرجۂ اتم موجود رہا اور انھیں مجھ ناچیز کا ادب سدا ملحوظ خاطر رہا۔ اب مولانا ازہر شاہ قیصر روضۂ رضوان میں جاگزیں ہیں جس سے ہم ان کی صحبت فیض رساں سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے محروم ہوگئے ہیں۔ وہ جسمانی طور پر بھلے ہی ہم سے دور ہوگئے ہیں لیکن ان کی تراوش فکر نے اس دھرتی پر جو ادبی پیڑ پودے سجائے ہیں انکی خوشبو مشام جاں کو تا قیامت معطر کرتی رہیگی۔ ہماری دلی دعا ہے کہ غفور الرحیم ان کی مغفرت کرے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل کی قوت عطا فرمائے

ایک ہی قانونِ عالم گیر کے سب ہیں اسیر
رسمِ گُل کا باغ سے گلچیں کا دنیا سے سفر

ہفت روزہ "جنبش قلم" سہارنپور

مولانا سیّد ازہر شاہ قیصرؒ

جناب مولانا سید محمد ازہر شاہ صاحب جو تمام عمر کاغذ کے بے جان صفحات کو اپنے قلم کے لہو سے زندگی بخشتے رہے افسوس ہے کہ ۲۷ رنومبر ۱۹۸۵ء کو خاموشی کے ساتھ الفاظ کی طرح ہمیشہ کے اسی کاغذ کے صفحات پر سو گئے، جو ان کی ساری عمر کی کمائی اور ان کے افکار کی تاب و توانائی کا محور و مرکز تھے۔

مولانا سید ازہر شاہ صاحب اسی محدث عصر حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے فرزند جلیل تھے جن کے تجر علمی اور ژرف نگاہی کی دھاک تمام عالم اسلام پر قائم ہے۔ اور بلاشبہ انکی وجہ سے دار العلوم دیوبند کا درس حدیث پوری دنیا میں اپنا ایک خصوصی مقام اور ممتاز حیثیت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔

مولانا سید ازہر شاہ صاحب اردو کے لائق و فائق صحافی، بلند فکر ادیب اور صاحب طرز انشاء پرداز تھے ان کے قلم کی نوک نے پوری نصف صدی تک ادب و صحافت کے گیسوئے پریشاں کو سنوارا ہے اور ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے ان کے مضامین نے قومی، ملی، ادبی، صحافتی دنیا کو شعور و آگہی سے روشناس کیا ہے۔ ان کے مضامین کی کثرت کا اندازہ صرف اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ کسی زمانے میں ان کی چائے ان کے محض مسودوں کے اوراق سے پکتی تھی۔ اور وہ بلند سے بلند تر مضامین قلم برداشتہ لکھدیا کرتے تھے۔

آزادی کے بعد دیوبند کی خاک پاک نے صرف دو قد آور ادیب و صحافی کو جنم دیا ان میں ایک مولانا عامر عثمانی مرحوم اور دوسرے مولانا سید ازہر شاہ قیصر صاحب تھے، ان حضرات کے بعد اب دیوبند کی ادب و صحافت یتیم ہو گئی ہے اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ خلاء آئندہ پُر ہو سکے گا یا نہیں۔

پندرہ سولہ برس پہلے کی بات ہے جب میں نے قلم سنبھالنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ شاہ صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ رسالہ "دار العلوم" کے دفتر میں بے تکلف احباب کے درمیان گھرے بیٹھے تھے اور مسائل حاضرہ پر کبھی ایسی گل افشانی فرماتے کہ پوری محفل قہقہہ زار بن جاتی۔ اس وقت میں نے ڈرتے ڈرتے اپنا ایک مضمون پیش کیا۔ انھوں نے ایک نگاہ غلط انداز میں الٹ پلٹ کر دیکھا اور شائع ہونے والے مضامین کے فائل میں رکھوا دیا۔ مضمون کمیونزم اور اسلام پر تھا اور مجھے خود اس کے قابل اشاعت ہونے پر کچھ زیادہ اعتماد نہیں تھا۔ مگر وہ مضمون "دار العلوم" میں چھپا اور اس شان سے چھپا کہ اس پر شاہ صاحب کے ایک نوٹ نے مجھے اور میرے مضمون کو ذرے سے آفتاب بنا دیا۔ پھر اس کے بعد رسالہ دار العلوم کے لئے جو کچھ نظم و نثر میں لکھا وہ ضرور شائع ہوا۔ خیر میں شعبۂ ریسرچ علوم قرآنی کے سال، میں نے "اردو تراجم قرآن کا تقابلی مطالعہ" پر جو مقالہ لکھا اس کی ابتدائی چھ قسطیں ماہنامہ دار العلوم میں انھوں نے شائع کیں۔ پھر اپنی کتاب "یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ" پر مجھ سے مقدمہ لکھوایا۔ اسی کے ساتھ دیوبند ٹائمز کی ادارتی ذمہ داری پوری کرنے میں انھوں نے مجھے جو حوصلہ

اور سلیقہ بخشا اس سے احساس سے میرا رواں رواں آج بھی ان کا احسانمند ہے۔ حضرت شاہ صاحب مسلسل پندرہ برسوں تک دیوبند ٹائمز کو اپنی نگارشات سے مالا مال کرتے رہے۔ برسہا برس "سیاسی حاشیئے" لکھے اور اخیر تک مختلف موضوعات پر شاہ صاحب کی تحریریں دیوبند ٹائمز کے صفحات کی زینت بنتی رہیں وہ دیوبند ٹائمز سے وابستہ تمام حضرات سے عقیدت و محبت رکھتے تھے اور وہ تا حیات قائم رہی۔

حضرت شاہ صاحب نے آزادی کے بعد جن لوگوں کے ذوق ادب و صحافت کی آبیاری کی ان کی فہرست بے حد طویل ہے۔ افسوس ہے کہ قضیۂ دارالعلوم کے بعد ان کی شخصیت بجھ کر رہ گئی اور انھوں نے اپنی سادگی اور خلوص سے ایک آدھ مرتبہ سنبھالا لینے کی جو کوشش کی وہ دراصل بیمار غم کی آخری ہچکی تھی۔ دعا ہے حق تعالیٰ شانہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ خاص طور پر مولوی نسیم اختر شاہ قیصر کو حضرت شاہ صاحب کا جانشین بنائے۔ ادارہ دیوبند ٹائمز کو اس حادثہ پر جو صدمہ پہنچا ہے وہ ناقابل بیان ہے بس خدا ہی سے دعا ہے کہ وہ ہماری دستگیری فرمائے۔

پندرہ روزہ "دیوبند ٹائمز" دیوبند

تعبیر و صحافت کے ہر مرحلہ پر انکی یاد ستائیگی

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم ہم سے ایسے وقت میں جدا ہوئے جبکہ ان کی سخت ضرورت تھی حضرت مولانا سید ازہر شاہ قیصر مرحوم کی وفات ملکی اور ملی سانحہ کے علاوہ میرے لئے ایک ہولناک شخصی حادثہ ہے۔ کافی عرصہ سے ہمارے تعلقات اتنے گہرے وسیع اور پر خلوص تھے کہ ان کا بیان الفاظ کے قالب میں نہیں سما سکتا مولانا مرحوم نے عرصۂ دراز تک دینی اور قلمی جو خدمات انجام دیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ مرحوم نے دارالعلوم کے ایک مؤقر اور ذی رائے فرزند کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ غرضیکہ مولانا کی زندگی ہر اعتبار سے ناقابل فراموش ہے۔ آج دارالعلوم اور اس کے رفقاء اور باشندگانِ دیوبند اپنے جلیل القدر فرزند کی دائمی جدائی پر سوگوار ہیں۔ آج تحریر و خطابت کی محفلیں سونی ہیں آج تصنیف و تالیف کی مجلس پر سکوت طاری ہے لیکن اب یہ سوگواری نہ ہمارے حق میں کارآمد ہے اور نہ ان کے حق کے، آج وہ اس کے ضرورتمند ہیں کہ آپ ان عظیم خدمات کے صلہ میں اپنے اوپر ان کے حق کو پہچانیں اور اس کو ادا کریں وہ یہی ہے کہ ایصال ثواب کی کثرت کی جائے۔ انہی کلمات کے ساتھ مولانا مرحوم کے متعلقین اور اعزا کی خدمت میں شرکت غم کے ساتھ تعزیت مسنونہ پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ اس ہمدم دیرینہ غمگسار کی دائمی جدائی کا غم سہنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

ہفت روزہ "کاندھلہ ٹائمز" کاندھلہ ضلع مظفر نگر

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصرؒ

آپ کی وفات کی ولدوز اطلاع آپ کے صاحبزادے برادرم سید نسیم اختر شاہ کے گرامی نامہ سے ملی کہ مرحوم ۲۷ نومبر کی شام کو خالق حقیقی سے جا ملے انا للہ وانا الیہ راجعون

آپ علامۃ العصر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ پوری عمر دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں بسر کی اور ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کے مدیر رہے۔

سینکڑوں تحریریں آپ کے قلم سے نکلیں اور اصحاب ذوق سے داد تحسین پائی۔ لکھنے کا نہایت اچھا انداز رکھتے تھے۔ افسوس کہ ان کی وفات کے بعد ہم ایک معتدل دیندار صحافی سے محروم ہو گئے ہیں۔

خیرالمدارس میں ان کی وفات کی خبر نہایت غم سے سُنی گئی۔ ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانی کا اہتمام کیا گیا۔ اللہ تعالےٰ مرحوم کی مغفرت فرمائیں اور انھیں جنت کے بلند مقامات میں جگہ دیں۔ آمین۔

ماہنامہ "الخیر" ملتان (پاکستان)

وفیات

مولانا ازہر شاہ قیصرؒ

اتر پردیش اردو اکاڈمی جنرل کونسل کے ایک رکن مولانا ازہر شاہ قیصر بھی اس دیارفانی سے کوچ کر گئے۔ مولانا دارالعلوم دیوبند کے سابق استاد تھے اور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ علمی و ادبی کاموں میں صرف کیا۔

اتر پردیش اردو اکاڈمی خبرنامہ لکھنؤ

لہ اردو اکاڈمی کے ذمہ داران کی ناواقفیت پر سر پیٹ لینے کو دل چاہتا ہے۔ مولانا مرحوم اتر پردیش اردو اکاڈمی جنرل کونسل کے ایک رکن تھے اور ان کی ادبی صحافتی اور تحریری خدمات سے اس قدر لاعلمی اور بے خبری ہماری اردو اکاڈمی کا ہی ایک حصہ ہے جس کا کوئی جواب نہیں۔

مدیر

گہنا گیا ہے انس و محبت کا آفتاب

سید ازہر شاہ قیصر کی وفات حسرت آیات

تیرہ و تار تھی پہلے ہی یہاں شام حیات
دامن چرخ سے اک اور ستارا ٹوٹا

دیوبند کے آسمان علم وادب، تاریخ وصحافت کا آفتاب درخشاں، وضعداری وشرافت کا دلآویز نمونہ اکابر دار العلوم اور جماعت کے علوم ومعارف اور تاریخی حقائق کے امین ومبصر، ملک کے ممتاز دانشور صحافی، ملت کے غم خوار ودرمند فرد، شعروادب کی محفلوں کی شمع شبستاں، بڑوں کے نیازمند چھوٹوں کے مخلص ومشفق مربیّ، دوستوں کے غمگسار، ساتھیوں کے معاون ومددگار، خوش مزاج خوش اطوار، معصوم صفت سادگی کا مجسمہ اور غرور وتکبر سے کوسوں دور، اکابر دار العلوم کی صف اول، صف دوم، اور صف سوم کے فیضیافتہ، تہذیب وشائستگی، سادگی وانکسار کا پیکر، ابن الانور سید محمد ازہر شاہ قیصر، مدیر رسالہ دار العلوم ۲۷ر نومبر کو اس دار فانی سے رخصت ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کو بیماری کے کئی جھٹکے لگے۔ امراض کے کئی سخت حملوں کا انھوں نے مقابلہ کیا مگر ظاہری امراض کے علاوہ ایک تہہ نشین روگ، درد کسک، کرب بیچینی کی ایسی جانگداز روح فرسا اور دل ودماغ کو شکستہ، احساسات کو مجروح اور فکر وشعور کو مردہ کردینے والی اک کیفیت سے بھی ان کو دوچار ہونا پڑا تھا جو ان کا ذاتی قسم کا معاملہ نہ تھا بلکہ ملت اسلامیہ ہند، جماعت دیوبند اور خود شاہ صاحب کے بہت سے قدیم ومخلص اور چھوٹے بڑے رفقاء کا درد والم تھا۔ یہی ان کے لئے اک ایسا ناسور بن گیا تھا جس کا کوئی علاج نہ تھا جو کسی کو نظر نہیں آتا تھا جس کا احساس وادراک بھی ہر شخص نہیں کرسکتا تھا بلکہ وہی لوگ اس کو محسوس کرسکتے تھے جنکو خدائے بزرگ وبرتر نے فکرو احساس اور جذبہ کی تھوڑی بہت دولت سے نوازا ہے وہ درد وہ کسک، وہ سوزش، وہ زخم تھا جماعت دار العلوم، اکابر دار العلوم اور عظمت دار العلوم کے آفتاب درخشاں کا غروب ہوجانا، اس کا وقار، عظمت ورفعت اور نیک نامیوں کا مخالفت، جوڑ توڑ ہوس اقتدار، سیاسی بازیگروں کی بازی گری اور ظلم وجبر، قہر وستم کی بجلیوں کی زد پر آکر جھلس جانا وہ جماعت دیوبند اور وہ دار العلوم جس سے انکی وابستگی صرف ظاہری اور ضابطہ کی وابستگی نہ تھی بلکہ ان کے قلب وروح میں سمائی ہوئی اور فکر ووجدان میں بسی ہوئی تھی انھوں نے اس دادرہ میں اسکی علم ریز اور حکمت بیز فضاؤں میں اور علم وشریعت سے بھرپور ماحول میں آنکھ کھولی۔ بچپن کا نکھار اور جوانی کی بہاریں اسکی

ندر اور ہر صلاحیت اس کے لئے وقف کی تھی اور انقلابی حوادث کے بہت سے طوفانوں کی بلاخیز موجوں اور بربول تھپیڑوں کا ہمت، بہادری اور جواں مردی کے ساتھ مقابلہ کیا تھا۔ اپنا خون دل و جگر اس پر صرف کیا تھا۔ وہ علم و روحانیت کا آفتاب درخشاں اب انکی نگاہوں کے سامنے گہنا گیا تھا اسکی تابناکیاں، ظلمتوں کے مہیب سایوں کی لپیٹ میں آچکی تھیں۔ اس شبستان علم و شریعت کے بہت سے جاں نثار پروانے اس کے فراق کی ہلاکت خیز و درد انگیز کیفیت اور ابتلا و آزمائش کی ناقابل بیان زہرناک اور حسرت آمیز حالتوں سے دوچار تھے اور تاریخ کی سب سے بڑی سب سے شرمناک ڈھٹائی سفاکی اور غارت گری کا شکار تھے۔

یہی تھا شاہ صاحب کا درد، یہی تھا ان کا مرض یہی تھا ان کا داخلی کرب یہی تھا ان کے احساس فکر و شعور اور قلب و روح کا سب سے بڑا زخم، وہ ناسور جو ان کو گھلا رہا تھا، اندر اندر ختم کر رہا تھا، ان کی شمع حیات کو پگھلا رہا تھا اور انکی شگفتہ مزاجی، بذلہ سنجی اور خوش فکری کو آنسوؤں کے سیل رواں کی شکل دے رہا تھا۔ اب شاہ صاحب تھے اور دل کا درد، روح کی بے چینی، شعور کی جراحتیں اور احساس کے زخم۔ شاہ صاحب کے چہیتے شاعر مخلص دوست، ملت کے حساس و درد مند فرد الحاج جگر مرادآبادی کی زبان میں کیفیت یہ تھی

دل کی جراحتوں سے رکھے ہیں چمن چمن
اور اس کا نام فصل بہاراں ہے آج کل

شاہ صاحب کی وفات ایک فرد ایک شخص اور ایک ذات کی موت نہیں ہے بلکہ ایک چمکتے دمکتے روشن اور ادبی صحافتی دور کی موت ہے۔ ہماری تاریخ ملی کے وہ باب ہی اب بند ہوئے جا رہے ہیں جن کے مطالعہ سے پڑھنے والوں کو فکر و شعور کی روشنی عزم و عمل کی حرارت و قوت نصیب ہوتی تھی۔

بلاشک و شبہ شاہ صاحب دیوبند کے اہل قلم و ارباب صحافت اور تاریخ و ادب کے اس گرانمایہ قافلہ کے روشن ستون اور قیمتی یادگار تھے جو ہند و پاکستان کے صف اول کے اہل ادب و صحافت تسلیم کئے گئے ہیں جنمیں سید امتیاز علی تاج، مورخ اسلام سید محبوب رضوی، جناب مخمور عثمانی، مولانا انور صابری، علامہ حامد الانصاری غازی جیسے بلند مرتبہ حضرات سر فہرست نظر آتے ہیں اسی قافلہ ادب و صحافت کے گنے چنے دو ایک ستارے اخر شب افق پر اپنی آخری چمک دکھا رہے ہیں اور ہند و پاکستان کے ادبی و صحافتی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر رہے ہیں۔

شاہ صاحب کی وفات کئی حیثیتوں کئی پہلوؤں سے نقصان عظیم ہے۔ ادارۂ ندائے دارالعلوم سے وابستہ سب ہی افراد ان کے نیاز مند رہے ہیں اور ان کی شفقتوں، عنایتوں اور ادب و صحافت کے میدان میں ان کی گراں قدر و بیش بہا حوصلہ افزائیوں اور قیمتی مشوروں سے مستفیض ہوتے رہے ہیں۔

آج یہ ناچیز قلم، یہ دل و دماغ اور روح اس عظیم صحافی، خوش مزاج انسان، خورد نوازی کے اس پیکر جمیل کو بھیگی ہوئی آنکھوں، دکھے دل اور گہرے جذبات الم کے ساتھ خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بارگاہ رب قدیر و کارساز میں دست بدعا ہے کہ بار الٰہ تری شان رحمت و مغفرت عظیم ہے ہم گنہ گار و خطاکار بندوں کی التجا سن لے اور اپنی شان رحیمی کے صدقے میں سید ازہر شاہ قیصر کی بال بال مغفرت فرمادے انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرما اور ان کے تمام پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرما۔ آمین۔

پندرہ روزہ "ندائے دارالعلوم" دیوبند
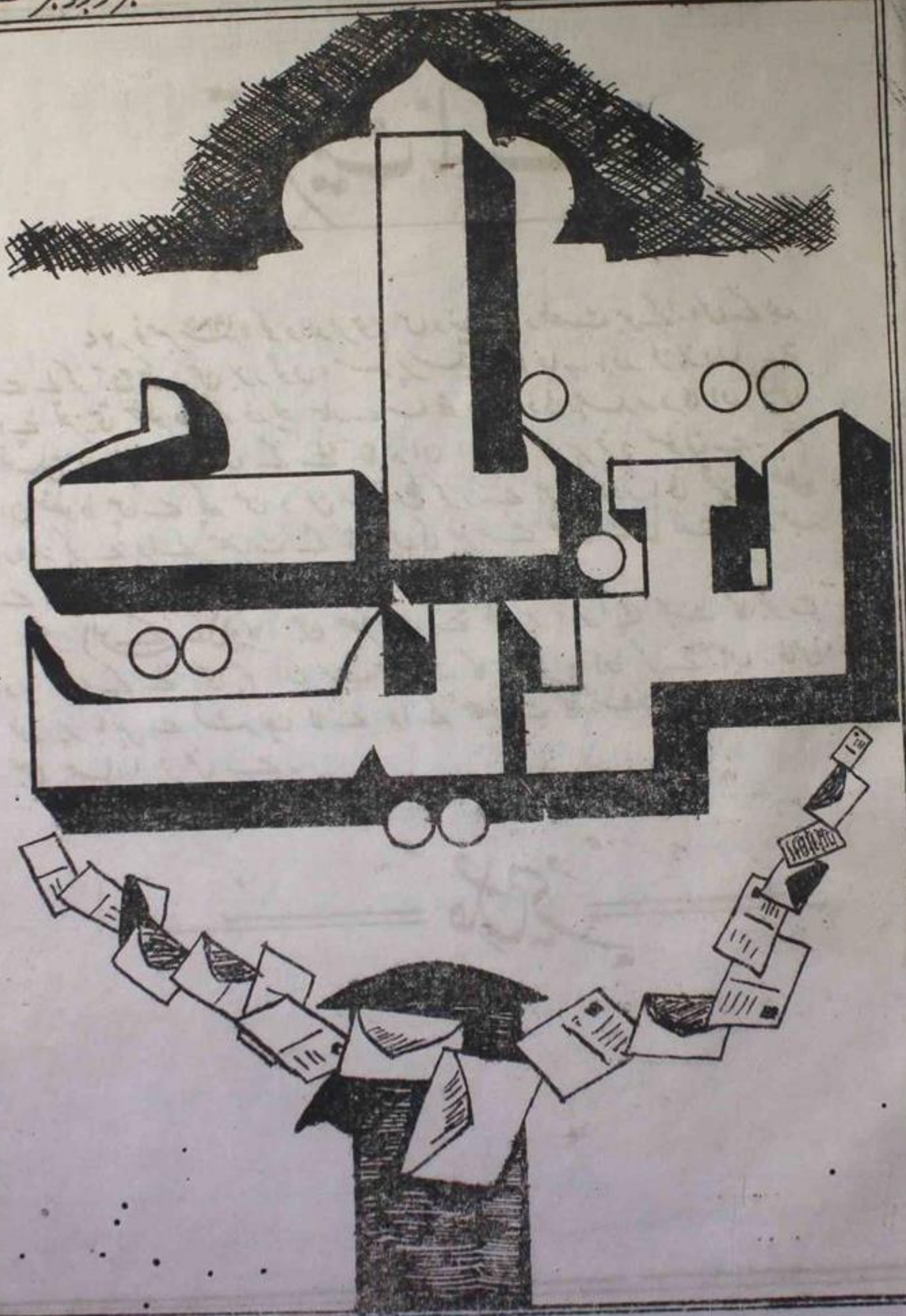
تعزیت نامے

۲۷ نومبر ۱۹۸۵ء کو والد مرحوم اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس کے بعد سے لے کر آج تک جن بزرگوں، سرپرستوں، احباب اور عزیزوں نے اپنے تعزیتی خطوط کے ذریعہ ہمارے ساتھ اپنی دلی ہمدردی کا اور قلبی تعلق کا اظہار کیا اس کے لئے خاندانِ انوری کا ہر فرد ممنون ہے۔ ہم ان خطوط میں سے کچھ من وعن شائع کر رہے ہیں۔ اور باقی تعزیتی خطوط روانہ کرنے والے حضرات کے ناموں کی فہرست صفحات کی قلت کی وجہ سے پیش کی جا رہی ہے۔

اس کے علاوہ جن حضرات نے گھر پر آکر اپنی محبت کا ثبوت دیا اس کے لئے بھی ہم ان سب حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ خاص طور پر باہر سے تشریف لانے والے حضرات کا شکریہ ادا کرنا بھی ہمارا فرض ہے۔

حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب مسعودی[1]
شیخ الحدیث دار العلوم (وقف) دیوبند کا

عزیزان اطہر و راحت و صبیحہ و نسیم و وجاہت سلمہم اللہ

ادعیۂ وافرہ۔ کئی روز سے مسلسل ٹیلی فون کر رہا تھا لیکن کوئی رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ جمعہ کے روز فون پر منور صاحب سے اچانک بھائی مرحوم کے سانحہ کی دلدوز اطلاع ملی پھر اگلے دن مظفر اور انیس سے مزید تفصیلات معلوم ہوئیں۔ سانحہ اگرچہ غیر متوقع نہیں۔ مرحوم کی طویل علالت اور بار بار خوفناک علالت سے خیال ہوتا کہ یہ آخری بیماری ہے۔ بڑی بیماری اور زحمت اٹھائی۔ خدا تعالے ان کو غریق رحمت فرمائے اور تم سب کو صبر جمیل کی توفیق ہو۔

انھیں والد مرحوم کی محبت فطری حاصل تھی اور ہمیشہ اباجی کے نام و کام کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتے۔ خدا تعالیٰ اس محبت اور محنت کو ان کا ذخیرۂ آخرت فرمائے۔

یہاں کئی مدارس میں ختم قرآن شریف ہوئے اور برابر ایصال ثواب و دعاء مغفرت کی جارہی ہے۔ آج یہاں کے اخبارات میں بھی خبر وفات شائع کرادی ہے اور امید ہے کہ تم سب بھی اہتمام ایصال ثواب کر رہے ہوگے۔ اب ان کے لئے یہی چیز کارآمد ہے۔

میری طرف سے سبکو سلام و دعا اور کلمات تعزیت پہونچا دینا۔

والسلام

انظر شاہ مسعودی

---

[1] عم محترم اس حادثہ کے وقت پاکستان میں تھے۔ وہیں سے آپ نے یہ تعزیتی خط روانہ فرمایا تھا۔

حضرت مولانا محمد اکرم صاحب چکوال
(پاکستان)

سلامت باشید

عزیزم نسیم اختر شاہ صاحب۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے والدِ گرامی کی وفات حسرت آیات کا دلی دکھ ہوا۔ غائبانہ دوستی میں آپ کے دادا جان مرحوم کی عظمت کا اثر بھی تھا اور آپ کے خاندان سے تعلقات کو میں باعث فخر جانتا ہوں۔ امید رکھتا ہوں کہ آپ اس رشتہ کو ضرور قائم رکھیں گے۔ فی الحال عمرہ کے لئے جانا ہے اور انشاءاللہ واپسی پر یہ کوشش کرونگا کہ دیوبند حاضر ہو سکوں۔ حضرت کی وفات حسرت آیات "المرشد" میں شائع کرکے جملہ احباب و متوسلین سے دعا کی درخواست کروں گا۔ خود بھی دعاگو ہوں۔

حضرت مولانا سعید بزرگ صاحب
مہتمم جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل سملک
ضلع بلساڑ (گجرات)

عزیز گرامی قدر مولوی نسیم اختر شاہ صاحب۔ زیدت مکارمکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل ہی جناب عزیز الرحمٰن صاحب کا تب کے نام دیوبند سے آئے ہوئے ایک خط سے یہ معلوم ہوکر بڑا رنج ہوا کہ والد محترم جناب ازہر شاہ صاحب دار فانی سے دار البقاء کی طرف رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرماکر اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ان کی قبر کو منور فرمائے۔ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام پر فائز فرمائے اور آپ، والدہ صاحبہ اور دیگر اہل خانہ کو صبر جمیل و اجر عظیم عطا فرمائے۔

مرحوم کے لئے کل ہی شام آخری گھنٹہ میں تمام طلبہ و اساتذہ نے قرآن خوانی کی اور ایصال ثواب و دعائے مغفرت کی گئی۔

میری طرف سے اپنی والدہ صاحبہ کی خدمت میں سلام مسنون اور تعزیت کا مضمون پیش فرمادیں۔ آپ بھی والد محترم کی طرح تعلقات باقی رکھیں۔ ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو تحریر فرمائیں اور اپنی دعاؤں میں یاد فرمائیں۔

جناب مولانا قاضی زین العابدین صاحب میرٹھ بنام برادر مولانا انظر شاہ صاحب

محب مکرم و محترم۔　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج سامی بخیر۔ کل کے اخبار "مشرقی آواز" سے برادر مکرم مولانا ازہر شاہ صاحب قیصر کی خبر وفات حسرت آیات معلوم ہوئی۔ دل رنج و غم میں ڈوب گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم ذاتی طور پر میرے قدیم مخلص دوستوں میں سے تھے اور حضرت خاتم المحدثین شاہ صاحبؒ کے تعلق سے اس محبت نے خلت کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔

اپنے فضائل کے اعتبار سے وہ ایک ممتاز صاحب قلم اور وسیع النظر صحافی اور ادیب تھے۔ انھوں نے رسالہ دار العلوم کی مسند ادارت سے برسہا برس دار العلوم کی ترجمانی کی اور تشنگان علم و دین کو اپنے افادات سلیمہ و مقالات بہیہ سے سیراب کیا ان کی مغفرت کے لئے انشاء اللہ یہی کافی ہے رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ کاملۃ شاملۃ۔ آپ کے برادر بزرگ ہونے کی حیثیت سے وہ آپ کے لئے بڑا سہارا تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم و مغفور کو اپنے جوار رحمت میں مقام کرامت عطا فرمائے اور آپ کو اور مرحوم کے فرزندوں اور متعلقین کو صبر و استقامت سے نوازے۔ مجھے اس حادثہ فاجعہ میں اپنا شریک غم تصور فرمائیں۔

مرحوم و مغفور کے فرزندوں سے واقفیت نہیں ہے۔ ان کو بھی میرا پیام تعزیت پہنچا دیں۔ میں بفضلہ تعالیٰ فی الجملہ بعافیت ہوں۔ الحمد للہ فرائض ادا کر لیتا ہوں۔ دوا جاری ہے۔ دعاؤں کا بے حد محتاج ہوں دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ بقیہ زندگی خیرات وطاعات میں گزارنے کی توفیق دے اور جب وقت موعود آئے تو خاتمہ ایمان پر ہو۔ وفقنا اللہ وایاکم للخیرات والطاعات واکرمنا بدخول الجنات بوسیلۃ سید الموجودات علیہ الصلوت والتحیات۔

والسلام

جناب مولانا واجد حسین صاحب (ڈابھیل)

عزیز محترم جناب مولانا نسیم صاحب۔　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

پرسوں کاتب عزیز الرحمن صاحب کے گھر سے ایک خط موصول ہوا اس سے سے معلوم ہوا کہ جناب قبلہ محترم والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ سنکر بڑا صدمہ ہوا خداوند کریم سے دعا ہے کہ وہ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دیکر ہر قسم کی نعمتوں سے نوازے۔ آمین ثم آمین۔ والدہ محترمہ سے میری طرف سے تعزیت فرما دیجئے یہاں پر مدرسہ کی طرف سے ایصال ثواب کرا دیا گیا ہے۔

عالی جناب غلام محمد شاہ صاحب سابق وزیر اعلیٰ ریاست جموں و کشمیر

مکرمی !

السلام علیکم !

آپ کے بھیجے ہوئے پوسٹ کارڈ سے آپ کے والدِ محترم کی رحلت کی خبر موصول ہوئی ۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور آپ کو اور دیگر اہل خانہ کو یہ صدمہ برداشت کرنے کی قوت بخشے ۔ آمین

مخلص

(غلام محمد شاہ)

جناب مولانا سعید الاعظمی صاحب مکتبہ فردوس مکارم نگر لکھنؤ

محب گرامی جناب مولانا نسیم اختر شاہ صاحب زاد مجدکم السامی ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ مزاج گرامی

ابھی اخبار سے والد معظم مولانا ازہر شاہ صاحب قیصر کے سانحۂ ارتحال کی خبر معلوم ہوئی ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ میں تو بالکل حیران ہوگیا اس لئے کہ ان کے خطوط برابر آتے رہے اور قطعاً کوئی ایسی بات نہیں سمجھ میں آرہی تھی کہ اتنی جلدی ساتھ چھوٹ جائیگا مگر اللہ تعالیٰ کی مرضی کے سامنے کوئی کیا کرسکتا ہے ۔ میں نے چند دن قبل ہی ان کی خدمت میں آپکی معرفت خط لکھا تھا معلوم نہیں وہ خط پہنچا بھی یا نہیں ۔ اللہ تعالیٰ آپکی والدہ صاحبہ مدظلہا اور تمام بہنوں اور بھائیوں کو صبر واستقامت عطا فرمائیں اور آپ لوگوں کو مرحوم کی مغفرت اور رحمتوں کا ذریعہ بنائیں آمین ۔

مولانا مرحوم سے میرے دیرینہ تعلقات تھے ۔ سنہ ۵۳ء میں بعض مضامین کے سلسلہ میں خط و کتابت ہوا کرتی تھی جو دارالعلوم میں بعد میں شائع بھی ہوئے تھے پھر دیوبند میں بارہا شرفِ لقاو نیاز حاصل رہا اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات کو بلند فرمائے اور انکے ساتھ اپنی عفو و رحمت کا بہتر سے بہتر معاملہ فرمائیں اور جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام میں جگہ مرحمت فرمائیں ۔ آمین ۔ وہ خود بھی ایک بڑے عالم ، دانشور ، مفکر اور ادیب شخص تھے پھر نسبت پدری کو کیا کہنا ۔ اللہ تعالیٰ کا یہ محض فضل و انعام ہر شخص کو یہ نسبتِ بلند نہیں ملتا ۔ امید ہیکہ آپ حضرات اس عالی نسبت کو مزید عزت و بلندی عطا فرمائیں گے اور دنیا میں پھیلے ہوئے ہزار ہا ہزار عقیدتمندوں کی عقیدت اور محبت کو مزید استوار کرینگے انشاءاللہ تعالیٰ ۔ میری طرف سے والدہ محترمہ کی خدمت میں بہت بہت تعزیت مسنونہ پیش فرمائیں اور سلام و درخواست دعا عرض کردیں نیز تمام اہل خاندان اور مولانا سید انظر شاہ صاحب مدظلہ کی خدمت میں مؤدبانہ سلام اور تعزیت مسنونہ پیش فرما کر ممنون کریں ۔ خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہو ۔ والسلام

سعید الاعظمی

میر واعظ مولانا محمد فاروق صاحب کا تعزیتی ٹیلی گرام

مولانا ازہر شاہ قیصر کی وفات کا صدمہ ہوا
مرحوم کی مغفرت اور آپ کے لئے صبر کی دعا کرتا ہوں۔
محمد فاروق

مولانا سید احمد ہاشمی صاحب (ممبر پارلیمنٹ) دہلی

مکرمی گرامی قدر جناب مولانا انظر شاہ صاحب زید مجدکم
سلام مسنون۔ مزاج گرامی!

عزیز محترم جناب مولانا ازہر شاہ قیصر کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مجھے دیر سے اطلاع ملی اور پھر اسفار میں چلا گیا، کل لوٹنا ہوا۔

اللہ مرحوم کی مغفرت کرے ——— زمانۂ طالب علمی میں اور اس کے بعد بھی اب تک مرحوم سے برابر تعلق خاطر رہا اور ہمیشہ مرحوم کے جذبۂ اخلاص کا میں قدرداں رہا۔ مرنجاں مرنج، وضعدار، اور اپنے مزاج کے اعتبار سے بہت ہی بردبار۔ اللہ غریق رحمت کرے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان کے پسماندگان میں آپ کے علاوہ ان کے کتنے بچے ہیں۔ میری طرف سے جملہ پسماندگان کو تعزیت پہنچا دیجئے۔ مرحوم کے لئے دعار مغفرت کے ساتھ۔ سید احمد ہاشمی

مولانا اسحاق صاحب سنبھلی (سابق ممبر پارلیمنٹ)

عزیزم سلمہ　　السلام علیکم۔

آپ کا اخبار ملا۔ اس سے پہلے اخبارات کے ذریعہ میں اپنے محترم محب اور مشفق برادر محترم قیصر صاحب کی وفات کی خبر پڑھ چکا تھا۔ ابھی قوم وملت کو ان کی فکر، بے باکانہ تحریروں اور نظریات کی سخت ضرورت تھی مگر افسوس ہے کہ ملت کے دیگر ناقابل تلافی نقصانوں کی طرح مرحوم کی وفات بھی شدید حادثہ ہے اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو بلند درجات سے نوازیں اور آپ و ہزاروں بلکہ لاکھوں سوگواروں کو صبر جمیل عطا فرمائیں۔ آمین۔ اخبار کے لئے مکرر شکریہ۔

آپ کا مخلص۔　اسحاق سنبھلی

بیگم شیخ محمد عبداللہ و ڈاکٹر فاروق عبداللہ کا اظہارِ تعزیت

جناب سید نسیم اختر شاہ قیصر

آپ کے خط کے ذریعہ مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر کی وفات کی خبر موصول ہوئی۔ خدا آپ کو صبر دے اور مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ حضرت شاہ صاحب علامہ سید انور شاہ کشمیری رحمہ جیسی نادرۂ روزگار ہستی کے فرزند تھے اور انھوں نے اپنے والد کا جس طرح نام روشن کیا وہ لائق ستائش ہے۔ والد صاحب مرحوم (شیخ محمد عبداللہ) سے مولانا مرحوم کا جو تعلق رہا اس کی نسبت سے آپ کے غم میں ہم لوگ برابر کے شریک ہیں۔

والسلام

بیگم شیخ محمد عبداللہ و ڈاکٹر فاروق عبداللہ۔

حضرت مولانا سمیع الحق صاحب، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور (پاکستان)

مکرمی و محترم المقام زید مجدکم

سلام مسنون! امید کہ مزاج بالخیر ہونگے۔

حضرت مولانا ازہر شاہ قیصر کی وفات حسرت آیات کی خبر سے حد درجہ رنج و قلق ہوا۔ مرحوم بہت بڑے عالم، ادیب مؤرخ اور اسلام کے سچے خادم تھے۔ ان کی ساری زندگی علوم نبوت کی اشاعت اور اسلامی تعلیمات کی تبلیغ میں صرف ہوئی ان کی تحریریں اور ان کی تصنیفات ملی روایات کے تحفظ اور اسلام کے احیاء کی آئینہ دار تھیں۔ مرحوم کو دارالعلوم حقانیہ ادارہ الحق اور خود ہمارے ساتھ بہت قریبی اور برادرانہ تعلق تھا بھائیوں کی طرح وہ ہمارے حالات میں دلچسپی لیتے۔

دارالعلوم حقانیہ میں مرحوم کی وفات کی خبر بڑے رنج و غم سے سنی گئی۔ دارالحدیث اور دارالحفظ میں اساتذہ و طلبہ نے ایصال ثواب کیا اور مرحوم کی مغفرت کی دعائیں کیں۔ مرحوم کے علمی و دینی اور روحانی خدمات ان کے لئے بہت بڑا صدقہ جاریہ ہیں۔ اور تاریخ کا ایک روشن باب ہیں جو آنے والی نسل اور ملت کے اتحاد و احیاء کا کام کرنے والوں کیلئے نشان راہ ثابت ہونگے۔ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ سے بھی فرداً فرداً تمام اہل خاندان احباب و متعلقین اور اعزہ سے تعزیت عرض ہے۔ ہماری دعا ہے کہ باری تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل اور اجر عظیم سے نوازے۔ والسلام۔

سمیع الحق

اکوڑہ خٹک پشاور

حضرت مولانا سید محمد گوہر شاہ صاحب دامت برکاتہم دار العلوم اسلامیہ چارسدہ پشاور (پاکستان)

محترم المقام سلمکم الرحمٰن جناب مولانا محمد اختر شاہ قیصر صاحب زید مجدکم

السلام علیکم خدا کرے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوں۔ آپ کا والا نامہ ملا پڑھ کر از حد افسوس ہوا کہ حضرت شاہ صاحب وفات پا چکے ہیں۔ خط ملتے ہی ہم نے دار الحدیث میں اطلاع کرائی اور دعائیں ہوئیں۔ ایصال ثواب قرآن خوانی ہوئی اللہ تعالیٰ حضرت شاہ صاحب کو بلند درجات سے نوازدیں اور آپ حضرات کو صبر جمیل سے نوازدیں۔

ہم اس اندوہناک غم میں آپ حضرات کے برابر کے شریک ہیں۔ میری طرف سے اور ادارے کے تمام اراکین کی طرف سے تعزیت منظور فرماویں اللهم اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه وارض عنه وارضه عنه واکرم نزله ووسع مدخله وادخله الجنة اللهم لا تحرمنا اجره ولا تفتنا بعده وصلى الله تعالىٰ على خير خلقه محمد وآله واصحابه اجمعين آمين

حضرت شاہ صاحبؒ کا مکتوب گرامی ربیع الاول کے شمارے میں شائع ہونے والا ہے جس میں انھوں نے ماہنامہ "النصیحۃ" کے بارے میں رائے گرامی تحریر فرمائی تھی۔ ماہنامہ طیب اب تک نہیں پہنچا۔

والسلام آپ کا مخلص، سید محمد گوہر شاہ

حضرت مولانا عبد الکریم صاحب دامت برکاتہم مدرسہ عربی نجم المدارس کلاچی ڈیرہ اسماعیل خاں (پاکستان)

مکرمی جناب مولانا نسیم اختر شاہ صاحب سلمہ ربہ وعافاہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ غم نامہ ملا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون فلله ما اخذ وله ما اعطىٰ وكل شئ عنده باجل مسمى فلتصبر ولتحتسب فان المصاب من حرم الثواب۔ اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کی بال بال مغفرت فرماویں۔ درجات رفیعہ نصیب ہوں اور اپنے آباء کرام کی رفاقت سے مشرف رہیں اور اسی کی رحمت خداوندی سے امید ہے قال تعالیٰ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ۔

علامۃ العصر سید انور شاہ صاحب قدس سرہ کی قوت ایمانی سے یہی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی ذریت کو اپنے پاس کھینچ ہی لیں گے ۔۔۔ نجم المدارس میں ایصال ثواب کا اہتمام کیا جارہا ہے والقبول من اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو صبر واستقامت اور ہمت وثقاہت سے کام لینا چاہیئے کہ اس کے سوا پریشانیوں کا کوئی علاج نہیں۔

والسلام ناکارہ عبد الکریم

مولانا سید محمد کفیل بخاری (پاکستان، ملتان)

مدرسہ معمورہ ۔ دار بنی ہاشم مہربان کالونی ۔ ملتان

گرامی منزلت نسیم اختر شاہ صاحب ۔ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا ۔ حضرت کی اچانک وفات کی خبر سن کر دلی صدمہ ہوا ۔ ہم لوگ ساہیوال میں مولانا حبیب اللہ فاضل رشیدی رح کے جنازہ میں شرکت کے لئے تیار تھے کہ یہ افسوسناک خبر ملی ۔ نسیم بھائی! موت سے کس کو رستگاری ہے ۔ بہرحال انسانی زندگی میں اس سے بڑا صدمہ اور کوئی نہیں ہوتا اور پھر انسانی تعلق کی نسبت سے صدمہ بھی شدید ہوجاتا ہے ۔ رسمی الفاظ لکھنے سے تعزیت تو ہوجاتی ہے مگر جانے والا نہیں لوٹتا ۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے علم و ادب کے محاذ پر جس انداز سے دین کی خدمت کی ہے وہ ان کی نجات کے لئے کافی ہے ۔ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ صدقۂ جاریہ ہے ۔ اللہ پاک ان کے درجات بلند فرمائے اور مغفرت فرمائے (آمین) ہم سب افراد خاندان امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے تعزیت قبول فرمائیں ۔ حضرت جانشین امیر شریعت مولانا سید ابو معاویہ ابو ذر بخاری مدظلہ کل تو بہت ہی مغموم تھے اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بہت یاد فرمایا ۔ فرما رہے تھے کہ سنہ ۱۹۳۰ سنہ ۱۹۳۱ء میں لدھیانہ میں مولانا حبیب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ملاقات ہوئی تھی پھر حسرت ہی رہی اور آج ملاقات کی آرزو بھی ختم ہوگئی ۔

حضرت مولانا سید عطاء المحسن شاہ صاحب ۹ نومبر کو برطانیہ چلے گئے تھے ۔ ابھی تک واپس تشریف نہیں لائے انھیں وہیں خط لکھدونگا ۔ آخر میں ایک بار پھر تعزیت کرتا ہوں ۔ مدرسہ معمورہ میں حضرت کے ایصال ثواب کے لئے انشاء اللہ آج ختم قرآن ہوگا ان کی روح کو اسی سے سکون اور راحت میسر آئے گی ۔ تمام اہل خانہ اور احباب سے سلام اور تعزیت ۔ والسلام

حضرت مولانا قاضی زاہد الحسینی صاحب (پاکستان)

محترم المقام حضرت شاہ صاحب زید مجدکم سلام مسنون

ملکی اخبارات سے گرامی قدر برادر عزیز حضرت مولانا محمد ازہر شاہ صاحب قیصر کی رحلت کا علم ہوکر افسوس ہوا ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرما کر پسماندگان کو صبر جمیل سے نواز دے ۔ آمین ۔

مرحوم کے ساتھ اس گناہ گار کا تعلق ڈابھیل کے قیام کے زمانہ سے تھا جبکہ احقر وہاں زیر تعلیم تھا اور یہ سال محدث کبیر حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ العزیز کا وہاں آخری سال تھا ۔ قیام دیوبند کے دوران بھی احقر کے ساتھ ان کا مشفقانہ برتاؤ ہمیشہ رہا ۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمادیں اور اس خاندان کو علمی اور روحانی برکات سے مالامال فرمائے ۔ آمین ۔ والسلام

مخلص دعاگو :- قاضی محمد زاہد الحسینی غفرلہ

محترم حکیم محمد شریف صاحب جگرانوی زبدۃ الحکماء عزیزیہ دواخانہ صدر لاہور چھاؤنی (پاکستان)

مکرمی جناب شاہ صاحب۔ السلام علیکم

گذارش کہ قبلہ محترم شاہ صاحب کے انتقال پرملال کا پیغام ملا۔ بے حد جناب افسوس ہوا۔ سفر کا بندوبست نہیں ہوا ورنہ حاضر ہو کر تعزیت کرتا۔ کوشش کر رہا ہوں انشاء اللہ جب بھی انتظام ہوا حاضر ہو جاؤنگا۔ قبلہ والد صاحب کو خداوند کریم اپنے جوار رحمت میں جگہ دیں۔ آمین۔ والدہ صاحبہ کو سلام۔ میرے لئے کوئی خدمت ہو تو ضرور آگاہ کریں۔

سوگوار حکیم محمد شریف

جناب بختیار علی صاحب لاہور

گرامی القدر المحترم جناب حضرت مولانا نسیم اختر شاہ صاحب مدظلہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مزاج شریف آپ کا گرامی نامہ ملا۔ محترم والد صاحب جناب حضرت مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر صاحبؒ کے وصال کا پڑھ کر بہت دلی صدمہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جوار رحمت میں جگہ نصیب فرمائیں درجات کو بلند فرمائیں اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائیں۔

حضرت کے تشریف لے جانے پر ہم سب کا نقصان عظیم ہوا ہے اور ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جو کہ پر نہیں ہو سکتا ہم آپ کے غم میں پورے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر و استقلال سے یہ غم و صدمہ برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

آپ کی والدہ محترمہ کو سلام مسنون۔

والسلام
بختیار علی

جناب رضی الدین احمد القاسمی سوڈیوال کالونی

ملتان روڈ لاہور، پاکستان

عزیز القدر عزیزم نسیم اختر شاہ قیصر سلمہ اللہ تعالیٰ

سلام مسنون و دعوات

عزیزم میں عرصہ سے برادر محترمؒ کو خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ حضرت کا شکریہ کا خط "کلیات عظامیؒ" ملنے پر آیا اس کے بعد ماہنامہ طیب کے دو پرچے ایک ساتھ ملے تو پھر شکریہ کا خط لکھنے کا ارادہ کیا۔ لیکن افسوس کہ میں انکو زندگی میں جواب نہ لکھ سکا جس کا قلق تا زیست رہے گا۔ حضرت سے ملاقات صرف ایک مرتبہ دسمبر ۱۹۵۶ء میں ہوئی اور اس کے بعد نہ میں خط لکھ سکا نہ انکا کوئی نوازش نامہ ملا۔ اب ایک عرصہ دراز کے بعد ان کا ایک نوازش نامہ وہ بھی غالباً آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ملا لیکن یہ بد نصیب جواب نہ لکھ سکا۔ افسوس صد افسوس۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

آج ماہنامہ طیب کا پرچہ ملا تو رنج و غم کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا میری اہلیہ اور بچوں کو بھی اس جانکاہ خبر سے بے اندازہ صدمہ ہوا۔ اللہ کریم حضرت کے درجات بلند فرمائے اور آپ سب کو یہ صدمہ عظیم برداشت کرنے کی ہمت مرحمت فرمائے آمین ثم آمین۔ زیادہ لکھنے کی ہمت نہیں امید ہے آپ گاہے گاہے اپنی اور اہل خانہ کی خیریت سے مطلع کرتے رہیں گے۔

والسلام الراقم شریک غم۔ ابن العظامیؒ رضی الدین احمد

مولانا محمد مسعود شمیم صاحب، مہتمم دارالعلوم حرم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ

برادر عزیز نسیم اختر شاہ قیصر سلمہ
سلام مسنون۔ کل آپ کا ۵ ردسمبر کا خط ملا جس سے اپنے بیحد عزیز اور کرمفرما بھائی ازہر شاہ قیصر صاحب کے اچانک انتقال پرملال کی اندوہناک اطلاع سے بیحد افسوس ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو آخرت کے اعلیٰ مدارج ومقامات سے نوازے اور آپ سبکو اطمینان قلب اور صبر جمیل عطا کرے آمین۔ والدۂ محترمہ کو سلام مسنون اور مضمون واحد۔ اب والدہ کا بیحد خیال رکھیں۔ اور ان کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھنے کی کوشش کریں کہ اب ان کی خدمت اور دعائیں اصل سرمایہ ہیں۔ انشاء اللہ یہاں حرم پاک میں مرحوم کی طرف سے طواف اور ایصال ثواب کا انتظام شب جمعہ کو ہو جائیگا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے کہ انھوں نے تمام عمر خدمت دین میں گذاری تمام عزیزوں کو سلام ودعا اور تعزیت۔ والسلام
محمد مسعود شمیم عفی عنہ۔ مکہ معظمہ

جناب ڈاکٹر خاور ہاشمی صاحب دہلی

برادر گرامی نسیم اختر شاہ صاحب
ابھی قومی آواز میں ایک انتہائی اندوہناک خبر نظر سے گذری، مولانا ازہر شاہ صاحب قیصر رحلت فرما گئے۔ یہ محسوس ہوا کہ گویا اپنا قریب ترین عزیز ومشفق ومہربان اٹھ گیا ہو۔ میرے دل میں مولانا سے ملاقات کی خواہش باقی رہ گئی۔ آپ کی شادی میں شرکت کا ارادہ کر لیا تھا۔ نیت شادی میں شرکت سے زیادہ مولانا محترم سے نیاز حاصل کرنے کی تھی لیکن ان دنوں میرے چند عزیز جو ملک سے باہر تھے اچانک آگئے اور آرزو دل ہی میں رہ گئی۔ مولانا نے جس اخلاص وعنایت سے اپنی تحریروں اور خطوط کے ذریعہ راقم الحروف سے جو رشتہ قائم کر لیا تھا اس سے ان کی عظمت کا احساس ہوتا ہے انھوں نے ہمیشہ اپنے خطوط کے ذریعہ میری رہنمائی فرمائی جس سے مجھے بہت کچھ حوصلہ ملا۔ مولانا انور شاہ کشمیری کی روشن دماغی، اعلیٰ ظرفی، وضعداری اور محبت کے قصے بزرگوں سے سنے تھے اور کتابوں میں پڑھے تھے۔ مولانا مرحوم کے تحریری رشتوں نے ان تمام خصائل حمیدہ کی توثیق وتائید کی۔

آپ کے لئے مولانا کی جدائی ایک جانکاہ حادثہ ہے۔ وہ ہمارے لئے باقیات الصالحات میں سے تھے اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی خاص رحمتوں سے نوازے اور ہم سب کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ والسلام
آپ کا بھائی۔ خاور ہاشمی

مولانا حفیظ الرحمٰن واصف

اردو بازار۔ دہلی

بملاحظۂ گرامی عزیز محترم مولانا محمد انظر شاہ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ

استاذ دار العلوم دیوبند، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

آج مورخہ یکم دسمبر ۱۹۸۵ء کے اخبار قومی آواز میں آپ کے برادر محترم مولانا محمد ازہر شاہ قیصر کی خبر وفات پڑھ کر سخت قلق واضطراب لاحق ہوا مرحوم سے میرا بہت ہی قلبی تعلق اور مخلصانہ محبت تھی۔ آپ حضرات کے غم میں بھی برابر کا شریک ہوں۔

افسوس ہے کہ اس وقت بیمار ہوں ابھی حال میں آنکھ کا آپریشن ہوا ہے جس کی وجہ سے نقاہت اور ناتوانی بہت زیادہ ہوگئی ہے سفر کے قابل تو ویسے بھی نہیں تھا اور اس وقت تو معذوری بھی ہے۔ بہرحال دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ مولانا ازہر مرحوم کی خطاؤں سے درگذر فرمائے ان کو اپنے جوار رحمت میں مقام رفیع عطا فرمائے۔ اور ان کے اہل وعیال اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے (آمین) احقر کی طرف سے ان کی اہلیہ محترمہ اور فرزندان ارجمند کو پیغام تعزیت پہنچا دیجئے۔

اللہ تعالیٰ آپ سب حضرات کو سلامت رکھے۔ والسلام

(مولانا) حفیظ الرحمٰن واصف

جناب حکیم عبد القوی صاحب

ایڈیٹر صدق جدید لکھنؤ

عزیز مکرم سلام مسنون

پرسوں میرے بھتیجے نے دہلی کے کسی انگریزی اخبار میں یہ خبر پڑھ کر مجھے مطلع کیا کہ مولوی ازہر شاہ مدیر رسالہ دار العلوم دیوبند کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس خبر سے مجھے بہت صدمہ ہوا مرحوم میرے بڑے کرم فرما تھے مراسلت اکثر رہتی تھی اور جشن دیوبند کے دوران میں انھیں کا مہمان رہا تھا انھوں نے انتہائی مہمان نوازی فرمائی تھی جسے میں فراموش نہیں کرسکتا۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو مراتب بلند عطا کرے اور آپ اور جملہ غمزدہ اہل خانہ کو اس حادثۂ عظیم پر صبر کی توفیق دے۔ آپکے غم میں شریک

حکیم عبد القوی

جناب وشوا ناتھ طاؤس صاحب (فاضلکا)

مولانا نسیم اختر شاہ قیصر۔ تسلیم!

آپ کا خط موصول ہوا حضرت مولانا ازہر شاہ قیصر کی وفات کی خبر پڑھ کر دل ڈوب گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا مرحوم میرے محسن و مربی تھے ان کے توسط سے ہی میں علماء دیوبند سے روشناس ہوا تھا انھوں نے مجھے دار العلوم دیوبند کے جشن صد سالہ میں خاص طور سے مدعو کیا تھا اور یہ میری زندگی کا سب سے اہم واقعہ تھا جشن صد سالہ میں شمولیت سے مجھے جو فیضان حاصل ہوا اسکا ذکر میں اپنے اکثر مضامین میں کرچکا ہوں۔ مولانا قیصر علوم شرقیہ کا بحر ذخار تھے بلاشبہ وہ اس عہد کے عبقری تھے ان سے میری جو یادیں وابستہ ہیں انشاء اللہ انھیں قلمبند کرونگا۔ اپنی والدہ محترمہ اور حضرت مولانا انظر شاہ صاحب سے میری طرف سے اظہار تعزیت کردیں خدا آپ کو یہ عظیم صدمہ برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

غمگسار　وشوا ناتھ طاؤس

حضرت مولانا محمد حنیف ملی صاحب، مالیگاؤں

عزیزم مولوی نسیم اختر صاحب
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

۷ر دسمبر کا تازہ شمارہ اشاعت حق آج جب ملا تو آپ کے والد محترم حضرت مولانا ازہر شاہ قیصر کے حادثۂ ارتحال کی اطلاع ملی اور دل دھک سے ہوگیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بلاشبہ شاہ صاحب مرحوم جیسے شفیق ترین انسان کی جدائی آپ کے لئے والدۂ محترمہ اور دوسرے عزیزوں کیلئے سوہان روح اور حادثۂ جانکاہ ہے لیکن قدرت کی اَن بوجھی مشیت پر ایمان ہمارا فرض ہے۔ مرحوم کے وصال سے ایک قابل ترین صحافی، بے باک و بے لاگ اہل قلم قابل تقلید تجزیہ نگار مایۂ ناز مصنف کی جگہ خالی ہوگئی۔ موصوف بڑے باکمال انسان اور بڑی خوبیوں کے آدمی تھے زندگی بھر حوادث سے جرأت کے ساتھ برسرپیکار رہنا ان کی کتاب زندگی کا جلی عنوان تھا۔ زندگی بھر مادر علمی دارالعلوم سے وابستگی اور ماہنامہ دارالعلوم کو اپنے زرنگار قلم کے ذریعہ شہرت و مقبولیت کے جس اوج پر مرحوم نے پہنچایا اسے ہر کہہ ومہ کو نہ صرف خراج تحسین بلکہ ان کیلئے دعائے مغفرت بھی کرنا چاہئے۔ دارالعلوم سے علیحدہ ہوجانے کے بعد بھی وہ بڑی عقیدت واحترام سے مادر علمی کا ذکر کرتے تھے۔ ان کے قلم نے دارالعلوم کی خدمات کو دور دور تک عام کرنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔

ان کی جدائی پر معہد ملت اور راقم غیر معمولی متاثر اور دعاگو ہیں کہ خدا مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے، مرحوم کے متوسلین کو صبر عطا فرمائے۔ میں ان کلمات کے ساتھ آپ کو اور آپکی غمزدہ والدہ کو تعزیت مسنونہ پہنچا رہا ہوں کہ موت انسانی زندگی کے موڑ پر سب سے اہم واقعہ ہے جس پر صبر کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ مرحوم کے خطوط کار پر باقی رہنا ہی ان کی روحانی تسکین کا سامان ہوگا۔ میں آپ کے اس شدید حادثہ کو اپنا ذاتی حادثہ سمجھتا ہوں۔ آپ نے مرحوم کی وفات کی خبر دیتے ہوئے جس صبر وضبط کے ساتھ کلمات خیر کا اظہار کیا ہے بس انہی کلمات کے ساتھ آپ کو اور جملہ اہل خانہ۔ خصوصاً مولانا انظر شاہ صاحب کو صبر کی تلقین کرتا ہوں انشاء اللہ آپ مولانا مرحوم کے سچے جانشین اور ان کے خطوط کار کو انجام و تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ترین فرزند ثابت ہوں گے۔ خدا آپ کو اور جملہ اہل خانہ کو مکمل صبر عطا فرمائے اور آپ عمل کی راہوں پر گامزن رہکر والد صاحب کے کاز کو زندہ رکھ سکیں۔

شریک غم
محمد حنیف ملی

منشی یونس اعوان صاحب، جموں

محترم عزیز نسیم صاحب۔ سلام علیکم
آپ کا خط ملا۔ محترم قیصر صاحب کی وفات کی نسبت پڑھ کر دلی دکھ ہوا۔ مرحوم سے میرے برادرانہ تعلقات تھے جس کا آپ کو ذاتی علم ہے۔ مرحوم کی حق مغفرت فرمائے۔ آمین۔ جمعہ کے دن جنازہ غائبانہ پڑھا جائیگا انشاء اللہ۔

بدستور یاد فرماتے رہا کریں رابطہ قائم رکھنا تاکید والدہ صاحبہ سے میری طرف سے اظہار تعزیت صدق دل سے کریں۔ تائید، والسلام دعاگو المذنب

یونس اعوان۔ جموں

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی

استاذ حدیث و تفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

برادر عزیز گرامی قدر میاں نسیم اختر شاہ صاحب زید لطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے بہمہ وجوہ بخیر ہوں -!

میں سفر میں تھا کہ محترم مولانا ازہر شاہ قیصر صاحب کے سانحۂ ارتحال کی خبر صاعقہ اثر سنی (انا للہ وانا الیہ راجعون) اگرچہ یہ حادثہ غیر متوقع نہ تھا مگر ہم سب اہل تعلق کے لئے بہت اندوہگین اور صدمہ انگیز بنا ہے اور بے ساختہ زبان پر — ع "ان ما تعن رین قد وقع" آگیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی حسنات قبول فرما کر اور لغزشوں سے درگذر فرما کر انہیں جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور آپ سب کو صبر جمیل کی دولت ارزانی کرے۔ یہ حادثہ جب ہم جیسے دور افتادوں کے لئے المناک ہے تو آپ لوگوں کے لئے جتنا بھی اندوہناک ہو کم ہے، مگر اس موقعہ پر حضرت عبد اللہ بن عباس رض کو انکے والد معظم حضرت عباس رض کی وفات پر جن تعزیتی کلمات کے ذریعہ ایک دیہاتی نے تسلی دی تھی وہ سنانے اور نقل کرنے کا جی چاہتا ہے کیونکہ ان کلمات سے زیادہ تسلی بخش دوسرے الفاظ ملنا مشکل ہیں۔ ؎

اجرک خیر من العباس بعدہ ؛ واللہ خیر منک للعباس

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے اور امید ہے کہ آپ سب لوگ کہ جو ایک عظیم علمی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں اس گھر کی اچھی روایتوں کو نہ صرف زندہ و تابندہ رکھیں گے بلکہ انہیں فروغ دیں گے۔ دوسرے اعزہ بالخصوص برادر و خواہر کو بعد سلام کے کلمات خیر احقر کی جانب سے اور تعزیت مسنونہ پہنچادیں۔

والسلام۔ احقر محمد برہان الدین۔

مولانا سعید الرحمٰن صاحب · ماہنامہ نصرۃ الاسلام سرینگر

برادر محترم نسیم اختر صاحب زید فضلہ

سلام مسنون

پچھلے دنوں "قومی آواز" دہلی کے ذریعہ سانحۂ ارتحال کی خبر پڑھی تھی آج آپ کا خط بھی ملا۔ یہ بہت بڑا علمی حادثہ ہوا میری طرف سے تعزیت مسنونہ قبول فرمائیے۔

میر واعظ صاحب کو بھی اطلاع مل چکی ہے، ان کی طرف تعزیتی برقیہ بھی روانہ کیا گیا ہے۔ جامع مسجد کشمیر اور اپنے دیگر اداروں میں ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کا اہتمام کیا گیا۔ اپنی والدہ سے سلام کہیئے۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ والسلام مخلص

محمد سعید الرحمٰن۔ سری نگر کشمیر

جناب خان غازی کابلی کوچہ رحمان دہلی ۶

پیارے عزیز نسیم اختر قیصر سلمہ الرحمٰن

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

روزنامہ "قومی آواز" ۳ دسمبر سنہ ۱۹۸۵ء کے مراسلات میں "دعائے مغفرت" کے عنوان سے تمہارا مراسلہ پڑھا۔ یہ معلوم کر کے بے حد صدمہ ہوا کہ "غازی" کے مخلص ترین دوست علامہ سید محمد ازہر شاہ قیصر واصل بحق ہوئے۔ دعا ہے کہ خدا مرحوم کی مغفرت کرے اور جنت میں اعلیٰ درجات سے سرفراز فرمائے۔ آمین۔ تمہیں اور مرحوم کے پسماندگان کو خدا صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

علامہ انور صابری کے بعد علامہ ازہر شاہ قیصر کی جدائی،

؎ غم عزیزوں کا رفیقوں کی جدائی دیکھی

اور دکھلائے گا اب گردش دوراں کیا کیا

تمہارا اپنا غمزدہ:۔ خان غازی کابلی۔

مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی

عزیزانِ گرامی قدر، سلام مسنون!

مولانا ازہر شاہ کے انتقال کی خبر مجھے علیگڈھ میں مل گئی تھی تعزیت نامہ بھیجنے میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی۔ میرے ان سے اسوقت سے روابط تھے جب کہ میں دار العلوم میں تعلیم پا رہا تھا انھوں نے اپنی فرمائش کے ذریعہ مجھ سے کئی مقالے لکھوائے اور یہ ان کا بہت بڑا کرم تھا وہ احقر کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ رمضان المبارک میں ان سے آخری ملاقات ہوئی یہ ملاقات بہت عرصے بعد ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور مغفرت سے نوازے اور آپ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔ والسلام

(حضرت مولانا) نسیم احمد فریدی غفرلہٗ

سید اختر الاسلام صاحب

بھائی نسیم صاحب

آپ کے والد صاحب کی رحلت کی خبر پڑھی موت تو سب کا مقدر ہے مگر یہ کہ وہ کافی عرصہ موت و زیست کے درمیان نبرد آزما رہے باعث تشویش رہا۔ خیر، اللہ انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور آپ لوگوں کو صبر عطا کرے۔ آپ کے سہرے کے پھول کھلنے کا شاید مرحوم کو انتظار تھا اور اس سے فراغت پاتے ہی خالق نے ان کو اپنے پاس بلا لیا۔

مرحوم بہت بلند پایہ صحافی اور قلم کے شہسوار تھے انکی تحریریں بولا کرتی تھیں۔ اس سوگوار موقع پر میری دلی ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں خدا آپ کو حوصلہ عطا کرے۔ والسلام

اختر الاسلام

جناب قاضی سید عابد علی وجدی الحسینی صاحب محکمہ دار القضاء بھوپال

عزیز مکرم و جملہ عزیزان سلمہم اللہ تعالیٰ۔ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

جس خطرہ کا احساس دل و دماغ کو مضطرب کر رہا تھا آہ کہ اس نے واقعیت کی شکل اختیار کر لی۔ یعنی آپکے والد گرامی قدر اور اس حقیر فقیر کے مخلص دوست اور نصف صدی کے رفیق شفیق مولانا حافظ سید محمد ازہر شاہ قیصر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ فغفرہ اللہ مغفرۃ واسعۃ کاملہ۔ اس سانحۂ عظمیٰ سے اس فقیر کے دل پر کیا چوٹ لگی الفاظ اس کی ادائیگی سے قاصر اور عبارت اس کے اظہار سے عاجز ہے۔ بہر حال موت میراث بنی آدم ہے۔ سوائے صبر و برداشت کے اور کیا کیا جا سکتا ہے ؏ بشر نے جہاں کی راہ لی" راقم الحروف بھی اس کے انتظار میں ہے۔ "آج وہ کل ہماری باری ہے"

محترمہ اہلیہ صاحبہ اور جملہ عزیزان خورد و کلاں کی خدمت میں تعزیت مسنونہ پیش کر دیجئے۔ ایصال ثواب کیلئے اہتمام کیا جا رہا ہے۔ انشاء اللہ یہ فقیر ہمیشہ مرحوم و مغفور کیلئے دعائے مغفرت و حصول درجات عالیہ کرتا رہیگا خداوند قدوس انکی خطاؤں اور لغزشوں سے درگزر فرمائے چونکہ راقم الحروف ہفتہ دو ہفتہ سے زیر علالت تھا اسلئے اخبار کے مطالعہ سے محروم رہا اور اس حادثہ سے بے خبر رہا جب یہ خبر وحشت اثر پہنچی تو گویا سر پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا صبر و ضبط کی یارائی نہ رہی پھر آہستہ آہستہ آنسوؤں کے پانی نے غم و رنج کی آگ کو ٹھنڈا کیا۔ بہر حال میں خود بھی مستحق تعزیت ہوں لیکن یہ سانحہ آپکے سامنے گذرا اسلئے اسکے اثرات زائد ہونگے۔ دعا کرتا ہوں کہ پروردگار عالم جملہ عزیزان اور اہل بیت کرام کو صبر جمیل و اجر جزیل عطا کرے والسلام نعم الختام

خیر اندیش۔ قاضی سید عابد علی وجدی الحسینی

عزیز محترم ! السلام علیکم

ہسپتال میں آتے ہی رات میں سرور صاحب نے یہ ہوش ربا اور منحوس خبر سنائی "لو بھائی، تمہارے ازہر شاہ قیصر بھی اللہ کو پیارے ہو گئے" — کیا تحریر کروں کیا گذر گئی کچھ نہیں لکھ سکتا نہ میرے پاس الفاظ ہیں نہ اسوقت تعزیت کا طور طریقہ معلوم بس چپ ہوں۔ ہر چند کہ پڑھنے لکھنے کی سخت پابندی ہے لیکن یہ حماقت کر ہی رہا ہوں۔ سبھی سے سلام کے بعد کیا کہیں گے ...... کچھ پتہ نہیں .... بائیں آنکھ کا آپریشن کامیاب رہا ابھی چلنے پھرنے کی ممانعت ہے۔ سرور صاحب (شان ہند) بھی اظہار تعزیت کر رہے تھے یہ علاج انھوں نے ہی کرایا ہے — کریمی الاحسانی

عزیز محترم ! سلام مسنون

کسی سے آج یہ سنا؟ کہ حضرت شاہ صاحب بھی چل بسے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون قلبی صدمہ گذرا، خداوند تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ اور آپ لوگوں کو صبر جمیل کی توفیق عطا کرے، آمین ثم آمین۔ بیشک مرحوم، عظیم باپ کے عظیم بیٹے تھے ان کی خوبیوں پر تبصرہ کا تو اہل علم کو ہی حق حاصل ہے، میں تو صرف تعلق خاطر کی باعث اپنے رنج وملال کے اظہار پر مجبور ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ "موت سے کس کو رستگاری ہے"۔ مگر پھر بھی اپنی شناخت کی علامتیں ختم ہوتے دیکھتا ہوں اور دکھ ہو رہا ہے۔ اگرچہ غم کے اس طوفان میں آپ کی تشفی اور دل جوئی اپنا فرض سمجھتے ہوئے بھی اس سے قاصر ہوں ہاں اپنی تازہ غزل کا ایک شعر لکھے دے رہا ہوں ؎ تم سے ممکن ہو تو تا حشر بسائے رکھنا ۔ دوستو ہم تو محبت کا جہاں چھوڑ چلے
بہت سی دعاؤں کے ساتھ اپنے غم کو اپنے دل کے ہی سپرد کر رہا ہوں۔ اپنی والدہ محترمہ اور بہن بھائیوں سے بھی میری طرف سے تعزیت فرمادیں۔ والسلام شریک غم غازی سکردھوی

عزیز مکرم مولانا سید نسیم اختر شاہ قیصر۔ سلام مسنون

کل ۱۰ / دسمبر ۱۹۸۵ء کی ڈاک میں "اشاعت حق" ملا جسمیں دل کو ہلا دینے والا ضمیمہ بھی تھا۔ اُف وہی ہوا جس کا دھڑکا مجھے کچھ دنوں سے لگا ہوا تھا، خدا کی قسم جب سے اپنے بڑے بھائی اور آپکے والد محترم رئیس القلم مولانا سید ازہر شاہ قیصر کی بیماری کی بابت کسی اخبار میں پڑھا تھا اسی وقت سے دل بیٹھا جا رہا تھا بار بار ارادہ کیا کہ اپنے اس عظیم قدرداں دوست کی عیادت کو دیوبند جاؤں آج جس کا کوئی ثانی و مثیل مجھے ایک بھی نظر نہیں آتا، لیکن افسوس کہ میرے اور بہت سے ارادوں کیطرح یہ ارادہ بھی تشنہ تکمیل ہی رہا اور اب زندگی بھر اپنی اس بدبختی پر ماتم کرتا رہونگا لیکن یہ ماتم بے سود ہوگا اور میں اس دنیا میں اب کبھی بھی اس مخلص وشفیق ہستی کی ہمکلامی وہم نشینی کا شرف حاصل نہیں کر سکونگا جسکے قلم کی رفتار کوہستانی دریاؤں کی روانی سے زیادہ اور کاٹ دھار دار تلوار سے بھی تیز تھی میرے اہل قلم رفیقوں شفیقوں اور بزرگوں میں سے شاید اب ایک دو کے سوا کوئی بھی باقی نہیں رہا۔ شوزش کاشمیری گئے ناز ش پرتاپگڈھی گئے مولانا فارقلیط گئے، زکریا اسعدی گئے، انور صابری گئے اور میری ہمت بڑھانے والے اور میری شاعری کو مولانا ظفر علی خاں اور شورش کاشمیری کی شاعری کا تتمہ کہنے والے مولانا سید ازہر شاہ قیصر بھی رخصت ہو گئے "کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذو الجلال والاکرام"۔ میری طرف سے تعزیت مسنونہ قبول فرمائیے والسلام محمد اسحاق حافظ

محترمی سلام مسنون ! امید ہے آپ بخیریت سے ہونگے — والد محترم کے انتقال پر میں آپکے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ چونکہ میں خود ایک حادثے کا شکار ہو گیا تھا اسلئے تعزیتی خط لکھنے سے محروم رہا معذرت خواہ ہوں۔ کار لائقہ سے یاد فرمائیے گا۔ والسلام۔ مسیح الزماں امروہوی

جناب جمیل مہدی صاحب۔ مدیر روزنامہ عزائم لکھنؤ

محترم جمیل مہدی صاحب (مدیر روزنامہ عزائم لکھنؤ) کا یہ خط جہاں والد مرحوم کے حالات پر روشنی ڈالتا ہے وہیں جمیل صاحب سے بے تکلفانہ تعلقات کا اظہار بھی کرتا ہے جمیل صاحب کا یہ خط اس نمبر میں خاص طور پر شامل کیا جا رہا ہے۔ (نسیم اختر شاہ قیصر)

عزیزی نسیم اختر شاہ، سلام مسنون۔ تمہارے عظیم الشان والد کے سانحۂ ارتحال پر میں نے تمہیں رسمی طور پر تعزیت کا خط نہیں لکھا تو اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ مجھے اتنا ہوش ہی نہ تھا۔ خود اتنا بیمار تھا کہ یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ اب تو ہم جا ہی رہے ہیں فضول رسمی تعزیت کی کیا ضرورت دوسرا سبب یہ تھا کہ مجھے شاہ جی سے (تمہارے والد مرحوم) سے سخت شکایت پیدا ہو گئی، کتنی بار مرنے کا تذکرہ ان کے اور میری گفتگو کے درمیان آیا لیکن ہر بار انکی مایوسانہ گفتگو پر میں نے اپنی حالت کو ذہن میں رکھ کر، پورے اعتماد کے ساتھ ان سے شرط لگائی کہ اب کی باری میری ہے۔ اور وجہ یہ ہے شاہ جی! اگر آپ مر گئے تو نوحہ خوانی کے لئے سیکڑوں کھڑے ہو جائیں گے۔ میں مر گیا تو تمہارے علاوہ مجھے سلیقہ کے ساتھ رونے والا کوئی دوسرا نہ ملے گا۔ پھر یہ بھی ہے شاہ جی کہ باپ، بھائی، عزیزوں، دوستوں، رشتہ داروں اور کرم فرماؤں کی مفارقت کے اتنے داغ دس بارہ برس کی مدت میں اس دل پر پڑ چکے ہیں کہ اب یہ کم بخت پکے پھوڑے کی طرح ہر وقت رستا رہتا ہے، اور ہر وقت تکلیف پہنچاتا رہتا ہے۔ تمہارا داغ لگ گیا تو مجھے خوف ہے کہ پانی ہو کر نہ بہہ جائے۔ وہ یہ باتیں دلی اذیت کے ساتھ سنتے، میری طرف دیکھتے تو ان کی آنکھوں میں حیرت لیے رحم کے جذبات کسمساتے ہوئے بھی ملتے لیکن اپنے اس خیال کو بدلنے پر کسی طرح تیار نہ ہوتے کہ انکا وقت تیزی کے ساتھ پورا ہو رہا ہے اور اب انکے پاس مہلت نہیں رہ گئی ہے۔ سنہ ۷۶ء میں جب وہ شدید بیمار ہوئے تو اتفاق سے میرا دیوبند آنا ہوا۔ لوگوں نے بتایا کہ شاہ جی کو خیال ہو گیا ہے کہ وہ کینسر کی موذی بیماری کا شکار ہو گئے ہیں۔ میں جا کر ان سے خوب لڑا، شاہ جی! بہت بری بات ہے جو بیماری نہ بھی ہو اس میں آپ اپنے کو زبردستی گرفتار کیوں کرتے ہیں، ایک پوری دنیا آپ نے بسا رکھی ہے، اتنے لڑکے ہیں، اتنے عزیز ہیں، ان کی ذمہ داریاں ہیں اور آپ ان سب سے گھبرا کر فرار چاہتے ہیں، موت کی گود میں منہ چھپانا چاہتے ہیں، اور مجھے یہ سب کچھ دیکھ کر آپکے زندہ رہنے کا یقین اور بڑھتا ہے۔ آپ نہیں مر سکتے شاہ جی! موت ایسے لوگوں کو آسکتی جو اسکی تمنا کرتے ہیں تو اب تک مجھے آ چکی ہوتی ــ میں نے انھیں فرط جذبات میں دسیوں نام گنا دیے۔ دیکھو نا شاہ جی! عقیل محزوں زندہ رہنا چاہتا تھا، اسامہ زندہ رہنا چاہتا تھا، خورشید کو اس دنیا میں رہنے کی بڑی تمنا تھی شکیل بدایونی کو کتنا شوق تھا اس دنیا میں رہنے کا، ان لوگوں کا گھر تھا، بچے تھے، ایک دنیا تھی لیکن یہ سب، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چل دیے موت نے ان کو زبردستی گھسیٹ کر، انکی خوابوں کی دنیا اور مستقبل کے محلوں سے انھیں بے دخل کر دیا۔ اور میں ابھی تک زندہ بیٹھا ہوں جس کے اس دنیا سے اٹھ جانے سے اسکی رونق میں ذرا بھی کمی نہ ہوتی، کوئی گھر نہ اجڑتا، کوئی بچہ یتیم نہ ہوتا، کسی خاندان کو تباہی سے دوچار نہ ہونا پڑتا، کوئی سہاگن بیوہ نہ ہوتی ــ! شاہ جی نے یہ سب کچھ بڑی خاموشی اور جذباتی تاثر کے ساتھ سنا، بولے کچھ نہیں، لیکن مجھے محسوس ہوا ان کے سینے کا کافی بوجھ اتر گیا ہے۔

یہ تھوڑی سی جھلک تو صرف ایک موضوع، موت کے موضوع پر میری انکی گفتگو کی تھی اس طویل رفاقت۔ چالیس برس کی طویل مسافت پر پھیلے ہوئے زندگی کے سفر پر نظر ڈالوں تو لندھور بن سعدان کی داستان اس کے سامنے گرد ہو کر رہ جائے۔ تم لوگوں سے تو ہم چھپاتے تھے لیکن شاید تمھیں احساس ہو گیا ہو کہ انکے لاتعداد و بے شمار دوستوں، بے تکلف شناساؤں اور قریبی عزیزوں میں مجھ سے زیادہ بے تکلف، مجھ سے

زیادہ منہ پھٹ اور مجھ سے زیادہ محرم راز کوئی دوسرا نہیں تھا تم میں سے کوئی لڑکا جب تک پیدا نہیں ہوا تھا اسلئے تمھیں اس زمانہ کی یہ بات کیا معلوم ہوگی کس نے تمھیں بتائی ہوگی کہ ایک زمانے میں شاہ جی کے ۲۴ گھنٹوں میں کم از کم دس گھنٹے میرے ساتھ گذرتے تھے۔ دیوبند میں قاسمی پریس کے بعد دوسرا پریس میرے والد مرحوم نے ہمارے بڑے گھر میں لگایا تھا (وہ گھر بھی اب میری زندگی کی طرح ویران ہے) اسی پریس میں اس زمانہ کا مشہور ہفتہ وار اخبار "استقلال" مولانا سلطان الحق قاسمی کی ادارت میں نکلتا تھا۔ اور انور صابری ــــ وہ بھی مرحوم ہوگئے، اور ازہر شاہ قیصر اس کے مضمون نگار حلقے میں جگمگاتے ہوئے دو ستاروں کی طرح تھے۔ اسی گھر میں وہ اخبار مرتب ہوتا، اسی گھر میں محفلیں جمتیں، مضامین لکھے جاتے، پڑھ کر سنائے جاتے، مواد دی جاتی، داد لی جاتی۔ اس طرح سچ پوچھو تو میرے شعور کی نشو ونما ہی شاہ جی کی صحبتوں میں ہوئی۔ پھر تقسیم سے کچھ پہلے لاہور گئے اور چند مہینوں کے لئے احسان، شہباز، زمزم اور مجلس احرار کے سرکاری ترجمان آزاد میں، انکے قلم کے جوہر اور زیادہ آب وتاب کے ساتھ کھلے، تقسیم ملک کا پرچم کھلا تو شاہ جی دیوبند واپس آئے، اور پھر "دار العلوم" کی ادارت کا وہ دور شروع ہوا جس کے خاتمہ کا صدمہ انکے لئے ناقابل برداشت ثابت ہوا۔ لیکن اس سے پہلے، جبکہ پورے شمالی ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کا خونی چکر اس خوفناک انداز میں چل رہا تھا کہ مسلمانوں کا وجود ہندوستان میں بس چند دنوں کی بات ہی دکھائی دینے لگی تھی، سہارنپور جل رہا تھا۔ دہلی میں مسلمانوں کی تہذیب آخری بار خون کے سیلاب میں ہچکولے کھا رہی تھی، شاید ہمیشہ کے لئے ڈوب جانے کے لئے۔ اس وقت۔ جبکہ سب کے پیر اکھڑے ہوئے تھے، اور ہر مسلمان پاکستان کے لئے پابہ رکاب نظر آتا تھا۔ ہم چند لوگ قاری انعام الہی، سید محبوب رضوی، عامر عثمانی، زبیر افضل عثمانی، ازہر شاہ قیصر ــــ (آہ سب مرحوم ہوگئے) ایک جگہ اکٹھے ہو کر مسلمانوں کو دوبارہ جمانے کی تدبیروں کی فکر میں غلطاں نظر آتے۔ اس غور وفکر کے نتیجہ میں دو ماہوار رسالے دیوبند سے جاری کئے گئے۔ ایک تجلی جس نے بعد میں عامر عثمانی کی ادارت میں ملک گیر شہرت حاصل کی، اور دوسرا ہادی۔ جو سید محبوب رضوی، ازہر شاہ قیصر اور میرے نام کے ادارۂ تحریر میں شائع ہونا شروع ہوا اور چند ہی مہینوں کے اندر ہندوستان کا مقبول رسالہ بن گیا اس رسالہ کا اہتمام قاری انعام الہی کی مرحوم کی دوسری مشغولیتوں کی وجہ سے دو سال کے اندر ہی دوسری جگہ منتقل ہوگیا۔ پھر سنہ ۱۹۶۰ء میں دیوبند سے ایک سہ روزہ اخبار "مرکز" میں نے نکالا تو شاہ جی اس کے بھی سرو چراغاں اور روح رواں رہے ــــ ان کی بذلہ سنجی، ان کی تجربہ کاری، ان کی پر گوئی، ان کی علمی قابلیت، ان کے تبحر، ان کی رواں دواں انشاء پردازی، اب کس کس خصوصیت کو یاد کروں ــــ ان سے شکایت یہی ہے کہ وہ موت کے معاملہ میں مجھ پر اسی طرح سبقت لے گئے جس طرح ہر میدان میں انھیں سبقت حاصل تھی۔ انھوں نے بڑی بے رحمی کے ساتھ اس شرط میں بھی مجھے ہرا دیا۔ ان کے جانے کے بعد یہ زندگی، جو پہلے ہی وبال دوش معلوم ہوتی تھی، اور زیادہ ویران اور زیادہ بدصورت اور زیادہ اذیت ناک ہوگئی ہے۔ سب سے زیادہ رنج اس بات کا ہے کہ ان سب لوگوں کو اپنی زندگی ہی میں رو چکا، جن سے بعد مرگ نوحہ خوانی کی امید کر سکتا تھا اور اب کس مپرسی کا یہ عالم ہے کہ موت آئے گی تو اس حال میں کہ کوئی واقف کار رونے والا بھی نصیب نہ ہوگا ــــ اللہ تعالیٰ تمھیں شاہ جی کی تمام بہتر خصوصیات کا وارث بنائے اور اپنے فضل وکرم سے ایسی توفیق دے کہ تم بہر صورت ان کے جانشین بننے کا حق ادا کر سکو۔

والسلام، خیر طلب "جمیل مہدی"

مولانا فتح محمد صاحب لمبر (افریقہ)

عزیزم نسیم اختر سلمہٗ۔ دعائیں

آج تمہارے خط سے یہ معلوم ہوا کہ برادر محترم مولانا سید ازہر شاہ قیصر مرحوم ہم سب کو چھوڑ کر چلے گئے، نہ پوچھو اس خبر نے دل و دماغ پر کیا اثرات مرتب کئے۔ شاہ جی مرحوم اس طرح چلے جائیں گے اس کا تو کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ میں خود کو اس حادثہ کا متحمل نہیں پا رہا ہوں میری دلی ہمدردیاں تمہارے اور سب گھر والوں کے ساتھ ہیں۔ مرحوم کی مغفرت کے لئے دعائیں ہیں۔ ایصال ثواب کا اہتمام کیا گیا ہے۔ میرے لائق جو بھی خدمت ہو بے تکلف تحریر کرو۔ والدہ کی خدمت میں سلام عرض کرنا۔

والسلام

غمگسار فتح محمد لمبر (افریقہ)

صاحبزادہ حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نائب مہتمم دارالعلوم کراچی (پاکستان)

برادر عزیز مکرم جناب نسیم اختر شاہ صاحب قیصر السلام علیکم ورحمۃ

میں بیرون ملک سفر پر گیا ہوا تھا۔ واپس آنے پر آپ کے خط سے برادر مکرم مولانا سید ازہر شاہ صاحب قیصر رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کی اندوہناک خبر سے بہت صدمہ ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مرحوم سے احقر کا تعلق بچپن سے ایسا ہی تھا جیسے ایک چھوٹے بھائی کا بڑے بھائی کے ساتھ ہوتا ہے تباین دارین کے باوجود خط و کتابت کا سلسلہ بھی رہا اور احقر ان کی شفقتوں سے بہرہ ور ہوتا رہا۔ انھوں نے رسالہ دارالعلوم دیوبند کے ذریعہ سالہا سال دین و علوم دین کی جو خدمت انجام دی وہ انشاء اللہ ان کے لئے عظیم ذخیرۂ آخرت ہے دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دیں اور ان کی بال بال مغفرت فرمائے

میری طرف سے تمام اہل خانہ کو دلی تعزیت کا پیغام پہنچا دیں۔ انشاء اللہ ان کے لئے ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کا اہتمام کریں گے۔

والسلام

محمد تقی عثمانی

(قاری) احمد فیاض صاحب

عزیز محترم۔ سلام مسنون

بذریعہ "اشاعت حق" اور "آئینۂ دارالعلوم" حضرت شاہ صاحب کے سانحۂ ارتحال کی خبر معلوم ہوئی، بیحد صدمہ اور افسوس ہوا۔ مرحوم گوناگوں خصوصیات و کمالات کے حامل تھے ان کے انتقال سے دنیائے صحافت میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ تادیر پُر ہوتا نظر نہیں آتا۔ اللہ پاک ان کے ساتھ اپنے خصوصی فضل و کرم کا معاملہ فرمائے۔ مدرسہ میں فوراً قرآن خوانی کرائی گئی اور مدرسہ بند کر دیا گیا اور تعطیل کر دی گئی ہم آپ کے غم میں برابر شریک ہیں مرحوم سے ہمارے بہت گہرے مراسم اور روابط تھے مجھ پر بہت شفقت فرماتے تھے مدرسہ کا بہت خیال فرماتے تھے۔ رب العٰلمین مقام عالیہ سے نوازے اور بال بال مغفرت فرمائے۔ آمین۔

شریکِ غم (قاری) احمد فیاض احمد صاحب

نام	مقام
مولانا سید احمد رضا صاحب	بجنور
مولانا سلیمان ظفر قاسمی	دہلی
مولانا مفتی واصف صاحب دیوبندی	ہردوئی
مولوی محمد عمران خاں	دہلی
منشی رفیق احمد صاحب	؍؍
مولانا عبد القیوم میرٹھی مدرسہ نور الاسلام	میرٹھ
مولانا ارشاد قاسمی	رڑکی
مولوی سید آل افضل	دہلی
جناب عقیل احمد صاحب	سہارنپور
جناب عبد الواحد صاحب	بوڑھانہ
مولوی محمد حسن خاں	ہردوئی
جناب عزیز صاحب دیوبندی	گجرات
حکیم فیض عثمان صاحب ڈابھیل	گجرات
حافظ عمیق الحق صاحب	دہلی
مولوی عبد الحمید انور	؍؍
مولانا مفتی جمیل الرحمٰن صاحب	ہاپوڑ
جناب قاری عبد الرحمٰن صاحب	؍؍
مولانا اسماعیل مرغوب احمد	سورت
مولوی معین الدین مرنا پوری	مظفر نگر
مولانا سیف الدین سیف عثمانی	گجرات
جناب رضوان قریشی	جوالاپور
مولانا قاری فیاض احمد صاحب	غازی پور
کوثر صدیقی امروہوی	اجمیر

نام	مقام
جناب مشکور علی صاحب تھانوی	لاہور (پاکستان)
جناب مختار احمد قاسمی	برہانپور (ایم پی)
مولانا حسن احمد صدیقی دیوبندی	راجستھان سے
مولوی ممتاز احمد اعظمی	جلال آباد مظفر نگر
مولوی محمد عبید اللہ گنجام	اڑیسہ
حاجی شوکت علی طیبی	وارانسی
جناب عبد اللہ حسن چودھری	احمد نگر (مہاراشٹر)
جناب عبد الرشید اونتو	سوپور (کشمیر)
جناب مولانا عبد اللہ صاحب	ترکیسر گجرات
مولانا سمیع الدین صاحب بسیدیا	ضلع چمپارن
جناب عبد الرحمٰن کوندو سری نگر	کشمیر
مولانا بشیر احمد مہاراشٹری	(مہاراشٹر)
مولانا نصیر احمد صاحب شونڈت	ضلع میرٹھ
غلام نبی اونتو صاحب سوپور	کشمیر
مولانا محمد اسحاق قاسمی	جھانسی
جناب پرویز ہاشمی مدیر ہفت روزہ پربھنی ٹائمز	پربھنی (بہار)
جناب عبد المجید لون صاحب	کشمیر
سلطان احمد صدیقی صاحب	اجین (ایم پی)
مولانا محمد حسن شاہ قادری صوبہ سرحد	پاکستان
حاجی عبد الحق صاحب منشی	ساؤتھ افریقہ
جناب ساحل صدیقی صاحب	سہارنپور
حضرت مولانا افتخار فریدی صاحب	مرادآباد
مولوی نفیس احمد قاسمی	علی گڑھ
جناب انور مسعود صاحب	میرٹھ
مولانا محمد حماد فاتح قاسمی رانچی	بہار
جناب سید منصور علی صاحب	دہلی
مولانا ابو علی صاحب	اعظم گڑھ
مولانا رستم علی صاحب مونگیر	بہار

نام	مقام
محترمہ طیبہ سہیل صاحبہ	لکھنؤ
محترمہ قمر جہاں جعفری	انگلینڈ
جناب جی این گوہر صاحب	سری نگر کشمیر
مولانا مجیب اللہ صاحب اعظمی	بمبئی
جناب محمد خالد حسنی صاحب	احمد نگر (مہاراشٹر)
مولانا جمیل الرحمٰن صاحب	تیلی واڑہ دہلی
مولانا سید منا نور الحسن برکاتی	ٹونک راجستھان
مولانا احمد نصر صاحب	بنارس
حکیم عبد الرشید انور صاحب	ہزارہ پاکستان
جناب وقار مانوی صاحب	میرٹھ
جناب ظہیر الاسلام صاحب	فتح پور
مولانا قمر الزماں صاحب	الہ آباد
حافظ محمد شاہد صاحب	ہردوئی
مولانا منیر احمد قاسمی	دہرہ دون
مولانا عبد الستار صاحب	ملتان (پاکستان)
جناب افتخار احمد صاحب قاسمی لائبریری	شاہجہانپوری
مولانا نسیم الدین قاسمی رانچی	بہار
مولانا احمد حسن قاسمی ڈھاکہ	چمپارن
جناب نذیر احمد بابا	ترال کشمیر
ہما میرٹھی	اندور
جناب محمد عثمان غنی صاحب بردوان	مغربی بنگال
قاضی فضل منان صاحب	پاکستان
مولانا محمد شریف صاحب مظاہری	جموں توی
مولانا غلام رسول صاحب بادمولہ	کشمیر
سید محمد احسان نازکی صاحب	لولاب کشمیر
جناب پیر عزیز الدین شاہ صاحب	لولاب کشمیر
مولانا کلیم اللہ خاں صاحب	ریاض (سعودی عرب)

دینی درسگاہوں کی ایک ضرورت کی تکمیل

درس نظامی میں شریک مشہور، متداول، مستند تفسیر بیضاوی کی بھرپور تشریح و تفسیر

تقریر شاہی بر تفسیر بیضاوی

از حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب مسعودی، شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم (وقف) دیوبند

اہل علم جانتے ہیں کہ تفسیر بیضاوی خصوصاً بیضاوی کی سورہ بقرہ کو درس نظامی میں کیا حیثیت حاصل ہے تفسیری سرمائے کی یہ وہ کلیدی کتاب ہے جس نے کتب خانۂ تفسیر کے لب لباب کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔ اسمیں امام رازی کی تفسیر کے معقولی نکتے، تفسیر کشاف کے ادبی ولغوی مہمات، اعتزال پر ضرب شدید، کلام الہی کے اسرار ورموز کا انکشاف، ادبی چٹکلے، لغوی تحقیقات، مسائل تجوید اور فقہاء کی موشگافیوں کا ایک ایسا ذخیرہ جمع کر دیا گیا جو اہل علم کی رائے کے مطابق کسی تفسیر میں یکجا مہیا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تفسیر نہ صرف دینی درسگاہوں بلکہ اکثر یونیورسٹیوں کے امتحانات عربی میں شریک کورس ہے۔

حضرت العلامہ سید انور شاہ کشمیری کی رائے میں اس تفسیر کا پڑھنے والا مستند فاضل اور پڑھانے والا فاضل اجل تھا۔ عربی میں اس تفسیر کی ایک درجن سے زائد شروحات ہیں لیکن اردو میں اس تفسیر کی شرح وتوضیح کسی ایسے قلم سے آج تک نہیں ہوئی تھی جس نے خود سالہا سال اس تفسیر کا درس ایشیا کے عظیم الشان ادارے "دار العلوم دیوبند" میں بیٹھ کر دیا ہو۔ اس لئے ہماری پیش کش کم ازکم اردو ذخیرے میں ایک مثالی پیش کش ہے جس کی قدر اہل علم، اساتذہ اور طلباء کریں گے۔ یہ توضیح وتشریح بنام "تقریر شاہی" آفسیٹ پر دیدہ زیب ڈسٹ کور کے ساتھ سال نو کی ایک سوغات کی حیثیت سے آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ اپنا آرڈر جلد بک کرائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ادارہ آپ کی فرمائش کی تکمیل سے قاصر ہو۔

ملنے کے پتے

ادارہ انوریہ دیوبند یوپی ۲۴۷۵۵۴

مکتبہ بیت الحکمت دیوبند ۲۴۷۵۵۴

متفرقات

"شاہ جی برادران" کسی تجارتی فرم کا نام نہیں۔ بلکہ میرے ان دو مخدوم زادوں کا مشترکہ نام ہے جن میں ایک سے دیوبند کی ادب وصحافت کا بھرم، اور دوسرے سے دارالعلوم دیوبند کے مسند درس کا وقار قائم ہے۔ امام العصر حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ جن کی علمی جلالت اور حدیثی بصیرت نے عالم اسلام میں دارالعلوم کے درس حدیث کی دھاک بٹھائی۔ اپنے بعد اپنے خونی رشتے اور علمی نسبت کی دو ایسی یادگار چھوڑ گئے ہیں جو تحریر وتقریر میں نہ صرف شاہ صاحب کی نظیر بلکہ انکی آرزوؤں کی تفسیر اور جیتی جاگتی تصویر ہے۔

دور خلافت میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی گوہر کو "علی برادران" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اب دیوبند کے دورِ صحافت وخطابت میں مولانا سید ازہر شاہ صاحب اور حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب کو "شاہ جی برادران" کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

کبھی آپ رسالہ "دارالعلوم" کے دفتر میں جائیں تو سب سے پہلے آپ کی نظر دروازے کے بالکل سامنے ڈیسک کے سہارے بیٹھے ہوئے ایک صحافی پر پڑے گی۔ جس کے چاروں طرف دو چار بے تکلف دوستوں کا حلقہ ہوگا، چائے پی جارہی ہوگی لیکن چائے سے زیادہ دلچسپی اور شیرینی اس کی باتوں میں پائی جاتی ہوگی، ساری دنیا کے موضوعات زیر بحث ہونگے لیکن کسی موضوع پر جب تک اس بزرگ صحافی کی زبان نہیں کھلے گی اسے تشنۂ بحث ہی سمجھا جائے گا اس کے بدن پر خاکی رنگ کی شیروانی اور شیروانی کے نچلے پاکٹ سے جھانکتے ہوئے کچھ سفید کچھ لکھے ہوئے کاغذ اور اوپر کی جیب کا قلم اس کا صحیح تعارف کرا رہے ہوں گے، بال والی گجراتی ٹوپی ان کے سر کے بجائے ڈیسک پر نظر آئے گی، وہ بولے گا تو محسوس ہوگا کہ دودھ سے مکھن نکالنے والی مشین چل رہی ہے مجلس میں سکوت کم قہقہہ یا زوردار آوازوں کی گونج زیادہ ہوگی۔ کبھی کوئی مسودہ چیک کیا جارہا ہوگا، تو کبھی کسی مضمون پر نوٹس لگا کر محرر کو دیا جارہا ہوگا، آپ سلام کر کے اچھی طرح بیٹھنے نہ پائیں گے کہ اس کی نگاہیں کھلی کتاب کی طرح آپ کو پڑھ ڈالیں گی۔ اگر آپ سے پہلی ملاقات ہوئی ہے تو آپ سے بات بھی ہوگی اور مدارات بھی۔ لیکن اس کے بعد اگر آپ بے تکلفی کے ساتھ ملنا چاہیں گے تو آپ کو مہذب اور شائستہ "ادبی گالی" سننے کے لئے تیار رہنا ہوگا۔

اس قلمی خاکے میں جو تصویر ہے آپ اسے یقیناً پہچان گئے ہونگے۔ یہی ہے تین ناموں کی ایک شخصیت ابن الانور، سید محمد ازہر، شاہ قیصرؔ جس کے ساتھ مولانا کا پیوند دیکھ کر ان کی ذات میں مولاناؤں کی ادائیں ڈھونڈنے والے کو سخت مایوسی ہوگی۔

"شاہ جی برادران" کسی تجارتی فرم کا نام نہیں۔ بلکہ میرے ان دو مخدوم زادوں کا مشترکہ نام ہے جن میں ایک سے دیوبند کی ادب و صحافت کا بھرم، اور دوسرے سے دار العلوم دیوبند کے مسند درس کا وقار قائم ہے۔ امام العصر حضرت علامہ انور شاہ صاحب رح کشمیری جن کی علمی جلالت اور حدیثی بصیرت نے عالم اسلام میں دار العلوم کے درس حدیث کی دھاک بٹھائی۔ اپنے بعد اپنے خونی رشتے اور علمی نسبت کی دو ایسی یادگار چھوڑ گئے ہیں جو تحریر و تقریر میں نہ صرف شاہ صاحب کی نظیر بلکہ انکی آرزوؤں کی تفسیر اور جیتی جاگتی تصویر ہے۔

دور خلافت میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی گوہر کو "علی برادران" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اب دیوبند کے دورِ صحافت و خطابت میں مولانا سید ازہر شاہ صاحب اور حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب کو "شاہ جی برادران" کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

کبھی آپ رسالہ "دار العلوم" کے دفتر میں جائیں تو سب سے پہلے آپ کی نظر دروازے کے بالکل سامنے ڈیسک کے سہارے بیٹھے ہوئے ایک صحافی پر پڑے گی۔ جس کے چاروں طرف دو چار بے تکلف دوستوں کا حلقہ ہوگا، چائے پی جارہی ہوگی لیکن چائے سے زیادہ دل چسپی اور شیرینی اس کی باتوں میں پائی جاتی ہوگی، ساری دنیا کے موضوعات زیر بحث ہونگے لیکن کسی موضوع پر جب تک اس بزرگ صحافی کی زبان نہیں کھلے گی اسے تشنہ بحث ہی سمجھا جائے گا اس کے بدن پر خاکی رنگ کی شیروانی اور شیروانی کے نچلے پاکٹ سے جھانکتے ہوئے کچھ سفید کچھ لکھے ہوئے کاغذ اور اوپر کی جیب کا قلم اس کا صحیح تعارف کرا رہے ہوں گے، بال والی گجراتی ٹوپی ان کے سر کے بجائے ڈیسک پر نظر آئے گی، وہ بولے گا تو محسوس ہوگا کہ دودھ سے مکھن نکالنے والی مشین چل رہی ہے مجلس میں سکوت کم قہقہہ یا زوردار آوازوں کی گونج زیادہ ہوگی۔ کبھی کوئی مسودہ چیک کیا جارہا ہوگا، تو کبھی کسی مضمون پر نوٹس لگا کر محرر کو دیا جارہا ہوگا، آپ سلام کر کے اچھی طرح بیٹھنے نہ پائیں گے کہ اس کی نگاہیں کھلی کتاب کی طرح آپ کو پڑھ ڈالیں گی۔ اگر آپ سے پہلی ملاقات ہوئی ہے تو آپ سے بات بھی ہوگی اور مدارات بھی۔ لیکن اس کے بعد اگر آپ بے تکلفی کے ساتھ ملنا چاہیں گے تو آپ کو مہذب اور شائستہ "ادبی گالی" سننے کے لئے تیار رہنا ہوگا۔

اس قلمی خاکے میں جو تصویر ہے آپ اسے یقیناً پہچان گئے ہونگے۔ یہی ہے تین ناموں کی ایک شخصیت ابن الانور، سید محمد ازہر، شاہ قیصر جس کے ساتھ مولانا کا پیوند دیکھ کر ان کی ذات میں مولاناؤں کی ادائیں ڈھونڈنے والے کو سخت مایوسی ہوگی۔

حضرت شاہ صاحب سرتاپا ایک دیانت دار اور فرض شناس صحافی ہیں، ان کے جری اور بے باک قلم نے ملک وملت کے مسائل پر اتنے کاغذ سیاہ کئے ہیں کہ کسی زمانے میں ان کی چائے ان کے مسودوں سے پکتی تھی، برسہابرس سے رسالہ "دارالعلوم" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے انھوں نے جتنا کچھ لکھا ہے وہ خود ان کے فکر ونظر کا آبشار ہے، اس کے علاوہ پچھلے گیارہ برسوں سے "دیوبند ٹائمز" کے صفحات پر ان کے نقوش وتاثرات اور سیاسی حواشی ونظریات کے جو موتی بکھرے ہوتے ہیں وہ ان کے تابندہ قلم کی زندہ نشانی ہیں۔

میں شاہ جی کا احسانمند ہوں کہ اخبار "دیوبند ٹائمز" کی دس سالوں سے ادارتی ذمہ داری پوری کرنے میں انھوں نے مجھے ہمیشہ حوصلہ بخشا ہے، میرا دل بڑھایا ہے، میری قدر افزائی فرمائی ہے، میرے مضامین کو دارالعلوم کے صفحات میں جگہ دے کر علمی حلقوں میں مجھے متعارف کرایا ہے، اپنے منتخب شخصیاتی مضامین کے مجموعہ "یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ" پر مجھ سے مقدمہ لکھواکر انھوں نے ذرّہ نوازی کا ثبوت دیا ہے، اس مقدمہ میں بیجا مدحت سرائی کے بجائے میں نے ان کی واقعی حیثیت وشخصیت کو نمایاں کیا ہے، اس لئے کہ مبالغہ آمیز "فراخدلی" کے مظاہرے سے قلم کا اعتماد اور اصابت رائے کا وقار مجروح ہوتا ہے، مجھے افسوس ہے کہ شاہ صاحب کے اور بہت سے شاہکار مضامین دیمک تو چاٹ جائے گی لیکن کسی ایسی کتاب میں یکجا دیکھنے کو نگاہ ترستی رہ جائے گی جو ان کے بعد ان کے قلم کی یادگار کے طور پر شائع کی گئی ہو۔ "حیات انور" اگر ان کی مستقل تصنیف ہوتی تو کچھ اور بات ہوتی لیکن وہ ان کی ترتیب سے آگے نہ بڑھ سکی، اب جو زندگی باقی ہے اس پر بڑھاپے کی افسردگی طاری ہے۔ کاش بوڑھے جسم میں فکر ونظر کی جوانی اور ہاتھ میں لوح وقلم کی توانائی لوٹ آتی اور ان کے قلمی شہ پاروں سے دیوبند کے ادب وصحافت کی رعنائیوں میں اضافہ ہوتا۔

"دیوبند کے چند ہم عصر اور بزرگ" (صفحہ ۳، تا ۷) مصنف مولانا شاہین جمالی

مولانا سید ازہر شاہ قیصر:۔ علامۃ العصر حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری رہ کے فرزند اوّل ۱۹۵۱ء سے تاحال رسالہ "دارالعلوم" کے ایڈیٹر ہیں۔ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل اور دارالعلوم دیوبند میں تعلیم ہوئی۔ تحریر وتقریر اور صحافت سے طبعی لگاؤ ہے متحدہ ہندوستان کے کئی موقر اخبارات ورسائل کی ادارت کی۔ تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد مختلف موضوعات پر ان کے مضامین اردو صحافت کا ایک حصہ رہے ہیں۔ "حیات انور" اور "یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ" ان کی دو کتابیں قبول عام حاصل کر چکی ہیں۔ رسالہ "دارالعلوم" نے مسلسل ان کی ادارت میں علم وادب کی ناقابلِ فراموش خدمات انجام دی ہیں۔

(بحوالہ "دارالعلوم دیوبند کی ایک صدی کا علمی سفر نامہ")

(مصنف:۔ مولانا محمد اسلام قاسمی)

عظیم حادثہ

مولانا سید ازہر شاہ قیصرؒ، مدیر رسالہ دارالعلوم دیوبند

وفات ۲۷ر نومبر سنہ ۱۹۸۵ء

کچھ یادیں اتنی گہری اور ان کے نقوش اتنے مکمل ہوتے ہیں کہ انسان باوجود کوشش کے انھیں بھلا نہیں پاتا۔ پھر رنج و غم کے اثرات تو اتنے دیرپا ہوتے ہیں کہ انسان سوچ کر ہی رہ جاتا ہے کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

بڑے باپ کے بڑے بیٹے مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر صاحب مرحوم ہندوستان کے ان صفِ اول کے ادیبوں قلمکاروں اور صحافیوں میں سے تھے جن کا شمار اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیگا۔ مولانا مرحوم کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک واقعہ آج نظروں کے سامنے گھوم رہا ہے اور دل چاہتا کہ ان کی زندگی کے ان بکھرے ہوئے واقعات کو ایک جگہ سمیٹ لوں مگر صفحات کی قلت اور وقت کی تنگی اسکی اجازت نہیں دیتی۔ حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری رح کے علوم و کمالات کی ایک دنیا معترف اور معتقد رہی ہے۔ ان کے وصال کو نصف صدی سے زیادہ عرصہ گذرتا ہے مگر آج کوئی علمی حلقہ ایسا نہیں جہاں وہ جانے اور پہچانے نہ جاتے ہوں۔ اپنے باپ کے علوم و کمالات کو پھیلانے اور انکی شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں کو سامنے لانے میں مولانا مرحوم نے اپنی زندگی صرف کردی اور بلاشبہ آج شاہ صاحبؒ کا نام ان کی لائق و سعادتمند اولاد کی محنتوں ہی کی وجہ سے زندہ اور باقی ہے۔ ورنہ ہندوستان میں ایسے ہزاروں علمی خاندان ہیں کہ جن کے آبا و اجداد نے نمایاں خدمات انجام دیں مگر تاریخ کے گرد و غبار میں ان کا نام مٹتا چلا جا رہا ہے۔

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر مرحوم سے میرے ذاتی تعلقات تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی ۴۰ سال کی زندگی میں ان سے قریبی روابط رہے دفتری امور کے سلسلہ میں بارہا ان سے ملا ہوں ان کے قریب بیٹھا ہوں ان کو مشورے دیے اور ان سے رائے طلب کی ہے وہ میرے مخلص ترین دوستوں میں سے تھے بہت محبت اور تعلق کا معاملہ فرماتے وہ رسالہ دارالعلوم کے مدیر اور میں دارالافتاء کی خدمت پر مامور، اسلئے علمی طور پر بھی انکے سے تعلقات بہت گہرے رہے اور میرے لئے یہ خوشی اور فخر کی بات ہے کہ شاہ صاحب مرحوم ہمیشہ حسن سلوک اور حسن معاملہ کے ساتھ پیش آئے۔

وہ میرے قدیم مخلصوں اور بہت اچھے محبوں میں سے تھے۔ ان کے چلے جانے کو میں اپنا ذاتی نقصان تصور کرتا ہوں خاندانِ انوری کے ہر فرد کے لئے یہ حادثہ جانکاہ ہے میں اپنے محبین، مخلصین اور ادارے کے ممبران کی خدمت میں بصد عجز درخواست کرونگا کہ وہ مولانا مرحوم کے ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کا اہتمام فرمائیں۔ یہ ان کا مجھ پر براہ راست احسان بھی ہوگا اور انشاءاللہ ان کے لئے بھی ثمرۂ آخرت بنیگا۔

خدا مرحوم کی مغفرت فرما کر پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین)

سوگوار احقر اخلاق احمد صدیقی، ناظم ادارۂ درسِ قرآن دیوبند۔

مولانا حافظ محمد ازہر شاہ قیصر

آپ حضرت شاہ صاحب کے بڑے فرزند ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کی وفات کے وقت آپ کم سن تھے۔ یتیمانہ حالات و مشکلات کو ہمت سے برداشت کرتے ہوئے آپ نے عربی اور فارسی کی تعلیم ذاتی مطالعہ سے حاصل کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ناموافق کوائف کی وجہ سے آپ کسی قاعدہ اور ڈھنگ سے تعلیم کی تکمیل تو نہیں کر سکتے تھے تاہم موروثی ذہانت و فطانت اور اپنے مطالعہ و محنت سے اتنی عمدہ قابلیت حاصل کرلی ہے کہ ایک وسیع النظر عالم کی حیثیت میں علوم فنون کی کتب زبانہائے عربی اور فارسی وغیرہ سے پورا استفادہ کر سکتے ہیں۔ اردو زبان جو آپ کی مادری دولت ہے اس کے نظم و نثر کے ساتھ اور اس کے ادب اور صحافت کے ساتھ آپ کو غیر معمولی اور فطری لگاؤ ہے۔ گزشتہ چالیس سال سے آپ کا رہوار قلم اس میدان میں جولانیاں دکھاتا رہا ہے۔ ابتداء میں اخبار انور دیوبند، اخبار استقلال دیوبند، رسالہ خالد دیوبند، اخبار صداقت سہارنپور، اخبار زمیندار لاہور اور اخبار شہباز لاہور کے صفحات آپکے رشحات قلم کے لئے وقف رہا کرتے تھے تقسیم ہند سے پہلے کے زمانے میں آپکے جو بیشمار ادبی اور سیاسی مضامین برصغیر کے مشہور اخبارات اور اونچے معیار کے جرائد و رسائل میں چھپتے رہتے وہ اگر جمع کئے جائیں تو کئی ضخیم جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں۔

ادارت جریدہ "دار العلوم" تقسیم ملک کے بعد آپ دار العلوم دیوبند کے ترجمان خاص ماہنامہ "دار العلوم" کی ادارت کی ذمہ داریاں انجام دے رہے ہیں گزشتہ ایک ربع صدی سے رسالہ دار العلوم کی ادارت کے گرانبار فرائض کامیابی سے سرانجام دینے کے علاوہ آپ تصنیف و تالیف کے شغل سے بھی غافل نہیں ہیں مزمن علیل اور عدیم الفرصت ہونے کے باوجود کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں۔ کتاب "حیات انور" آپ کی بہت پرانی تالیفات میں سے ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضہ کے حالات میں صدیق اکبر کے نام سے بھی ایک چھوٹی سی کتاب ہے۔ اور آپ کی ایک تازہ تصنیف "یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ" تھوڑی مدت پہلے شائع ہوئی ہے۔ جو اپنی نوعیت کی خاص چیز ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ بھی اور بہت سی گرانقدر تخلیقات غیر مرتب و غیر مکمل ہیں جو اپنی اشاعت کے لئے موافق حالات اور آپ کی فرصت کی منتظر ہیں۔

مولانا ازہر شاہ صاحب نے یکے بعد دیگرے دو نکاح کئے تھے۔ دونوں سے آپ کو خدا نے بابرکت اولاد عطا فرمائی ہے۔ چار فرزند اور تین صاحبزادیاں ہیں۔ صاحبزادوں کے نام یہ ہیں:۔ محمد اطہر محمد راحت، محمد نسیم، اور محمد وجاہت

"الانور" مرتبہ عبدالرحمن کوندو

صفحہ ۲۳۸ تا ۲۴۰

حضرت شاہ صاحبؒ کے بڑے صاجزادے صدیق مکرم سید محمد ازہر شاہ قیصر ہیں۔ موصوف ایک کہنہ مشق صحافی اور مضمون نگار ہیں مختلف اخبارات و رسائل کے مدیر رہ چکے ہیں مدت سے مجلہ "دارالعلوم" کی ادارت کے فرائض بحسن اسلوب انجام دے رہے ہیں۔

"تاریخ دیوبند" صفحہ ۱۳۸

مصنفہ مورخ دیوبند مولانا سید محبوب رضوی صاحب مرحوم

جب میں دیوبند ایک مشاعرے میں گیا تو میرا قیام مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر صاحب کے یہاں ہوا، مولانا ازہر شاہ قیصر حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری رح کے بڑے صاجزادے ہیں نظم اور نثر پر دسترس ہے اور دارالعلوم کے رسالہ "دارالعلوم" کو مرتب کرتے ہیں اس سے ان کے قلم کی جولانی اور فکر کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ بحیثیت انسان نہایت خوش خلق، حلیم، متقی اور انسان دوست واقع ہوئے ہیں ان سے میرے تعلقات آج تک اسی ایک انداز پر چلے آرہے ہیں وہ دن دور نہیں کہ وہ بھی حضرت سید انور شاہ صاحبؒ کی طرح اپنا مقام پیدا کرلینگے۔ خدا انھیں اس دور کے فتنوں اور مصائب سے محفوظ رکھے۔

احسان دانش

بحوالہ "جہانِ دانش" جلد دوم

عظیم شخصیت مولانا سید ازہر شاہ قیصرؒ

خلد آشیاں حضرت مولانا سید ازہر شاہ قیصر سے ہمارا وطنی تعلق ہے یہ دوسری بات ہے کہ ہم لوگ آپسمیں ملتے ملاتے نہ ہوں۔ میں نے اپنے تایا جناب مسعود احمد مرحوم (پٹواری) کی زبانی اور اپنے والد جناب محمود احمد مرحوم (ضلع دار مظفر نگر) کی زبانی سُنا تھا مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ مرحوم خانوادۂ انوری کے ایک فرد تھے۔ ان کے والد مولانا انور شاہ کشمیری محدث رح کو یہ فخر حاصل رہا کہ انھوں نے حکیم الامت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی ذہنی اور روحانی تربیت کی علامہ اقبالؒ کا قرآن کریم کے تئیں والہانہ رجحان، اس کی تفسیر بیانی منطق، فقہ، فلسفہ، حدیث یعنی جن جن موضوعات سے علامہ اقبال کا کلام شیریں بیاں متصف ہے۔ ان سب کے رموز و معانی مولانا انور شاہ رح نے بیان کئے تھے۔ اس حساب سے سید ازہر شاہ قیصر علامہ اقبال کے دینی بھائی ہوئے۔

انکی وفات حسرت آیات سے ہم سب کو بہت صدمہ ہوا۔

ہمارے یہاں مرحوم کے لئے مغفرت کی دعا کی گئی اور ان کی روح کو ایصال ثواب کیا گیا۔ خدا انھیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

افضال احمد صدیقی

پھاٹک حبش خاں۔ دلی

اظہار تشکر

"طیب" کے اس خاص نمبر کے سلسلہ میں ان

تمام حضرات کا شکر گذار ہوں جنھوں نے خود سے یا میری درخواست پر مضامین اور نظمیں ارسال فرمائیں۔ عم محترم مولانا سید انظر شاہ صاحب مسعودی کے تعاون، سرپرستی، رہنمائی کا نتیجہ ہے کہ یہ نمبر منظر عام پر آسکا اپنے مقامی بزرگوں اور احباب کے علاوہ جن بیرونی حضرات نے میرے ساتھ تعاون کیا اس کا دل سے شکر گذار ہوں۔

خاص طور پر جناب محترم سید اختر الاسلام صاحب مدیر ہفت روزہ "میرٹھ میلہ" میرٹھ، جناب ھما میرٹھی صاحب (اندور) جناب پروفیسر بخشی اختر امرتسری اور جناب سما آخر لائل پوری کا شکریہ ادا نہ کرنا اظہار حقیقت سے چشم پوشی ہوگی۔ ان حضرات نے جس خلوص، محبت اور حقیقی تعاون سے نوازا اس کے لئے دل سے ممنون ہوں۔

وہ حضرات جنھوں نے نمبر کے لئے مالی تعاون کا ایثار فرمایا ان کے لئے بھی دل سے دعائیں ہیں۔

اور آخر میں مخلص اور پابند وعدہ جناب مولانا محمد سلیم صدیقی صاحب کاتب کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے کہ انھوں نے بڑی محنت اور استقلال کے ساتھ اس نمبر کی کتابت میں مکمل وقت اور بھرپور تعاون دیا۔ خدا ان سب حضرات کو عمر دراز اور فلاح دارین عطا فرمائے۔ (آمین)

"مدیر"

نعت شریف

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر رح

کروں جو صبح و شام میں آہ و فغاں مدینے میں
تو پھیلے کوچہ کوچہ میری داستاں مدینے میں

مرے نصیب کہاں ہیں مری مجال کہاں
کہ بار پاسکوں دارالاماں مدینے میں

خدا نے حسن ازل کو نکھارنے کے لئے
کیا ہے عشق محمد کو ضو فشاں مدینے میں

یہ آستانۂ عظمت ہے سر جھکا کے چلو
کہ رحمتوں کی ہے بارش یہاں مدینے میں

یہ ارض پاک ہے، محبوب کا جمال عزیز
چلو کہ بن کے رہیں گے جواں مدینے میں

مدینہ جاکے میں روؤں گا بار، بار اتنا
حضور خود ہی سنیں گے مرا بیاں مدینے میں

تجھے عزیز ہے جنت تو کیا کروں زاہد
مرے لئے تو ہے باغ جناں مدینے میں

تڑپتے چیختے گذری ہے زندگی میری
ملی تو مجھ کو، ملے گی اماں مدینے میں

غم فراق سے دل ہے نڈھال میرا
بلا کے دیکھئے شاہِ جہاں مدینے میں

حضور یہ آپ کے در پر فقیر آیا ہے
وہ لے کے آیا ہے دامن کی دھجیاں مدینے میں

شب فراق میں قیصرؔ تڑپ رہا ہے یہاں
حضور آپ ہیں جلوہ کناں مدینے میں

مولانا سید ازہر شاہ قیصر مرحوم نے ماہنامہ طیب کے لئے اپنی زندگی کے آخری ایام میں جو آخری مضمون قلم بند کرایا وہ ایک یادگار کی حیثیت سے اس خاص نمبر میں شامل اشاعت کیا جا رہا ہے۔ اگر وقت نے فرصت دی تو ان شاء اللہ مولانا مرحوم کی ہزاروں منتشر تحریروں کو آئندہ ایک ساتھ کسی خاص نمبر کے تحت پیش کیا جائیگا۔

میری موجودہ اپاہج اور بے مزہ زندگی کا نقشہ اگر سمجھنا ہو تو ذرا قرآن کریم کی طرف لوٹیے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے:-

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُونُوا شُيُوخًا

وہ ہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر نطفے سے پھر خون کے لوتھڑے سے پھر تم کو بچہ کر کے (ماں کے پیٹ سے) نکالتا ہے۔ پھر (تم کو زندہ رکھتا ہے) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو اور پھر تاکہ تم بوڑھے ہو جاؤ۔

دیکھیے انسان کی اصل اور اس کی پیدائش اور پرورش، رحم مادر میں اس کی غور و پرداخت کے متعلق اتنا واضح بیان کتب سماوی میں سے کسی نے بیان نہیں کیا۔ رحم مادر میں صرف ایک مادے اور جنین کی حیثیت سے انسان کی پرورش، پھر بطن مادر سے باہر آکر جبکہ وہ چلنے پھرنے اٹھنے بیٹھنے اور اپنے لئے خوراک حاصل کرنے سے بالکل معذور ہوتا ہے تو قدرت کی طرف سے اس کی ہر قسم کی پرورش ہوتی رہتی ہے۔

میں اپنی موجودہ زندگی میں اسی موجودہ آئینہ عمل کو انسان کی ان مجبوریوں،

مشکلات اور قدرت کی طرف سے حاصل شدہ سہولتوں اور نعمتوں کا پورا مظاہرہ دیکھ رہا ہوں۔

مجھے اب سے تین مہینے پہلے اچانک قلبی حادثے کی شکایت کا سامنا کرنا پڑا، اللہ کے فضل سے میں نے اس جھٹکے کو برداشت کر لیا مگر دل پر جو حادثہ آیا تھا اس نے دوسری شکل اختیار کر لی وہ یہ کہ میں ۳ مہینے سے بالکل اپاہج زندگی گذار رہا ہوں، پلنگ پر بیٹھا ہوں، ہاتھ پاؤں ہلا نہیں سکتا، کروٹ خود نہیں لے سکتا، کھانا اپنے ہاتھ سے کھا نہیں سکتا، مجبوری کا یہ عالم ہے کہ ہاتھ سے قلم بھی نہیں پکڑ سکتا، کھانے پینے میں بھی دوسرے کا محتاج ہوں۔ اگر کسی نے کچھ کھلا دیا تو ٹھیک، نہ کھلایا تو میں از خود کچھ نہیں کھا سکتا اب ہاتھ میں اتنی طاقت بھی نہیں کہ قلم ہاتھ سے پکڑ سکوں۔ زبان بھی زیادہ صاف نہیں ہے یہ اگر اپاہج پن نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ سمیع و بصیر اور "علیٰ کل شئی قدیر" بھی ہے وہ بندوں کو ان کے گناہوں کو ان کی نیکیوں کو خوب سنبھالتا ہے اور سمجھ کر اپنے پاس رکھتا ہے۔ وہ وقت پر ان کی پکڑ دھکڑ کرتا ہے۔

مجھ سے اپنی صحافتی زندگی میں بڑے بڑے عجیب گناہ سرزد ہوئے ہیں۔ میں نے ہمیشہ خلوص سے لکھا لیکن خود اس کا استعمال بھی ہر جگہ یکساں نہیں ہونا چاہئے میں ان لوگوں سے جن کے خلاف میں نے اس عرصہ میں لکھا ان سے معافی مانگتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ وہ میری موجودہ بے چینی، بے بسی اور بیکسی کو سامنے رکھ کر اپنے محبت و کرم فرمائی سے مجھے معاف فرمائیں گے۔

جو حضرات ایسے ہیں جو اس دنیا سے گذر چکے ہیں مگر ان کی اولاد باقی ہے ان کی اولاد سے میری درخواست ہے کہ وہ اپنے بڑوں کی طرف سے مجھے معاف فرمائیں۔

بیشک اللہ سمیع و بصیر علیٰ کل شئی قدیر ہے، وہ اپنے بندوں کے گناہوں سزاؤں اور نیکیوں کو خوب پہچانتا ہے اور انھیں الگ الگ سنبھال کر رکھتا ہے اور وقت پر ان کی پکڑ دھکڑ کرتا ہے۔

میں بارگاہ رب العٰلمین میں بھی اپنی مجبوری، مشکلات اور اپنے گناہوں کا اعتراف اور اظہار کرتا ہوں اور اسی ذاتِ گرامی سے اپنے لئے امیدوارِ رحمت ہوں۔

ایڈیٹر ● پرنٹر ● پبلشر نسیم اختر شاہ قیصر نے ● آزاد پریس دیوبند میں چھپوا کر ● دفتر ماہنامہ طیب دیوبند سے شائع کیا

وہ کتابیں جن میں ایمان اسلام اور اخلاق کے موتی بکھرے ہوئے ہیں
مطبوعات ادارہ درس قرآن دیوبند — مطبوعات ادارہ درس اسلام دیوبند
تفسیر درس قرآن کامل
۶ جلدوں میں
تفسیر ابن عباس کامل
۶ جلدوں میں
ریاض الصالحین کامل
۲ جلدوں میں
انتخاب مشکوٰۃ شریف کامل
۳ جلدوں میں
شمائل ترمذی (اردو)
مترجم اردو مجلد
درس بخاری شریف
(زیر طبع)
جواہر الحکم
کامل اردو
انتخاب الترغیب و الترہیب
(زیر طبع)
مواعظ حکیم الامت یعنی دعوات عبدیت اردو
المصالح العقلیہ
المصالح العقلیہ
خلاصہ اشرف السوانح
کیمیائے سعادت
مقدمہ ابن خلدون
تاریخ ابن خلدون
تاریخ الخلفاء
کامل مجلد
تاریخ مکہ و مدینہ
تاریخ کعبہ و غلاف کعبہ
تاریخ بیت المقدس
(زیر طبع)
سفرنامہ ابن بطوطہ
کامل مجلد
سفرنامہ محمد ابن جبیر کامل
سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم
(زیر طبع)
یہ اسلام ہے کامل
ہادی عالم مجلد
خلاصہ تربیت السالک
خطبات حکیم الاسلام
قرآنی اسلامی کورس
احکام قرآنی
مجلد
تعارف قرآنی
بصائر قرآنی
اخلاق قرآنی
انوار قرآنی
تجلیات قرآنی
(زیر طبع)
تعلیمات قرآنی
(زیر طبع)
قرآن میں نظام زکوٰۃ
قرآنی بول چال
حصہ اول حصہ دوم
آسان درس عربی
جدید عربی سیکھئے
اردو عربی بول چال
عربی سیکھیں
انمول باتیں
ماہتاب عرب
تعبیر الرؤیا کامل
(زیر طبع)
ناشر ادارہ درس قرآن دیوبند
المرشد الامین
(زیر طبع)

Regd. No. SHN / L-13 / NP-584 / 86

September, October, November 1986

Tayyeb Monthly Deoband-247554

این جے پونٹرس دیوبند